''چہارسُو''

...... داستانِ ساحر ......

سوانح حیات

(1921-1980)

ساحر لاہور سے دہلی آ گیا جہاں اس نے "شاہراہ" کی ادارت کی۔لیکن لگ بھگ ایک سال بعد وہاں سے وہ بمبئی آ گیا جہاں ایک بار پھر جدوجہد کا نیا دَور شروع ہوا۔ 1951ء میں فلم "نوجوان" میں اسے گیت نگاری کا موقع ملا۔اس فلم میں ساحر کا لکھا یہ گیت اس قدر مقبول ہوا کہ شائقین اسے آج تک بھول نہیں سکے۔گیت کے بول تھے:

ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں
رُت ہے جواں، ان کو یہاں کیسے بلائیں

دوسری فلم "سزا" تھی جس میں ساحر کو صرف ایک گیت لکھنے کا موقع ملا جو اس طرح "تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے، ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے" اوراس کے بعد فلم "بازی" آئی اور پھر ساحر فلمی دنیا کا پسندیدہ گیت کار بن گیا۔"سزا، ارمان، ٹیکسی ڈرائیور، ہاؤس نمبر 44، منیم جی" اور چھ سال بعد یعنی 1957ء تک پہنچتے پہنچتے فلم "پیاسا" تک کے سفر نے ساحر کو فلم کا کامیاب ترین گیت کار بنا دیا۔

1943ء تک لکھی ساحر کی شاعری کی پہلی کتاب "تلخیاں" 1945ء میں شائع ہوئی۔ 1955ء میں ساحر کی دوسری کتاب "پرچھائیاں" منظرِ عام پر آئی جو امن عالم پر ایک طویل نظم ہے۔"گاتا جائے بنجارہ" اور "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" دوسرے مجموعے 1960ء اور 1973ء کے درمیان شائع ہوئے۔پہلی کتاب کو چھوڑ کر باقی تینوں مجموعے بھارت میں پہلی بار اردو اور ہندی زبانوں میں سٹار پبلی کیشنز نے شائع کیے۔اسی ادارے نے ساحر کے منتخب کلام کو بہ زبان انگریزی بھی شائع کیا۔

ساحر نے لگ بھگ ایک سو فلموں کے لیے قریب سات سو گیت لکھے۔ساحر کی آخری فلم "لکشمی" تھی جو اس کی وفات کے دو سال بعد یعنی 1982ء میں ریلیز ہوئی۔ساحر کا یوم وفات 25 اکتوبر 1980ء ہے۔یعنی عمر 59 سال۔پہلا شعری مجموعہ 25 برس کی عمر میں ان کی زندگی میں اس کے پچیس "جائز" ایڈیشن اشاعت پذیر ہوئے جبکہ بلا اجازت چھاپے گئے ایڈیشنوں کا کچھ پتہ و حساب کتاب نہیں۔ساحر اردو کا صرف ایک اکیلا شاعر جس کے مقابلے میں اتنے ایڈیشن جوش، فیض، مجاز تو درکنار، علامہ اقبال کے شعری مجموعوں کے بھی اُن کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے۔اردو میں شاعری کی صرف ایک کتاب "دیوانِ غالب" ہے جو آج تک اشاعت کی تعداد کے حساب میں ساحر کی "تلخیاں" سے آگے ہو سکتی ہے۔

ساحر کے زندگی نامے کی یہ ایک جھلک ہے جو اس کی شاعرانہ صلاحیتوں، عظمتوں اور بے پناہ مقبولیت کا اندازہ فراہم کرتی ہیں۔

ڈاکٹر کیول دھیر

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: سٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۹،شمارہ:ستمبر،اکتوبر ۲۰۲۰ء

رابطہ:537/D-1 ' گلی نمبر18، ویسٹریج-III ' راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمٰی رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

حوصلوں کے پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نذیر فتح پوری ۵
جذبۂ صادق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۶
سنت ایک ناتھ کی بانی۔۔۔۔۔۔۔صادقہ نواب سحر ۸
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۱
عشق کی تان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۱۷
ہم پنچھی ایک ڈال کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسلم نواب ۲۱
''ست رنگی'' کے آئینہ میں۔۔۔۔پروفیسر مجید بیدار ۲۳
متاشا اور ناول ۔۔۔۔۔۔۔۔پروفیسر علی احمد فاطمی ۲۶
اک آہوئے خوش چشمہ۔۔۔۔۔۔۔۔نور الحسنین ۲۹
بحیثیت افسانہ نگار۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر رضوانہ پروین ۳۱
افسانوی سحر کاری۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی ۳۴
صادقہ سحر کے افسانے۔۔۔۔۔۔۔۔ارتضٰی کریم ۳۶
معاصر دوست کی نظر میں۔۔۔۔۔۔۔۔ثروت خان ۳۷
راجدیو کی امرائی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایم مبین ۳۹
صادقہ نواب سحر کے ڈرامے۔۔۔۔ڈاکٹر شہناز صبیح ۴۲

افسانہ

منّت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صادقہ نواب سحر ۴۴

ناول

راجدیو کی امرائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صادقہ نواب سحر ۴۷

ڈرامہ

چڑیا کا بچہ گیا کہاں۔۔۔۔۔۔۔۔صادقہ نواب سحر ۵۳

آئینِ سخاوت

محسن نقوی ۵۵

افسانے

پردہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔طاہر اقبال ۵۶
فلاور آئی لینڈ سے واپسی۔۔۔۔۔شہناز خانم عابدی ۶۰
جوگن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیروز عالم ۶۳
امربیل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا ۶۶

شمع کی آبرو

ساغر صدیقی، عبداللہ جاوید، محمود شام، مہندر پرتاپ چاند، نسیم سحر، شاہد صدیقی، مشتاق اعظمی، اشرف جاوید، ڈاکٹر ریاض احمد، نبیل احمد نبیل ۶۸

افسانے

چندہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نصرت بخاری ۷۳
اَنا کی صلیب پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر عبدالباری ۷۶
آشیانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نصرت شمسی ۷۸
وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیاض احمد ڈار ۸۰
روحانی سکون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارم نعیم ۸۱

میزانِ عدل

جہانگیر اشرف، تصور اقبال، رئیس صدیقی، جنید آزر، شاد اعظمی، ثاقب تبسم ثاقب، نوید سروش، پریم ناتھ بسمل، سہیلہ انعام صدیقی، ڈاکٹر قطب سرشار، ذکی طارق بارہ بنکوی، انجم جاوید۔ ۸۶

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۹۱

ابرِ نوبہار

ماس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ظفر قریشی ۹۷

آئینۂ فن

آخری بات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نصرت انور ۹۹

نشانِ راہ

اردو میں لوک ادب۔۔۔۔۔ڈاکٹر شہناز قادری ۱۰۱

شہادت کا رنگ بیاں

ایوب خاور، ڈاکٹر نزہت شاہ، فیصل عظیم، ابدال بیلا، انجم جاوید، سلیم انصاری۔ ۱۰۵

ستاروں پہ کمند

چشمِ تحیّر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۱۱۰

ایک صدی کا قصہ

دیوکا رانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہ الوقار ۱۱۷

قرطاسِ اعزاز

•☆•

صادقہ نواب سحر

•☆•

کے نام

ڈ — ڈاکٹر نواب صادقہ سحرؔ — ہیں جہانِ علم و فن میں معتبر
ا — اردو اور ہندی کا سنگم ان کی ذات — بخشی ہے قدرت نے تخلیقی صفات
ک — کاوشیں پیہم ، مسلسل کوششیں — ہر قدم پر کامیابی کی دھنیں
ٹ — ٹمٹماتے جگنوؤں کا قافلہ — وادئ کوکن کو روشن کر گیا
ر — رفعتیں رکھتی ہیں اپنی فکر میں — روز وشب مصروف ادب کے ذکر میں
ن — نور اور نکہت سے گوندھی شاعری — خوب حرف و صوت کی جلوہ گری
و — وحشتوں کو پرسکوں موسم ملے — ہیں سبک رفتار "خوشبو قافلے"
و — وادئ تنقید کی بھی سیر کی — پائی تحقیقِ ادب کی روشنی
ا — اپنی محنت اپنی چاہت کا صلہ — پا کے خوش ہیں، لب پہ ہے شکرِ خدا
ب — با ادب، با ہوشیارو با خبر — رکھتی ہیں ہر شئے پہ یہ گہری نظر
ص — صادقہ فطرت سے عادت سے نواب — اس لیے ہیں زندگی میں کامیاب
ا — اپنی دُھن میں، اپنے کاموں میں مگن — جُز ادب کوئی نہیں دل میں لگن
د — داد پائی ہے سخن کی آپ نے — ہیں پذیرائی کے روشن سلسلے
ق — قلزمِ احساس کی پہچان ہے — آپ کے ناول کی اپنی شان ہے
ہ — ہمتیں نوکِ قلم سے باندھ کر — کب سے جانے آپ ہیں محوِ سفر
س — سلسلہ در سلسلہ در سلسلہ — فکروفن کا کارواں چلتا رہا
ح — حوصلوں کے پر میسر آ گئے — ہیں بلندی پر ستارے آپ کے
ر — رحمتوں کے سائے میں رکھے خدا — اور بھی ہو نام روشن آپ کا

نذیرؔ فتح پوری
(پونے)

جذبۂ صادق

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

اصل نام: صادقہ آراء

(پہلے صادقہ آراء سحؔر کے نام سے شائع ہوئی)

پیدائش: گنٹور (آندھرا پردیش، بھارت) ۸۔اپریل ۱۹۵۷ء

تعلیم: پی ایچ ڈی، ایم اے (اردو)، ایم اے (ہندی)، ایم اے (انگریزی)، ڈی ایچ ای، سیٹ

ادبی شناخت: ناول و افسانہ نگار، شاعرہ، ڈرامہ نگار، تنقید، بچوں کا ادب

ذریعۂ معاش: درس و تدریس۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر، رِیسرچ گائیڈ و صدر شعبہء ہندی، کے ایم سی کالج، کھپولی، (ممبئ یونیورسٹی) ضلع رائیگڑھ، مہاراشٹر ۴۱۰۲۰۳

شوہر: محمد اسلم نواب

والدین: خواجہ میاں صاحب اور شرف النساء بیگم (مرحومین)

پتہ: ۳۰۱، صادقہ مینشن، ایکسس بینک کے اوپر، شاستری نگر، کھوپولی، ضلع رائیگڑھ، مہاراشٹر ۴۱۰۲۰۳

فون: 02192-267054/262720، 09370821955

Email:sadiquanawabsaher@hotmail.com

مطبوعات:

(اردو کتابیں)

۱۔ انگاروں کے پھول (شعری مجموعہ) ۱۹۹۶، مکتبہ فکر و فن (مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کا ساحؔر لدھیانوی ایوارڈ، پروین شاکر ایوارڈ)

۲۔ پھول سے پیارے جگنو ۲۰۰۳ (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) اردو چینل پبلی کیشن

۳۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول) ۲۰۰۸، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی (بہار اردو ساہتیہ اکادمی کا ''رشیدت النساء ایوارڈ''، اتر پردیش اردو ساہتیہ اکادمی کا 'کل ہند ایوارڈ'، بھارتیہ بھاشا پریشد، کولکاتا کا 'یُو الیکھک پرکاشن سمّان')

۴۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول) ۲۰۱۰ شہزاد پبلکیشنز، کراچی، پاکستان

۵۔ مکھوٹوں کے درمیان (اردو کا طبعزاد ڈرامائی مجموعہ) ۲۰۱۲ تخلیق کار پبلشر، دلی (مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کا فکشن ایوارڈ، اور بیسٹ اسکرپٹ ایوارڈ)

۶۔ خلش بے نام سی (افسانوں کا مجموعہ) ۲۰۱۳ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی (بہار اردو ساہتیہ اکادمی کا ''شکیلہ اختر ایوارڈ، اتر پردیش اردو ساہتیہ اکادمی کا کل ہند ایوارڈ، مغربی بنگال اردو ساہتیہ اکادمی کا مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ)

۷۔ ''جس دن سے....!'' (ناول) ۲۰۱۶، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی (مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کا فکشن ایوارڈ، بہار اردو اکادمی کا کل ہند ایوارڈ، اتر پردیش اردو اکادمی کا کل ہند ایوارڈ)

۸۔ پیج ندی کا مچھیرا (افسانوں کا مجموعہ) ۲۰۱۸ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی (اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ)

۹۔ ست رنگی (شعری مجموعہ) ۲۰۱۸ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

۱۰۔ باوجود (شعری مجموعہ) ۲۰۱۸ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

۱۱۔ راجدیو کی امرائی (ناول) ۲۰۱۹ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی۔

(ہندی کتابیں)

۱۲۔ پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ، سنہ ۲۰۰۰ (مجروح سلطانپوری کی کلیات کا ترجمہ و ادارت ہندی میں، سارانش پرکاشن، دلی سے)

۱۳۔ لوک پر یہ کوی مجروح سلطانپوری ۲۰۰۲ (مجروح سلطانپوری کی غزلوں کا ترجمہ و ادارت ہندی میں، وانی پرکاشن، دلی سے)

۱۴۔ ہندی غزل: فکر و فن، خصوصی جائزہ: دُشینت کمار (تحقیق) ۲۰۰۷

۱۵۔ پتھروں کا شہر ۲۰۰۳

۱۶۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول) ۲۰۰۹ ہندی میں بھاؤنا پرکاشن، دہلی (مہاراشٹر ہندی ساہتیہ اکادمی کا جے نیندر کمار ایوارڈ)

۱۷۔ منّت (افسانوی مجموعہ۔ 'بھارتیہ بھاشا پریشد، کولکاتا' نے 'یُو الیکھک پُستک پرکاشن سمّان' ایوارڈ کے تحت شایع شدہ) ۲۰۱۲ (مہاراشٹر ہندی ساہتیہ اکادمی کا 'منشی پریم چند ایوارڈ)

۱۸۔ ساہتیہ میں آلوچنا کی چِنتا (تنقیدی مضامین) ۲۰۱۲ (وانگمئے پرکاشن، علی گڑھ)

۱۹۔ ''جس دن سے....!'' (ناول) ۲۰۱۷، بھاؤنا پرکاشن، دہلی

۲۰۔ ''شیشے کا دروازہ'' (افسانوی مجموعہ) بھاؤنا پرکاشن، دلی، ۲۰۱۸

۲۱۔ پھر کھلے پھول (مجموعہ غزل) ۲۰۱۹، آر کے پبلکیشنز، ممبئ

(تیلگو)

۲۲۔ 'نی کتھا وِنی پنچُو مِتا شا (ترجمہ کہانی کوئی سناؤ متاشا) ۲۰۱۴، مترجم: حسینہ بیگم۔

(انعام: ۔شریمتی کُسُم رے ڈمّا ساہِتھی پُرسکارم یافتہ)

(انگریزی)

۲۳۔ 'غزل اینڈ اوڈ' (تحقیق) ۲۰۱۰ ارپڈ پبلکیشن، ممبئ

۲۴۔ 'Tell me a story, Mitasha' (کہانی کوئی سناؤ متاشا کا ناول کا ترجمہ) ۲۰۱۴ مترجم: لبنیٰ نواب

پنجابی، تیلگو، کنڑ، انگریزی، مارواڑی، اور مراٹھی زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے ہیں۔

نصابی کتابوں میں شامل:

۱۔ بال بھارتی کی اردو کی پانچویں کی کتاب میں نظم ''آؤ دعا مانگیں'' شامل

۲۔ مغربی بنگال بورڈ آف سیکینڈری ایجوکیشن کی اردو کی دسویں کتاب میں ڈرامہ ''سلطان محمود غزنوی'' شامل

۳۔ ''ادب شناسی''، برائے بی۔اے، اکّماہادیوی وومینس یونیورسٹی، وجیاپور، ریاست کرناٹک، مرتبین: ڈاکٹر ہاجرہ پروین، ڈاکٹر محمد سمیع الدین، ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی۔

بھارتی گیان پیٹھ کے افسانوں کے انتخاب ''آج کی اردو کہانی'' میں افسانہ 'منّت' شامل۔

۴۔ ''جوہر ادب'': برائے زبان دوم، (سال دوم،) بورڈ آف انٹر میڈیٹ، آندھراپردیش، چیف ایڈیٹر: پروفیسر عبدالستار ساحر، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی میں افسانہ ''میٹر گرتا ہے۔'' شامل

صادقہ نواب پر کتابیں، رسائل، ایم فِل:

کتابیں:

''صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں'' مرتبہ پروفیسر تراب علی ید الٰہی، محمد اسلم نواب ۲۰۱۷ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی۔

''صادقہ نواب سحر: شاعری کے تناظر میں'' مرتبہ: حبیب النساء بیگم ۲۰۱۸ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی۔

ایم فِل مقالے:

''صادقہ نواب سحر کی نثری خدمات''، سونیا راحت، نگران کار: ڈاکٹر خالد ندیم، سرگودھا یونیورسٹی، (پاکستان)

''صادقہ نواب سحر کے ناول 'جس دن سے' میں تذبذب کے عناصر'' (ہندی)، کرشن کانت بھٹ، نگران کار: ڈاکٹر اشفاق علی، دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا، چینئی

''صادقہ نواب سحر کی فکشن نگاری''، شیخ مستان ولی، نگران کار: ڈاکٹر رفیعہ بیگم، حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، تلنگانہ

''کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول) کا تنقیدی جائزہ''، جے فاضلہ، نگراں: پروفیسر عبدالستار ساحر، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی، آندھراپردیش

''صادقہ نواب سحر کے ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کا تنقیدی جائزہ''، نسیم اختر، نگراں: ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، جموں یونیورسٹی

''صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری: ایک تجزیاتی مطالعہ (خلش بے نام سی کے حوالے سے)''، انارا بیگم، ڈاکٹر شاداب عالم، فقیر موہن یونیورسٹی، بالا سوراڈیشہ۔

خصوصی شمارے:

سہ ماہی اسباق نمبر، اکتوبر ۲۰۱۰ تا مارچ ۲۰۱۱

ماہنامہ شاعر نمبر: مارچ ۲۰۱۷

ملک اور بیرونِ ملک مختلف موقر رسالوں اور مجموعوں میں شامل

بیرونِ ملک ادبی پروگراموں میں حصہ لیا:۔

دوبئی، ماریشس، جدّہ، لندن، پیرس، سویزرلینڈ

☆

صادقہ نواب کی خاص بات تو زبان کی سلاست ہے۔ پورا مجموعہ پڑھ جایئے، اضافت نام کی کوئی چیز شاذ ہی ملے گی، رواں دواں الفاظ ایسے کہ زبان سے خود بخود پھسلتے جائیں۔

غم شناسانہ جاں نثار ملے — یوں تو ملنے کو یہاں ہزار ملے
سرمئی شام یا سحر بن کر — زندگی تجھ سے بار بار ملے
عشق کی رہگزار میں اکثر — جو ملے ہم کو اشکبار ملے

دوسری بات یہ کہ صادقہ نواب سحر نے بیشتر غزلوں کے لیے چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے اور یہ دونوں ہی باتیں ایک عورت کو ہر طرح زیب دیتی ہیں۔ کہیں کہیں تو غزل کا معیار خاصا بلند ہو گیا ہے۔

کیا گلہ کرتی میں زمانے سے — در حقیقت کمی رہی مجھ میں
خامشی ہی مرا مقدر تھی — بات اک ان کہی رہی مجھ میں
بے سبب کیوں لڑوں چراغوں سے — اے سحر روشنی رہی مجھ میں

کالی داس گپتا رضا

(●)

''سنت ایک ناتھ کی بانی پر اسلام کا اثر''

صادقہ نواب سحر

سنت ایک ناتھ بھگتی کال کے مراٹھی بھاشی سنت کوی تھے۔مگر وہ برج بھاشا،دکنی ہندی، گجراتی اور کنڑ زبانوں کے اچھے واقف کار بھی تھے۔مراٹھی کے علاوہ،بہت کم سہی لیکن گجراتی اور کنڑ زبانوں میں بھی انہوں نے شاعری کی ہے۔

مراٹھی کی طرح سنت ایکناتھ کی ہندی شاعری میں بھی دو اسلوب پائے جاتے ہیں۔پہلی جنوبی ہند کے سادھوؤں کے لئے برج بھاشا سے بہت قریبی ہندی اور دوسری مسلمانوں کے لئے اردو، فارسی اور عربی الفاظ سے بھرپور دکنی اسلوب۔ان کے جذبات،خیالات اور اسلوب زبان مراٹھی اور ہندی اشعار میں ایک سی ہیں۔ان کے کلام میں دکنی زبان کی شیرینی دیکھیے۔

''یا رو دیکھو رے دیکھو نرغیبی' گا روڑی آیا
پہلے پہل کچھو نہیں دیکھے، نرا کار نج رُوپا''

سنت ایکناتھ کا زمانہ (۱۵۹۹۔۱۵۳۰) پورے مہاراشٹر میں مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتیں مہاراشٹر پر حکومت کر رہی تھیں۔ ایکنا تھ کی جائے پیدائش اور رہائشی مقام پیٹھن (پر تشٹھان) تھا۔یہی ان کا میدانِ عمل بھی تھا، جونظام شاہی حکومت کے قبضے میں تھا اور جومہاراشٹر میں گوداوری ندی کے کنارے واقع ہے۔'دیشستھ رگ ویدی برہمن' گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود وہ اپنے زمانے کی مقبولِ عام زبانوں اور مذاہب کے اثرات سے دامن نہ بچا سکے۔نظام شاہی دورِحکومت میں مذہب اسلام کا خاصہ اثر تھا۔سنت ایک ناتھ بھی پوجا کے لئے مختلف مورتیاں جمع کرنے کے عمل کو دُتکارتے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ پوجا یا عبادت کیلئے' بھگت' یا عابد میں قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ظاہری پوجا پر وہ قلبی عبادت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی بات سمجھانے کے لئے وہ اللہ اور بندہ جیسی اصطلاحات کا استعمال بھی کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

''نام الاّ (اللہ) کا کتھا سننے کوں
مرغی کا سوچتا ہے
کام کُو تا کسبن گھر کا
دن رات جاگتا ہے
اس دنیا میں آیا بندہ
الاّ (اللہ) نام سَودا ہے !!!''

مہاراشٹر میں اُن دِنوں حکومتوں میں ہندوؤں کو درباروں میں اونچے عہدے دئے گئے تھے۔حکومت کو اچھی طرح چلانے کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔ سنت ایکناتھ کی پیدائش کے وقت برہان نظام شاہ کی حکومت میں کنورسین نامی برہمن کو وزیراعظم بنایا گیا تھا۔جس سے درباروں میں ہندوؤں کی عزت بڑھی تھی۔ ایکناتھ کے دادا' چکرپانی' فوج میں نوکری کرتے تھے۔

دکن کی پانچ سلطنتوں میں بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔آپس میں شادی بیاہ جیسے تعلقات بھی ہو جایا کرتے تھے مگر اندر ہی اندر سرد جنگ چلتی رہتی تھی۔انہیں سنگھرشوں کی وجہ سے' بریدشاہی' اور' عمادشاہی' حکومتیں ختم ہوئیں۔ جیتنے والے بادشاہ ہارنے والوں کے ساتھ غیرانسانی سلوک کرتے۔مرد و زن قتل کئے جاتے یا قید ہوتے۔مگر عموماً یہ باتیں خاص حلقے تک محدود ہوتیں اور عوام تک نہیں پہنچتیں۔آپسی اختلافات بالعموم شیعہ۔سنیّ شمالی۔جنوبی ،نومسلم۔ پیدائشی مسلمان،ملکی اور نواختیاری سلطان جیسی چھوٹی اور معمولی باتوں پر مشتمل ہوتے۔یہ رنجشیں واختلافات جنگوں میں بھی بدل جا تا کرتے۔شمال کے مغلوں اور جنوب کے راجاؤں سے بھی لڑائیاں ہوتیں۔ان جنگوں میں ہندو اور مسلمان حکمرانوں کا انجام ایک سا ہوتا۔

عام طور پر حکمران طبقہ،عوام پر ہونے والے مظالم کے ذمہ دار نہیں ہوتا تھا بلکہ ریاستی صوبہ دار یا منصب دار عوام پر ظلم روا رکھتے اور اپنے حقوق کا من مانا استعمال کرتے۔لیکن نظام شاہی دورِحکومت میں ہندوسرداروں کے شامل ہونے کی وجہ سے عوام کو اس کی شکایت نہیں تھی اسی لئے سنت ایکناتھ کی ابتدائی شاعری میں خوداعتمادی اور آزادی کے جذبات جھلکتے تھے۔آگے چل کر ایسے حالات پیش آئے کہ انہیں' بھاوارتھ رامائن' (رامائن کا خلاصہ) لکھ کر مہاراشٹر کے ہندوؤں کی اصلاح کا کام کرنا پڑا۔اپنے گرنتھوں (کتابوں) کے ذریعہ انہوں نے عوام میں خودداری،خوداعتمادی اور آزادی کی جوت جگائی۔

عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں میں صوفیوں فقیروں کی بڑی عزت ہوتی تھی۔بہت سے ہندو اُن کے مرید ہو کر ان کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔درگاہ و مسجد میں نماز پڑھنا، پیر کی منّت کرنا،محرم کے تیوہار میں حصہ لینا یہاں کے ہندوؤں میں عام شغل تھا۔کہا جاتا ہے' شاہ پیر' کی دعا سے شیواجی کے والد کی پیدائش ہوئی تھی۔اسی لئے اس کا نام' شاہ جی' رکھا تھا۔صوفیوں،فقیروں کے اثرات کے نتیجے میں' ایک ایشوروادٗ یا توحید کا چرچا عام ہوا۔اسی نے اس زمانے میں' الوپنشد' (اللہ کی حمد میں لکھا گیا اپنشد) لکھوایا۔سنت ایکناتھ کے زمانے میں حکمران مسلمان طبقے کی اہمیت بہت تھی۔مسلمانوں کی تہذیب، رہن سہن اور رسم ورواج کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور اونچے درجے کا تسلیم کیا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے ہندوؤں نے بھی داڑھی رکھنا، پاجامہ،شیروانی اور خاص قسم کے جوتے پہننا شروع کیا تھا۔کچھ ہندو کسی لالچ یا غرض سے،کچھ ہندو سماج میں بے وقعت مانے جانے کی وجہ سے تو کچھ جبراً مسلمان بن چکے تھے۔ان نومسلموں

نے اپنے نام تو بدل لئے تھے مگر رسم و رواج اور تہذیب وتمدن میں اپنے پرانے یعنی ہندوؤں کی طرزِ زندگی کو چھوڑ نہیں پاتے تھے۔converted مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کے جنوبی ہند میں رہنے کی وجہ سے وہاں کا تہذیبی رنگ ان کے یہاں نمایاں ہی نہیں حاوی بھی تھا۔ظاہر ہے، اس کے اثرات نسل درنسل تک باقی رہے۔اسی طرح ان کے رسم ورواج کا اثر ہندوؤں پر پڑنا بھی کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔دوسرے مذاہب کے اثرات کے سبب سنت ایکناتھ نے بھاگوت دھرم کو زمانے کے حساب سے وسیع نقطہ ءنظر دیا اور عوام کو انسانیت کا درس دے کر ایک طرح سے سماجی کام ہی کیا تھا۔اس طرح انہوں نے انسانی زندگی کو ایک نیا رخ دیا تھا۔ وہ دھرم ومذہب کے نام پر نیچ کام کرنے اور تفریق کرنے والوں کو خوب لتاڑتے ہیں۔اس کے علاوہ ہریجنوں کی دعوت پر ان کے گھر جانا، دعوت کھانا، پِتروں کے شرادھ کے موقع پر مغرور برہمنوں کے منع کرنے کے باوجود ہریجنوں کو کھانا کھلانا ان کی انسانیت دوستی کے ثبوت ہیں:

''سنتن کے سنگ، کھاوے نج بودھن کی بھنگ

سدا نند مو دَنگ، ایسا ملنگ فقیر ہے!!!!''

سنت ایکناتھ اونچے درجے کے سنت اور ادیب ہی نہیں تھے، مصلح قوم اور انقلابی شخصیت کے مالک بھی تھے۔سنت گیانیشور کے بعد قریب قریب تین سو سالوں تک مراٹھی زبان وادب کی حالت خستہ رہی۔مراٹھی زبان ان دنوں فارسی زدہ ہو چکی تھی اور اپنی اصلیت کھوتی جا رہی تھی۔سنت گیانیشور اور سنت نامدیو (تیرہویں صدی عیسوی) کے بعد پندرہویں صدی کے اخیر تک مراٹھی ادب اور ادیبوں کا حال ایک جیسا رہا۔اخیر میں صرف 'جناردن سوامی' اور 'نرسمہا سرسوتی' جیسے دو چار ادیب نظر آجاتے ہیں۔ایسے زوال کے وقت سنت ایکناتھ کا کلام مسیحا کی طرح ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ایکناتھ نے سنسکرت کے بجائے مراٹھی میں لکھا اور مراٹھی زبان وادب کو نئی زندگی عطا کی۔انہوں نے سنت گیانیشور کی کتاب ''گیانیشوری'' کو آسان زبان میں لکھ کر عام لوگوں کی سمجھ کے قابل بنایا اور اپنے مختلف گرنتھوں کے ذریعہ مراٹھی زبان وادب کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔اسی لئے سولہویں صدی کو 'سنت ایکناتھ کا کال' یا زمانہ کہا جاتا ہے۔ان کے زمانے میں 'پریم داس'، 'مہالنگ داس'، 'نرسمہا وِشُ ایشور' بھی مراٹھی میں ادب کی تخلیق کر رہے تھے۔مگر ان میں سے اکثر کے گرنتھ (کتابیں) ناپید ہیں یا کمیاب۔

سنت ایکناتھ کے زمانے میں سماج پر بے شمار مذاہب اور فرقوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ایک جانب 'دتا سمپر دایہ' قوم کو اسلام اور مسلمانوں کے اثرات سے بچانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ صرف برہمنوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ دوسری جانب 'جین' اور 'مہانو بھاؤ دھرم'، 'ویدک دھرم' کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔انہوں نے برہمنوں کی مذہبی من مانی اور تسلط کے خلاف مہم چلائی مگر اس کو شش میں ان مذاہب میں بہت سختی پیدا ہوتی چلی گئی تھی۔سنیاس لینے اور سخت مشکل زندگی گزارنے کے رواج کو تقویت ملی۔ تیرہویں صدی میں سنت گیانیشور نے سماج کے خصوصاً نچلے طبقے کا اُدّھار کرنے لئے 'وارکری سمپر دایہ' کی تشکیل کی جس میں ہر دھرم اور مذہب کے ہر طبقے کے لوگ شامل ہوئے۔انہوں نے 'گیانیشوری' کے ذریعہ بھگتی کا مارگ سب کے لئے کھول دیا۔اسی لئے 'وارکری سمپر دایہ' میں 'مالی' 'دھوبی' 'چمار' ہی نہیں 'نومسلم' اور مسلمان بھی شامل ہو گئے۔

سنت ایکناتھ کا سماجی برابری ومساوات کا نقطہ ءنظر صرف ادب کی تخلیق کی حد تک محدود نہیں تھا۔حقیقی زندگی میں بھی وہ ذات پات کے قائل نہیں تھے۔ ان کے خیال میں خدا انسانوں میں ہی نہیں ہر جاندار میں موجود رہتا ہے۔ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں کو سلجھانے کے لئے انہوں نے مراٹھی اور ہندی کے خوبصورت ڈرامائی اور مکالماتی ادب کی تخلیق کی جس کا نام 'ہندو تُرک سمواد' (ہندو مسلم مکالمہ) رکھا۔اس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مذہب پر سخت تنقید کرتے ہیں اور جی بھر کر جھگڑنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی لڑائی بالکل ہی کھوکھلی ہے۔'خدا' یا 'پرم برہم' ذات پات سے اوپر ہے۔اس کی کوئی ذات نہیں۔مثال کے طور پر

برہمن مھنے 'اہو جی سوامی

وستُو تہہ ایک امہی تمہی

وِوادواڑھلا نیتی دھرمی

ذات برہمی اَسے نا

ترک کہے بات اس ہی

خدا کو جو ذات نہیں

بندے خدا سے نہی جدائی

یہ بات صحیح سمجھو۔''

اسی طرح ''اکبر نامدیو جھگڑا'' کے نام سے لکھے 'بھاروڈ' (ایک صنف سخن) میں بھی اسی قسم کے مکالمے دکھائے گئے ہیں:

اکبر کہے نامدیو سے جھوٹا پنتھ تمہارا

اللہ مولا سب دنیا مو، وہ ہی گُرو نِروالا

اس طرح وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ملاپ کروانے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں انسانیت کا درس بھی دیتے ہیں۔

سنت ایکناتھ کی نظر میں خودی کو پہچاننے یعنی 'آتم گیان' کا سب سے سیدھا اور آسان طریقہ بھگتی ہے۔بھگت سے زیادہ خدا کو کون پیارا ہوگا! اس مایاوی جگت سے مکت ہو کر (چھٹکارا پا کر) چرنتن آنند (دائمی مسرت) کے حصول کو وہ موکش یا نجات کہتے ہیں۔وہ موکش یا مکتی کے حصول کے لئے کرم (عمل) گیان (علم) اور یوگ کی اہمیت کا اقرار کرتے ہیں 'اپنشد'، 'شنکر آچاریہ اور گیانیشور کے 'برہما دویت واد' سے بھی وہ متاثر تھے۔بھگتی کے لئے انہوں نے

مسلمانوں کوان کے مذہب کی زبان میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

"خیال کیا مچھلی والے محمدؐ وتے
ڈھنڈی دریا و گووند محمدؐ وتے
شنکھاسُر دیئیہ ماریا وتے
سایو چاری وید محمدؐ
کھیل کھیلا وے آوے گووند محمدؐ"
(ہاپسی سِدّ ھا،ص ۵۲)

یا۔

بسم اللہ ہے بسم اللہ
کلمہ کہوں بسم اللہ
ہے کوئی ایسا مرشد مولا
گھرمو خدا بتاوے گا
بسم اللہ ہے بسم اللہ
کلمہ کہوں بسم اللہ !!۱!!
پنجتن کے درگاہ بھیتر
دل تکیہ بچھاوے گا
من مقامے مجھے بٹھا کر
بسم اللہ کلمہ پڑھاوے گا !!۲!!
(بسم اللہ۔ ایکناتھی بھارو ڈ،حصہ دوم ص ۲۳)

سنت ایکناتھ کے خیال سے بھگتی یا عبادت ہر مذہب والا اپنے ڈھنگ سے کرے۔ وہ ادھیاتم یا عبادت سے ظاہری دکھاوے کو خارج کرتے ہیں کیوں کہ ظاہری عبادت سے یادِالٰہی بہتر ہے۔

"حضرت مولا مولا
سب دنیا پالن والاؔ"
('نماز۔ ایکناتھی بھارو ڈ' حصہ دوم' ص ۶۳)

سنت ایکناتھ فقر(تیاگ) پر زور دیتے ہیں۔ایسی فقیری جس میں اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا ایک ہوجائے۔جس میں کسی قسم کی ریا کاری یا دکھاوا نہ رہے۔جو واقعتاً منکسر ہو۔اس میں کسی چھل کپٹ کی گنجائش نہیں۔

"اندر بھگوا کبیوری بابا
جوگ جگُوت بھرپائی
اللہ کو نام پولگن لگائی
چکّی قلم پر لکھیت !!۱!!"
('سفیت (سفید) قلندر فقیر'۔ایکناتھی بھارو ڈ،حصہ اول' ص ۴۴)

ویسے تو بھگتی کال کے سبھی سنت کویوں کی بانی میں اسلام کا اثر دکھائی دیتا ہے مگر سنت ایکناتھ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سگُن اور نِرگُن بھگتی (جسیمی اور غیر جسیمی) کو برابر سمجھتے ہیں اور ان دونوں کو 'بیج ورکش' (بیج اور درخت) اور 'چینی مِصری' سے تمثیل دیتے ہیں۔

"ایکا جنا ردنی، چِدا نند گھن
سگُن ' نرگُن سمان دکھاوے"

وارکری سمپر دایہ کی عبادت کے طور طریق کے مطابق ہی سنت ایکناتھ، ایشور کے سبھی اوتاروں میں ایک ہی 'برہم' کی ستّا (حکومت) مانتے ہیں۔اسی لئے رام، کرشن، شیو، وِٹھل، دتاتریہ، جگدمبا وغیرہ جیسے ہندو دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے الّا (اللہ) یا خدا کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔خدا کی رضا کے مطابق خود کو ڈھال لینے اور شکایت نہ کرنے کا یعنی صبر وشکر کی حمایت سنت ایکناتھ یوں کرتے ہیں۔

"خدا کو تے ذات نہیں
سب ذات اھوں نے پائی !!۱!!
ذات کی حمایت چھوڑو
سکون میانے سچا پڑھو!!۲!!
خدا کو نہیں پیارا بُرا
پڑھ گُن کر نہ ہو آوارہ !!۳!!
ایکا جنار دَن کا ہے
سب ذات میں رہے"

قناعت وصبر وشکر کی حمایت سنت ایکناتھ یوں کرتے ہیں۔

ا لاّ (اللہ) رکھے گا ویسا ہی رہنا
مولا رکھے گا ویسا ہی رہنا ا ا ٹیک!!
کوئی دن سرپر چھتر اُڑاوے
کوئی دن سرپر گھڑا چڑھاوے
کوئی دن تُرنگ اُپر چڑھا وے
کوئی دِن پاو سے کھا سا چلاوے!!!اللہ!!!!!"

سنت ایکناتھ نے مسلمانوں اور غیر ہندوؤں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے ان کی زبان وبیان اور مذہب کا سہارا لیا۔گرونا نک اور پیغمبر محمدؐ کے ناموں کو اہمیت دی۔ملنگ، فقیر، بندہ نواز، عرضداشت، تاکید پتر وغیرہ اُن گنت اردو، فارسی اور عربی لفظوں سے عام بول چال کی بھاشا میں وسیع تر مخلوق کے دلوں تک اپنی بات پہنچائی۔

انہوں نے مہاراشٹر کے وارکری سمپر دایہ کو اسلام کے زیر اثر آسان اور عام لوگوں کی پہنچ کے قابل بنا دیا۔مراٹھی بھاشی ہونے کے سبب ہندی پدوں میں مراٹھی قواعد اور الفاظ کا استعمال ان کی مجبوری تھی۔سنت ایکناتھ کی بانی میں ہندوستانی زبان کے اس قسم کے 'پد' اور 'بھارُوڈ' بکثرت موجود ہیں۔

☆

براہِ راست

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر سے آپ لاکھ اختلاف کیجیے۔زود گو کہیے،Workaholic ٹھہرائیے یا ہرفنِ میں یکتائی کا شائق گردانیے مگر ایک بات سے انکار قطعی طور پر ممکن نہیں،محنت،لگن اور جہدِ مسلسل۔

ہماری رائے کو جانچنے ، پرکھنے اور نتیجہ پر پہنچنے کا بہترین طریقہ زیرِ نظر"قرطاسِ اعزاز" سے ہم کلامی ہی ہوسکتا ہے۔ڈاکٹر صاحبہ کی دو درجن سے زائد تخلیقات اور آپ کے فن اور شخصیت سے مشروط قریب ایک ہزار صفحات پر مشتمل ضخیم کتب کی موجودگی میں گنتی کے چند صفحات وزن میں یقیناً اہمیت نہیں رکھتے مگر یہ بھی سچ ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کی شخصیت اور فن سے کشید یہ چند صفحات ہی نہیں بلکہ اک ایسا گلدستہ ہے جو خوشنما ہونے کے ساتھ اس قدر مشک بُو ہے کہ آپ کے مشامِ جاں کو معطر کرنے کی صلاحیت یقیناً رکھتا ہے۔

گلزار جاوید

☆ چاند کے پار نہ ستاروں کے قریب، خواہش وہاں جانے کی ہے جہاں آپ کا ماضی اور حال ہماری راہ دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ اندھیرا ہوتا ہے تو ساری دنیا اندھیری نظر آتی ہے لیکن جب سورج کی کرنیں زمین کی سرحدوں کے گرد ہالہ ڈال دیتی ہیں تو سب کچھ سنہرا اور روشن دکھائی دینے لگتا ہے۔آج سوچتی ہوں تو لگتا ہے بالکل آئیڈیل ڈھنگ سے زندگی گزری۔بچپن میں گھر کی ذمہ داریوں سے بالکل بے فکر..اپنے تصور کی دنیا میں، کتابوں کے جہان میں بالکل آئیڈیالزم کے ساتھ گزری..لیکن ایک دن حقیقت کی سنگلاخ چٹان سے ٹکر ہوگئی۔آدرش ٹوٹ گیے۔پتہ چلا آئیڈیالزم وائیڈیالزم سب چاند ہیں اور زندگی چکور۔

☆ بچپن کی سنہری یادوں اکلی ڈکلی، گڑیا گڈے، آنکھ مچولی، سُو جا پھولی کے ایام کب کب کس رنگ اور موقعے پر آپ کی یادوں کا حصہ بنتے اور آپ پر کس طرح کی کیفیت طاری کرتے اور وہ کیفیت کس رنگ اور روپ میں قرطاس پر منتقل ہوتی ہے؟

☆☆ اندھیرے بڑوں نے اپنے سر لے لیے۔ہم ان کی اوٹ میں سکون سے خواب جیتے رہے۔خود کو نکھارتے رہے۔ٹیچر ٹیچر اور گڈے گڑیوں کے کھیل کھیلتے رہے۔نوجوانی بھی خاموشی سے گزر گئی لیکن مشاہدہ کی آنکھیں کھلی تھیں۔کبھی کسی کے ٹٹوں میں نہیں گئی۔اکثر ظلم اور غلط کے خلاف دھیمے لہجے میں بغاوت کی آواز ضرور بلند کی۔

"تم بہت بھولی ہو اور دنیا بہت ہوشیار۔لیکن جینا سیکھ لوگی۔سیکھنا ہی ہوگا۔"لاہور سے آئے والدہ کے اور ہمارے ماموں عبدالغنی کرمانی صاحب عرف نور ماموں نے کہا تھا۔

اسکول کی سیڑھیوں پر وقفے کے دوران سہیلیوں کو کہانی سنانے والی میں، گھر کی دہلیز میں پاس پڑوس کے بچوں کو پڑھانے کا کھیل کھیلتی میں، گھروں کے باہر کھلے حصے میں رسی کودتی، تھپہ دیا کھیلتی میں، خود کو اچھی طرح یاد ہوں۔جب پانچویں کلاس میں پہنچی، اپنے متعلق ایک راز کھلا۔ٹیچر نے میری چٹھی پکڑی تھی۔پاس بلایا۔ہتھیلیاں سنسنا رہی تھیں۔انھوں نے چٹھی سے نظر نہیں ہٹائی، بولیں، "اس لڑکی میں تو شاعری کے جراثیم ہیں۔"بہت بعد میں سمجھ میں آیا کہ ہاں ہیں۔پتہ نہیں اب نجمہ ٹیچر کہاں ہیں؟ خدا انھیں سلامت رکھے۔دراصل اس چٹھی میں اپنی بے بات روٹھی سہیلی سے میں نے سوال کیا تھا۔

والدین، نانی اور بھائی بہنوں سے کہانیاں، شاعری سنتے، بولتے، پڑھتے خواب تعبیر بنتے گئے۔

"کوئی تمھیں ہیرے موتی کے تھال کے بدلے بیاہ کر لے جائے تو بھی کم ہے۔"نانی کی بات میں کتنی محبت تھی!

محبتیں گھر میں تھیں۔ممبئی میں رشتہ دار نہیں تھے، جو تھے گھر میں تھے۔ہم آٹھ تھے۔ان میں سے ایک طفلی ایام میں ہی اللہ کے پاس چلے گیے تھے۔ہم سات بھائی بہن اور سال میں دوبار آنے والی نانی...باقی رشتہ دار آندھرا پردیش میں۔بس ہماری یہی دنیا تھی۔اس دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا، باقی دنیا سے رابطے کی۔کتابوں اور اخباروں کی دنیا اپنے آس پاس ملی۔پھر انٹرنیٹ کی دنیا! ایک موتیوں کی لڑیوں سی! دیکھ لیا، بہت دیکھ لیا..مگر ابھی بہت باقی ہے شاید! اس دنیا کو میں اپنی تحریروں میں ٹکڑے ٹکڑے پروتی رہی۔

☆ تعلیمی سفر سے مراسم استوار کرنے کا ایک فائدہ اساتذہ اور ہم جماعتوں سے تعارف کی شکل میں حاصل ہوسکتا ہے جن میں سے کچھ یقیناً نمایاں شناخت کے حامل ہوں گے؟

☆☆ ایک عجیب سی عادت رہی ہے مجھ میں۔الجھن بھی ہوتی ہے۔دو اسکول: امام باڑہ گرلز اور انجمن اسلام طیب جی ہائی اسکول ،صوفیہ کالج ممبئی یونیورسٹی کی پڑھائی، الہ آباد یونیورسٹی اور ایس این ڈی ٹی۔یونیورسٹی کے ری فریشر

کورس، سلائی، کڑھائی، ڈرائینگ، پینٹنگ، کمپیوٹر پتہ نہیں کون کون سے کورس کیے۔ جہاں ساتھ چھوٹا، نئی ڈگر، نئی راہیں، نئی منزلیں۔ ایسا نہ کرتی تو پانچویں جماعت کی طرح دکھ کی ندیا میں غوطے نہیں لگاتی!

اب کی بات اور ہے۔ انٹرنیٹ سے سب جڑ جاتے ہیں۔ لینڈ لائن کی جگہ موبائل آ گئے، گھر بدل گئے، سرنام بدل گیے۔ تلاش کرتی ہوں نہیں ملتے۔ میں نے بھی پچھلے دنوں کی یادوں کو دل میں محفوظ کرلیا۔ جیسے ایک زمانہ محفوظ ہو گیا۔ اب کون چھین سکے گا انھیں مجھ سے! جاب کے مقاموں سے بھی کچھ ساتھی منسلک ہو گیے۔ ادب پرانی نئی نسلوں سے بھی رابطہ کرواتا ہے۔ سو ہونے لگا۔ جو چھوٹ گیے، بچھڑ گیے، سو بچھڑ گیے۔

☆ روایت پرست مسلم خاندان کی لڑکی کا اپنی زبان پر ہندی اور سنسکرت کو فوقیت دینا بلکہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا بہت سے ادبی حلقوں کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ آپ کی زبان سے تفصیل جان کر نئے آنے والوں کو مہمیز مل سکتی ہے؟

☆☆ زندگی کرنے کے طریقے میں روایت پسند ضرور رہے مگر علم حاصل کرنے میں بہت ماڈرن۔ زبانیں سیکھنے کے شوق نے بابا کو بڑی عمر میں ہندی سرٹیفکیٹ کورس کرنے پر راغب کیا تھا۔ اور مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی آٹھویں جماعت میں ایلی مینٹری ڈرائینگ کورس کرنے پر۔

اردو ذریعہء تعلیم تھا۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی، فارسی اور مراٹھی ان پانچ زبانوں کے بغیر اسکولنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ اردو، فارسی، انگریزی سے بی۔اے۔ فرسٹ کلاس آنرس کرنے کے بعد بیاہ دی گئی۔ ایم اے اردو سے فرسٹ کلاس اور فوراً برہانی کالج ممبئی میں پڑھانے لگی۔ ساتھ ہی اردو سے ڈپلوما اِن ہائر ایجوکیشن (ڈی۔ایچ۔ای) پورا کیا۔ کے۔ایم۔سی۔کالج، کھوپولی نے آواز دی۔ اس کو بنے ہوئے ابھی چھ سال ہی ہوئے تھے۔ اردو کے طلباء نہیں ملے۔ 'اردو نہیں تو اس کی بہن ہندی پڑھانا شروع کرو۔' مجھ سے ہندی مضمون شروع ہوا۔ پڑھاتے ہوئے ایم۔اے۔ ہندی، پھر ایم اے انگریزی سے کرلیا۔ ہندی شعبہ کی صدر تھی اس لیے ہندی میں غزل پر اور خصوصی مطالعہ دشینت کمار پر پی ایچ ڈی کرلی۔ اب میں خود ڈاکٹریٹ کرواتی ہوں۔

☆ صادقہ آپ ہوئیں، نواب دلہا بھائی، سحر کون صاحبہ ہیں، یہ محترمہ کب اور کیونکر آپ کی ہم دم و ہمراز بنیں؟

☆☆ صوفیہ گرلز کالج کے گارڈن میں ہم سہیلیاں اکٹھی بیٹھی ہوئی ایک دوسرے کو اپنی تخلیقات خصوصاً شاعری سناتیں۔ شمیم نے کہا تمہارے نام کے ساتھ سحر اچھا لگے گا۔ صادقہ آراء سحر۔ شادی کے بعد صادقہ نواب سحر ہوئی۔ ایک انسان ایک پہچان۔

☆ کتاب سے آپ کی دوستی کب اور کس حوالے سے ہوئی آج اس دوستی کی اہمیت و افادیت کتنی زبانوں کو محیط ہے اور اُس کے ثمرات کس شکل میں برآمد ہو رہے ہیں؟

☆☆ حرفوں سے زندگی کا ناطہ ہے۔ میری تحریریں اردو، ہندی، انگریزی، پنجابی، مارواڑی، مراٹھی، تیلگو، کنڑ وغیرہ زبانوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ہمارے ہندی کے پروفیسر نند لال پاٹھک کہتے تھے، ''اچھی ہندی جاننے کے لیے اردو فارسی اور اچھی اردو کے لیے ہندی سنسکرت جاننا نہایت ضروری ہے۔''

ہندی اردو دونوں زبانیں ہندوستانی ہیں۔ ماں تو سنسکرت ہے نا!

☆ موقع، محل اور دستور کے مطابق اپنے شہر ''رائے گڑھ'' کے بارے کچھ معلومات اور لوگوں کے رجحان کے ساتھ تعلیمی اداروں خاص طور اپنے ادارے کے بارے معلومات فراہم ہو سکتی ہیں؟

☆☆ ۱۸ مربع کلومیٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے کوکن کے ضلع رائیگڑھ کی سرحدیں پونے کی مشرقی سرحدوں سے ملتی ہیں۔ سہیادری کے پہاڑی سلسلوں کے درمیان ممبئی میٹروپولیٹن کا ایک حصہ یہ چھوٹا سا شہر کھوپولی میرا ٹھکانا ہے۔ لوناولہ کھنڈالہ کا بورگھاٹ ہمارے گھر اور کالج کے قریب سے شروع ہوتا ہے۔ بارش کے موسم میں ہم نے اسّی آبشار گنے تھے۔ گھر کی کھڑکیوں سے، کالج کے برآمدوں سے، سڑک پر چلتے ہوئے ہر طرف آبشار اور مناظرِ فطرت حساس انسان کو بے پناہ سکون بخشتے ہیں۔ یہاں کا ہیڈ کوارٹر ساحلی علاقہ علی باغ ہے جس کا نام علی پیر کے نام پر پڑا۔ کالج آرٹس، سائنس، کامرس ہے۔ ماسٹرس کے بھی کچھ موضوعات ہیں۔ کلچرل سرگرمیاں اور دوسری مصروفیات مگر سب سے اہم ہمارے طلباء... بہت عزت سے پیش آنے والے....

☆ قلم کی کشش نے کب اور کس طور آپ کو گرفت میں لیا اور کیا کچھ قرطاس پر منتقل ہوا؟

☆☆ جب سے قلم ہاتھ میں آیا، جو سوچا وہ لکھ پائی ہوں۔ شروع جماعتوں سے ہی سوالوں کے جواب لکھنا، مضمون، کہانیاں لکھنا سب کچھ لطف دیتے رہے۔ سائن بورڈ، اخباروں کے اشتہار بھی حرفوں سے آشنائی میں مدد کرتے رہے۔ والد بی۔اے۔ اکنامکس تھے۔ کسی لفظ کے معنی پوچھنے پر لغت ہاتھ میں تھماتے کہ ''میں معنی بتا سکتا ہوں مگر ڈکشنری زیادہ معنی بتائے گی۔'' گھر میں ہر زبان کی لغت اور انگریزی کی آکسفورڈ کی چھوٹی بڑی ڈکشنریاں تھیں۔ آج بھی ہیں۔ والدہ آواز دیتیں، ''چلو اٹھو، کھانا کھالو۔''، ''گھر میں جھاڑو لگاؤ۔'' وغیرہ وغیرہ...تب کتاب ہاتھ سے چھوٹتی۔ بعد میں وقت چرا چرا کر لکھنا، لکھتے لکھتے بچوں کی پرورش، لکھتے پڑھتے دنیاداری!

☆ بات تجربے کی ہے اور مشاہدے کی بھی ابتدائے سفر میں ناقدین بالخصوص اہل خانہ اور احباب کی طنزیہ و فکاہیہ گولہ باری اکثر نئے لکھنے والوں کے حوصلے توڑ دیتی ہے؟

☆☆ جس نے پڑھا ہمیشہ خوش ہوئے۔ ہمیشہ appreciation ملا۔ بہت سراہنا ملی۔ ہر صنف کے لیے...اساتذہ سے، دوستوں سے، قارئین

سے، والدین، سسر صاحب، شوہر سے بھی۔ سچ کہوں، یہی میرے محرک بھی ہیں اور نقاد بھی۔ ویسے بھی حوصلہ شکنی میرے لیے چیلینج ہوتی ہے۔

☆ افسانہ ایک طرح سے اُس شوخ و چنچل حسینہ کی مانند ہے جو ہر چاہنے والے کو مسکرا کر دیکھنا اور شرما کر طرّہ دے جانا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ آپ کو اردو افسانے سے تعلقات استوار کرنے میں کن دشوار مراحل کا سامنا رہا؟

☆☆ میرا پہلا افسانہ ''خلش بے نام سی'' پڑھ لیجیے۔ بیسویں صدی میں شایع ہونے کے بعد پتہ چلا کہ لکھ سکتی ہوں۔ اس وقت اپنی نثر نگاری کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ پھر نئی زندگی کی شروعات ہوئی اور بریک ہوا۔ سکون، بے سکونی، سمجھوتے، جدوجہد نے ایک بار اور الجھا دیا۔ شایع کروانے کی لاپرواہی، ایک طرح کی بے اعتنائی۔ ہر دور کا اپنا مزا ہوتا ہے۔ اب سمجھ گئی ہوں کہ یہ تیسرا اور آخری موقعہ ہے۔ اپنے آپ سے کہتی ہوں، ''اب بس یہی ڈگر یہی منزل! لیکن کھڑکیاں تو ہوا کے جھکڑ سے کھل ہی جاتی ہیں!''

☆ کہانی کا فن مطالعے، مشاہدے اور تجربات کے کڑے کوس کاٹ کر مہربان ہوا کرتا ہے۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، فہمیدہ ریاض اور جیلانی بانو کی حد تک بات سمجھ آتی ہے آپ جیسی سگھڑ، کم گو، شرمیلی لڑکی نے اتنا کچھ کب، کہاں اور کیسے حاصل کر لیا جسے پڑھ کر ہر عمر اور مزاج کا قاری بھونچکاں ہے؟

☆☆ جو کچھ سنا، پڑھا، دیکھا، بھوگا سب دل پر جھیلا۔ باتیں قصے حادثے ذہن کی پرتوں سے گزرتے رہے۔ جب urge ہوئی تھوڑے بہت صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیے۔

سب کچھ میرے اندر تھا۔ بس سمیٹنے کی دیر تھی۔ زندگی کے ساتھ ہی سب چلتا رہا۔ زندگی کے ساتھ ہی چلنا چاہیے۔

☆ آپ کے کئی افسانوں کو ایک سے زائد احباب نے نفسیاتی افسانے سے تشبیہ دی ہے۔ بطور قاری ہم بھی آپ کے افسانوں میں نفسیات کے برتاؤ کو کئی بار محسوس کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ نفسیات کا مضمون مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی اس کا برتاؤ اُس سے بھی زیادہ دشوار؟

☆☆ اپنی اپنی دلچسپی کی بات ہے۔ ویسے ہمارے گھر میں نفسیات کی بے شمار کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ والد صاحب کو نفسیات میں خاص دلچسپی تھی۔ وہ فاؤنٹین کے آس پاس سے کتابیں خرید کر لاتے رہتے تھے۔ وہاں وہ خاص اسی کام سے جایا کرتے تھے۔ انسانی نفسیات کی پیچیدگی سے الجھنے اور اس کی گتھیوں کو کھولنے کی کوشش میں مزا بھی تو آتا ہے۔ کالج میں میرا ایک موضوع نفسیات بھی تھا۔ خوب پڑھا۔ صوفیہ کالج کی لائبریری میں اردو میں بھی بڑی اچھی کتابیں ہوتی تھیں۔ زندگی کا مطالعہ کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے۔ ویژن ملا۔ علمِ نفسیات انسانی طرزِ عمل یعنی behaviour کا سائنس ہے۔ اور ادب انسانی فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے بغیر فکشن پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔

☆ ڈاکٹر شبانہ اعظمی نے آپ کی کہانیوں اور اُن کے کرداروں پر مقامیت کی گہری چھاپ یعنی ممبئی کی آس پاس کی کہانیاں بتلا کر آپ کی تخلیقی پرواز کو محدود کرنا کیوں مناسب جانا؟

☆☆ مقامیت ضروری ہے۔ ہر کردار کسی نہ کسی مقام پر رہتا ہے۔ جنگل، بیابان، شہر، گھر باہر... میری کوشش یہی رہی ہے کہ اس جگہ کو تصور کروں، دیکھ لوں جہاں میرے کرداروں کی سرگرمیاں ہیں۔ انسان دنیا کی کسی بھی جگہ ہو، انسان کی کہانی، انسان کی نفسیات اپنا عمل کرتی رہتی ہے۔ اس سے انسان کے خوشی اور غم کے دریا ٹھہرتے نہیں ہیں۔ زمان اور مکان تو بس جغرافیائی ضرورتیں ہی لگتی ہیں۔

☆ نور الحسنین صاحب آپ کے افسانوں کے پلاٹ، ماحول اور کرداروں کو جس نئی دنیا کی تلاش سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ ہمارا اشتیاق اُس دنیا کے بارے سوا ہو جاتا ہے؟

☆☆ ان کا خیال اور سوچ قابل احترام۔ حقیقی دنیا کی تلاش، جیتے جاگتے انسانوں کی تلاش... مکھوٹوں کے پیچھے چھپی ہوئی دنیا کی تلاش ہے۔

☆ پروفیسر قدوس جاوید نے افسانہ نگاروں کی کہکشاں اقبال مجید، پیغام آفاقی، حسین الحق، غضنفر، عبدالصمد، شموئل احمد اور مشرف عالم ذوقی کی جس لڑی میں آپ اور آپ کے فن کو پرو دیا ہے اُس کے بعد آپ کی ذمہ داریوں میں اضافہ فطری امر ہے اُس سے بھی زیادہ اہم سوال اُن ذمہ داریوں پر پورا اُترنے کے حوالے سے بنتا ہے؟

☆☆ افسانے زندگی کی عکاسی ہوتے ہیں۔ جس میں پلاٹ، ماحول، کردار، مکالمے، زبان اور بیان سے گندھے ہوتے ہیں۔ اپنے آس پاس کے کرداروں، ماحول اور مکالموں پر میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نظریں جم جاتی ہیں۔ ہاں یہ افسانہ ہے! کسی کو میں کہانی کی شکل دے پاتی ہوں اور کوئی ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔

☆ ابتدائی سفر میں علی احمد فاطمی صاحب نے ناول کے باب میں آپ کو جو مشورے دئے تھے اُن پر آپ نے کس حد تک عمل کیا اور نتائج کیا برآمد ہوئے؟

☆☆ جی، خواب جینا چاہتی ہوں۔ تعبیر جینا چاہتی ہوں۔

☆ علی احمد فاطمی صاحب ڈھکے چھپے الفاظ میں آپ کی نسبت زود گوئی کا ذکر فرما کر کسی قسم کی تشویش کا اظہار تو نہیں کر رہے؟

☆☆ مجھے لگتا ہے کوئی بھی رائٹر زود گو نہیں ہو سکتا۔ دراصل تصنیف کا عرصہ نسبتاً مختصر ہوتا ہے۔ سوچنے کا عمل، لکھنے کے بعد کلرکی کا کام اسّی فی صد تک ہو سکتا ہے۔ زود گو یعنی کاتی، لے دوڑی!!

☆ آگے چل کر فاطمی صاحب آپ کے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کو واقعات کی کھتونی بتلاتے اور قاری کو وہم مشکل کی کیفیت سے دوچار کرتے دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ اپنے نقادوں کے خیالات سر آنکھوں پر.... اور پھر فاطمی صاحب!!

☆ کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کے اردو، ہندی، تیلگو اور انگریزی میں کئی ایڈیشن شائع ہونا ناول کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے مگر محترمہ کہکشاں عرفان کی یہ رائے کہ ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' میں ''آگ کے دریا'' کی سی وسعت ''ٹیڑھی لکیر'' جیسی محرومئی نفسیات ہے۔ کچھ اوپر کی بات لگتی ہے؟

☆☆ قاری میرے لیے محترم ہیں۔ یہ ان کی محبت ہے۔

☆ اپنے ناول ''راجدیو کی امرائی'' میں ڈائنسٹی کے منفرد برتاؤ اور برہمنوں کے طرزِ حیات کی نسبت کچھ معلومات فراہم کیجیے؟

☆☆ سب حقیقت پر مبنی ہے۔

☆ پروفیسر وارث علوی نے یہ کہہ کر فکشن نگاروں کے لیے مشکل پیدا کر دی ''مجھے اُن ناولوں کی تلاش ہے جن کی دنیا میں کھو کر آدمی خود کو پاتا ہے'' ٹائم لٹریری سپلیمنٹ نے تو حد کر دی ''آج کے ناولوں میں مایوس کُن زیادہ ہیں'' ہمارا اشارہ یا سوال آپ سمجھ رہی ہیں نا؟

☆☆ ان کی یہ رائے میرا ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' پڑھنے سے پہلے کی ہے۔ 'جس دن سے...!' اور 'راجدیو کی امرائی' ان کے راہی عدم ہونے کے بعد منظرِ عام پر آئے۔

ویسے ادب کی تخلیق اس کے ادب کی تخلیق زمانے کے حساب سے ہوتی ہے۔ مایوسی زمانے میں نظر آئے تو تخلیق میں آئے گی ہی!

☆ عورت اور کہانی کا لازم و ملزوم ہونا تو سمجھ آتا ہے مگر اردو اور عورت کیونکر لازم و ملزوم ہوئے؟

☆☆ اردو مادری زبان...اسی سے۔ ہو گیے نا لازم و ملزوم! مادر جو زندگی دیتی ہے۔ زبان سب سے پہلے ماں یعنی عورت کی گود ہی سکھاتی ہے۔ زبان جو زندگی کو آسان بناتی ہے۔

☆ خواتین کی آزادی یا برابری کے حوالے سے دنیا میں طرح طرح کی تحاریک اور فورم پر آواز اُٹھائی جاتی ہے جبکہ آپ جیسی پڑھی لکھی روشن دماغ تخلیق کار، خواتین کے حقوق کی جدوجہد کے بجائے فرماں بردار بیوی اور سگھڑ خاتونِ خانہ بننے کی جستجو میں مگن ہے؟

☆☆ اس میں برائی کیا ہے! حقیقت کو آئینہ دکھایا ہے۔ اس کی ضرورت ضرور ہے۔ یہ میرا مقصد نہیں...لیکن ادب کے اور بھی تو مقاصد ہیں۔

☆ بات یہاں پر ختم ہوتی تو ذاتی زندگی کے احترام میں خاموشی اختیار کر لی جاتی مگر آپ کے افسانوں، ناول اور ڈراموں میں نیک بی بی بننے کی ترغیب و تحریک بھی جا بجا دی جاتی ہے؟

☆☆ قاری کو اگر یہ بات میری تخلیق میں نظر آتی ہے تو یہ اچھی بات ہے۔ اس سے میں خوش ہوں۔ اِس زمانے میں اِس کی زیادہ ضرورت بھی ہے۔ تعلیم اچھی زندگی جینا سکھاتی ہے۔ زندگی کو معنی دیتی ہے۔ آزادی گھر کے باہر ہے۔ گھر کے اندر تہذیب ہے۔ سمجھوتے ہیں۔ سکون کی تلاش ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو ٹوٹ پھوٹ ہے۔ شخصی، گھریلو، سماجی، عالمی شکست و ریخت ہے۔

☆ حقّانی صاحب کے سوال ''کیا عورت ذہنی و جسمانی طور پر کمزور ہے'' کے جواب میں آپ جس قدر پُرعزم نظر آتی ہیں معاشرہ اُسی قدر منہ زور ہوا جاتا ہے۔ بدلتے حالات و واقعات کی روشنی میں آپ اپنے موقوف میں کسی طرح کا تغیر و تبدل محسوس نہیں کرتیں؟

☆☆ یہ تغیر میری تحریروں میں جا بجا ہے۔ قارئین نے مجھے بولڈ رایٹر کہلانے کا تحفہ بھی دیا۔ 'جس دن سے...!' ناول کی جیتو کی ماں، بھابی، اس کی دوست نئے زمانے کے نام نہاد روشن خیال تحریکوں سے متاثر خواتین ہیں۔ متاشا اور اس کی دادی بھی نئے زمانے کی علامتیں ہیں۔ 'راجدیو کی امرائی' ناول کی اَون تِکا، اس کی چھوٹی بہو، تلسا کیا اپنے طریقے کی آزادی کی خواہش مند نہیں!

افسانوں میں 'بیچ ندی کا مچھیرا' کی آدی واسی مہادو کی بیوی پدما، 'وہیل چیئر پر بیٹھا شخص' کی اِقرا، 'ٹوٹی شاخ کا پتّہ' کی رئیسہ، 'دیوار گیر پینٹنگ' کی صدف، 'شریاں والی'، 'نوٹس' کی مینا، پہلی بیوی، 'چاہے اَن چاہے' کی پاروتی، 'خدا کی دنیا بہت وسیع ہے' کی سمن مہتاب، 'شیشے کا دروازہ' کی 'میں'۔ اس کے علاوہ میرے ڈراموں کے کئی کرداروں میں معاشرے کی منہ زوری کے لکشن نظر آتے ہیں۔

☆ جس طرح ہر آدمی کو قدرت نے شکل و صورت عقل و دانش کامیابی و ناکامی بقدر حصہ دی ہے اُسی طرح ہر شخص میلانِ طبع کے مطابق اپنی پسند کے میدان کا انتخاب کرتا ہے۔ آپ کے ہاں ادیب، شاعر، نقاد، ماہرِ تعلیم کے یکجا ہونے کا سبب اوپر والے کی فیاضی گردانا جائے، قسمت کا ہانکا سمجھا جائے یا بہت کچھ حاصل کرنے کی خواہش سے تعبیر کیا جائے؟

☆☆ عشق، اپنی زبان اردو سے عشق۔ ذہنی انبساط، قوتِ اظہار کے استعمال کی مسرت، قسمت کی فیاضی، محنت اور لگن، کتابوں سے محبت وغیرہ وغیرہ...

☆ نثر تخلیقی جوہر، مطالعے، مشاہدے اور مشق سے دسترس میں آتی ہے جبکہ شاعری بالخصوص اردو، بحر و اوزان کے کڑے کوس کاٹ کر مہربانی ہوتی ہے جس میں رہنمائی کا دخل لازم ہے۔ یہاں بھی گرہ کشائی کا بار آپ کے ناتواں کاندھوں پر؟

☆☆ اردو شاعری سے محبت، مشق، مطالعہ مشاہدہ تو نثر و نظم دونوں ہی کے لیے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اردو ذریعہ تعلیم نس نس میں تغزل کے جوہر بھر دیتی ہے۔

☆ ہماری طرح بہت سے سادہ دل ترقی پسند شاعر اور شاعری کو صنعتی دور کی دین گردانتے تھے اردو ناول صنعتی دور کا نمائندہ کب اور کیونکر ٹھہرایا گیا؟

☆☆ اردو میں جزوی طور پر تو ٹھیک ہے لیکن کبھی پوری طرح اس کو تحریک کے مقصد سے نہیں لکھا گیا۔ داستانوں کی بعد ابتداء میں رومانی تحریک کو اصلاحی ناولوں نے دبایا۔ اس دور میں ناول کی ہیئت نہیں ہوتی تھی۔ ڈرامے کی طرح

مکالمے لکھے جاتے تھے۔اظہار کا اسلوب کافی طویل ہو جاتا تھا۔جب ناول کی ہیئت طے ہوئی تو زندگی کے ہر شعبہ کو ٹچ کرنے لگا۔کسی نے خود کو محدود رکھا۔کسی نے آکاش چھونے کی کوشش کی۔

ہر زندہ زبان کی طرح اردو ناول بھی ہمیشہ سماجی،سیاسی،ثقافتی زندگی کا غماز رہا ہے۔اس میں انسانی زندگی کی کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں صنعت وحرفت بھی آتی ہے۔

☆ اردو ناولوں میں مشرقی روایات اور معاشرتی نظریات کی عدم دستیابی کا گلہ ناول نگار بالخصوص خواتین سے کس بنا پر کیا جاتا ہے؟

☆☆ دنیا مسائل اور موضوعات سے بھری ہوئی ہے،ایک کردار میں کئی کہانیاں۔تصور سے کردار گڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

خواتین نے بھی ہر موضوع پر لکھا ہے۔انھیں محدود نہ سمجھا جائے۔
اپنی مثال دوں کہ میری ہر تحریر ایک الگ موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔

☆ دیگر زبانوں کے مقابلے اردو زبان و ادب میں ناول کی کمیابی یا ناول نگار عنقا ہونے کے کیا اسباب ہیں اور ان کا سدِ باب کس طرح ممکن ہے؟

☆☆ شعر و ادب کی بے شمار اصناف جس کا جس صنف میں دل رَمے!جو کام کر پائیں۔وقت اجازت دے،موڈ بھی،ذہن بھی۔بنے..ادب کی راہیں کھلی ہوئی ہیں کوئی پابندی نہیں۔اب لوگ پہلے سے مصروف تر ہیں۔ایک دوڑ سی ہے۔ناول کے لئے ٹھہر کر لکھنے کا وقت نکالنے کے لئے بہت سی باتوں،چیزوں کو روکنا ہوتا ہے۔پھر بھی جہاں چاہ وہاں راہ...جس طرح لکھنا چاہیں لکھیں۔اپنا اپنا انداز، اپنی اپنی طرزِ فکر

؎ پھول کِھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

☆ ہر نئی فکر اور نظریہ میں سیکھنے کے بہت امکانات ہوا کرتے ہیں اس کے باوجود آپ ترقی پسندی،جدیدیت،مابعد جدیدیت،فیمنزم اور دریدہ وغیرہ سے گریزاں ہیں؟

☆☆ اِزم زندگی کے لیے ہے،زندگی نہیں۔میں زندگی میں یقین رکھتی ہوں۔زندگی ایک ہے،دنیا ایک۔اِزم سے نہ گریز ہے نہ ہی وہ بالمقابل کھڑے ہوئے ہیں۔

☆ ہم اپنی کم علمی پر شرمندگی کا اعتراف کرتے ہوئے عصری بیانیے کی حقیقت سے آگاہی کے خواہش مند ہیں اور یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ جس تیزی سے دنیا تبدیل ہو رہی ہے اُس کی روشنی میں عصری بیانیہ کب تک اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے؟

☆☆ وہی ادب زندہ رہتا ہے جو وقت اور حالات کا ساتھ دے پاتا ہے۔ورنہ صفحۂ ہستی سے مٹنے میں دیر کیا لگے گی!عصری بیانیہ وہ ہے جو موجودہ زبان میں آسانی سے لکھا جائے اور پڑھا جائے۔ہر خاص و عام اسے پڑھ سکے اور لکھ سکے۔یہ رویہ اختیار کیا جائے تو امید ہے کہ یہ قائم ودائم رہے۔

☆ اردو تنقید کبھی بھی اپنوں اور غیروں کی نظر میں وہ اعتبار قائم نہ کر سکی جس طرح ترقی یافتہ دنیا کی زبان و ادب میں کر چکی ہے۔اس حوالے سے آپ کا نقطہ نظر خصوصیت کے ساتھ آپ کی لکھی تنقید کے بارے جاننا ضروری ہو جاتا ہے؟

☆☆ ہندوستان میں بھی نقادوں کا بڑا احترام ہوتا ہے۔ان کے بغیر تعلیمی، علمی سرگرمیاں مکمل نہیں ہوتیں۔تنقید اچھی چیز ہے۔وہ تخلیق کو کھولتی ہے۔اس میں تعریف یا تنقیص کی گنجائش کہاں ہے۔کبیر نے سچ کہا ہے

نِندک نیارے راکھیے، آنگن کُٹی چھوائے
بِن پانی صابن بِنا، نِرمل کرے سُبھائے

(تنقیص و تنقید کرنے والے کی عزت کیجیے کہ یہ آپ کی کمزوری کو آپ کے سامنے لا کر آپ کو بے عیب کرتا ہے)

میں خود کو خوش نصیب گردانتی ہوں کہ میرے کام پر دل کھول کر تنقید ہوئی ہے۔

☆ آپ کے بارے جتنا کچھ لکھا گیا آپ کے ہم عصر اُس کی خواہش ہی کر سکتے ہیں مگر جب ہم اُس کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اِکا دُکا مستثنیات کے علاوہ بات تبصرے اور کوٹیشن سے آگے نہیں بڑھتی؟

☆☆ اظہارِ خیال سب کا اپنا اپنا ہے۔دوسرے یہ کہ جب تک میرے پاس تھا میرا تھا۔شایع ہونے کے بعد آپ کا ہو گیا۔جی، میں اپنی تحریروں سے باہر ہوں۔

☆ اوّل اردو والوں کی اکثریت (معذرت کے ساتھ) لکھنے پڑھنے کا زیادہ تردد نہیں کرتی،بہت ہوا تو گنے چنے انگریزی ادیبوں کو پڑھ کے بقراط ہو گئے اور اٹھتے بیٹھتے مدِ مقابل پر علمیت کا رعب بگھارنے لگے۔آپ ہمیں مراٹھی زبان و ادب کے بارے اپنے احساسات و تاثرات بتلایئے؟

☆☆ ہندوستان کی بے شمار زبانوں میں دس کروڑ سے زائد عوام کی مادری زبان مراٹھی ہے۔مہاراشٹر کی اس خوبصورت اور زرخیز ریاستی زبان کی اپنی تہذیب ہے۔مہاراشٹر میں اسے شاہوں کی سرپرستی بھی حاصل ہوتی رہی ہے۔اس کا رسم الخط دیوناگری ہے۔قبل ویدک زمانے کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی اس زبان کی تقریباً باون بولیاں ہیں۔ہر بارہ کوس پر لہجہ اور بولی بدل جاتی ہے۔سنت ساہتیہ کی عالی شان روایت نے اس کی آبیاری کی ہے۔سنت گیانیشور نے ۱۲۷۵ء میں سنسکرت کے گیتا کا مراٹھی میں آزاد ترجمہ کیا تھا جس کا اصل نام 'بھاوارتھ دیپکا' ہے اور جو'گیانیشوری کے نام سے مشہور ہے۔اور ۱۶۵۰ء کے سنت تکارام کے ابھنگ کا وہ ''تکارام گاتھا'' کے انگریزی کے علاوہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمے کیے گئے ہیں۔

آزادی کے بعد اس میں گرامین، شہری، دلت، آدی واسی، بچوں کا، نسائی ہی نہیں پُرُش وِمرش یا ڈسکورس شامل ہوئے۔ 'دلت ادب' کو مراٹھی زبان نے دنیا بھر کو متعارف کروایا۔ خواتین کا تحریر کردہ دلت ادب کافی بولڈ مانا جاتا ہے۔ مراٹھی ڈرامہ اسٹیج لاجواب ہے۔ مہاراشٹر کے سانگلی سے ۱۸۴۳ء میں وشنوداس بھاوے نے ''سیتا سویمبر'' سے ڈرامہ ادب کی تحریک شروع کی۔ پچھلے سال تقسیم کے درد کے موضوع پر شفاعت خان کا ڈرامہ ''راہلے گھر دور ماجھا'' (میرا گھر مجھ سے دور رہ گیا) بی.اے. کے نصاب میں پڑھایا گیا تھا۔

☆ موجودہ بھارت میں اردو زبان کی صورتِ حال اور تناسب کس قدر تسلی بخش ہے محرّر اور مدرس کے علاوہ اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے عملی زندگی میں کیا امکانات ہیں؟

☆☆ اردو کی صورتِ حال تسلی بخش تھی ہی کب! علم کا حصول مالی فائدے کے لیے کریں تو اکثر نا امیدی ہاتھ لگتی ہے۔ آج کا تعلیمی نظام کاغذی ہے۔ اکثر علم کی نہیں بلکہ صرف ڈگری کی شان ہے۔ ڈیمانڈ اور سپلائی! ڈگریاں اکٹھا کرنے کا شوق ضرورت بن گیے ہیں.. علم کا حصول مہذب بناتا ہے۔ پیشہ ایک الگ چیز ہے۔ ہر علم کمائی کا ذریعہ بنے یہ کوئی ضروری نہیں۔ اسی لیے علم میں شخصیت سازی کے ساتھ ساتھ اضافی ہنر حاصل کرنے کی کوشش رہنی چاہیے۔ specialisation اور تخصص کا زمانہ ہے۔ ویسے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے جو کوششیں ہو رہی ہیں۔ اردو والوں کو ان سے امکانات بہت روشن نظر آتے ہیں۔

اردو فکشن اور شاعری سے دلچسپی سماج میں ختم نہیں ہوسکتی۔ ادیب اور شاعر موجودہ دور کے لحاظ سے ان کے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے میں کسی زبان سے پیچھے نہیں ہیں۔

☆ ہمارے ہاں تو نظامِ تعلیم تیزی سے زوال پذیر ہے۔ کسی زمانے میں دسویں پاس اردو، انگریزی، ہندی میں مناسب استعداد کے سبب دفتر میں بابو بھرتی ہوا کرتے تھے اب بی۔اے، ایم۔اے پاس صرف اس لیے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں کہ انگریزی تو کجا اردو میں بھی سادہ خط یا درخواست درست املا میں نہیں لکھ سکتے؟

☆☆ افسوس کا مقام ہے۔ پرائمری اسکول میں بہترین اساتذہ کے تقرر کی ضرورت پر غور کیا جانا چاہیے۔

☆ یہ ہی وہ موقع ہے جہاں ہمارے دل میں آپ کے گھر اور گھر والوں کی نسبت علم و ادب سے دلچسپی کا احوال جاننے کی خواہش سر ابھار رہی ہے۔ نوجوان نسل کے حوالے سے اردو زبان و ادب کو سامنے رکھتے ہوئے کسی طرح کی خوش اُمیدی قائم کرنا مغالطہ کو دعوت دینے کے مترادف تو نہیں؟

☆☆ میرے شوہر اردو والے اور اردو سماج کے ہیں۔ میری تحریروں کے پہلے نقاد۔ بچے اردو سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میرے پہلے ناول کا بیٹی نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ بچوں کے ننھے منے بھی اردو پڑھتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند، کھوپولی رائیگڑھ شاخ اور فری اردو کلاس کا افتتاح مجروح سلطانپوری صاحب نے کیا تھا، جواب بھی زندہ ہے۔

☆ ہر باخبر شخص جانتا ہے کہ آنے والا دور مقامیت اور علاقائیت کا ہوگا جس میں بہت سی زبانیں اپنے وجود سے محروم بھی ہوسکتی ہیں۔ اردو اور اُس کے رسم الخط کی بابت آپ کس قدر پر اُمید ہیں؟

☆☆ یقیناً انگریزی پڑھنے کے جنون نے علاقائی زبانوں کو تباہی کے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ رسم الخط بھی زبان ہی ہے۔ اس کا زندہ رہنا زبان کا زندہ رہنا ہے۔ تہذیب کا زندہ رہنا ہے۔ ویسے ہر ملک کی سرکاری زبانوں کی دنیا میں اس کی اہمیت مسلم ہوتی ہے۔ اس لیے اردو محفوظ ہے۔ رہے گی کہ اردو بڑی سخت جان ہے۔ ہر حال میں زندہ رہنے کی قوت ہے اس میں۔ بے شک ممبئی میں اب صرف چار کالجوں میں اردو سلامت ہے۔ کئی اسکول بھی بند ہو رہے ہیں لیکن لا تعداد نئے اسکول وجود میں آرہے ہیں۔ مہاراشٹر کی تو بات ہی اور ہے!

☆ دنیا بھر کے پِسے ہوئے کمزور طبقات کی بابت مقتدر حلقے ہمیشہ بلند بانگ دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی ''بندۂ مزدور'' اور ''میری دنیا کے غریبوں'' جیسی بے پناہ امکانات کی شاعری جا بجا نظر آتی ہے مگر حالات روز بروز دگرگوں ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ نہیں سمجھتی کہ یہ وقت اردو والوں کے متحرک ہونے اور مربوط انداز میں آگے بڑھنے کا ہے؟

☆☆ جی، یہ اشد ضروری ہے۔ آپ نے بالکل صحیح نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں اردو والوں میں چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ سوچ بچار چل رہے ہیں۔ خدا کرے یہ ارادہ عملی جامہ پہن لے۔

آپ کا ناول بہت دلچسپ ہے۔ زبان اور اسلوب پر بھی نظر ہے۔ صاف دلچسپ طریقے سے لکھا ہے۔ یہ خدا داد ہے۔ جزئیات نگاری، مرقعہ نگاری conceived ہوئے ہیں۔ کردار سامنے آئے ہیں۔ واقعات بہتر اور clarity کے ساتھ آئے ہیں۔ ناول یہی سب دکھانے کی چیز ہے۔

وارث علوی

(●)

''عشق کی تان''

(ڈاکٹر صادقہ نواب کا سحرِ سخن)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

عشقِ نبوی ہے بسا اِس جان میں — نعت کہتی ہوں نبی کی شان میں
دین و دنیا کو ملاکر رکھ دیا — کیا نہیں پاتی ہوں اِس احسان میں
دکھ کا ہے عالم تو آ، چل یاد کر — دیکھ میٹھا درد ہے اِس تان میں
یہ گھٹا گھنگھور، بجلی، آبشار — نعت خواں ہیں سب نبیؐ کی شان میں
بھیگی پلکوں میں چھپا ہے آبشار — لونگ کا ٹکڑا ہو جیسے پان میں
رحمتوں کی ساری دنیا آپؐ ہیں — ہم کو بھی مل جائے کچھ وردان میں
اپنی امّت کے لئے آپؐ آئے تھے — کشتیاں کب تھم سکیں طوفان میں!
تان ایسی چھیڑ دی ہے عشق کی — روح جیسے پھونک دی ایمان میں
انشاءِ اللہ آئے گی اک دن بہار — جوش آیا ہے مرے ایمان میں
صادقہ تجھ کو پکارے زندگی — بس نبیؐ کو یاد کر ہر آن میں

......○......

☆

لگا ہوا ہے گلوں کا انبار بلبلیں گنگنا رہی ہیں
جب آنگنوں میں پڑے تھے جھولے، وہ داستاں یاد آ رہی ہے

ملی نہ منزل ابھی تلک جو، قصور اپنا ذرا نہیں تھا
نہ بولے پتھر کے راستے گر خموشیاں مسکرا رہی ہیں

یہ شخصیت کی گرفت ہے یا تمہاری خاموشی بولتی ہے
مجھے بھی تشویش ہو رہی ہے کہ شوخیاں گنگنا رہی ہیں

تمہاری طاقت بڑھا دی ہم نے لبوں پہ اپنے مہر لگا کر
جو چپ رہے اور فنا ہوئے ہیں انہیں کی یادیں ستا رہی ہیں

سبب نہیں کچھ کہ رشتے ناطے سِلوں میں برفوں کی دب گئے ہیں
یہ صادقہ نے کہا بھی کب تھا کہ گرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں

○

☆

نہ تو جنگلوں کی تھی خواہشیں، نہ تو آرزوئے سفر رہی
جہاں دانہ لکھا تھا چل دئے، کہاں طے شدہ سی ڈگر رہی

یہی مالی تجھ سے سوال تھا کہ جو توڑ پھینکا مجھے کہیں
میں کہ چمپا تھی یا گلاب تھی، کہاں تجھ کو اِس کی خبر رہی

کہیں مور رقص میں محو ہے، کہیں پی کہاں کی صدائیں ہیں
کہیں ایک بوند کی ہے طلب، گھنے بادلوں میں اگر رہی

مرے ہاتھ مہندی ہری لگی تو نکھار سُرخ سا کیوں ہوا
نہ تھا یہ سوال مرا کبھی، کوئی سوچ ایسی مگر رہی

سبھی بیریاں تھیں پکی ہوئی، سبھی گندھ رس میں بسی ہوئی
میں سحر کو پوچھتی ہی رہی کسی سوچ میں وہ مگر رہی

○

☆

بادل رکے ہوئے کہیں ندّی بہی ہوئی
جی چاہتا ہے رد کروں سب کچھ کہی ہوئی

تھا آسماں بلند سو اُڑ ہی نہ پائی میں
وہ سوچتا ہے میں ہوں زمیں پر جمی ہوئی

ہر دن مرے لیے ہے نئے سال کی طرح
ہریالی ڈھونڈتی ہوئی میں خود ہری ہوئی

جب تک مرا مزاج تمہارا مزاج تھا
محسوس کر رہی تھی میں خود کو ڈری ہوئی

میرا وجود بٹ گیا کس کس وجود میں
میں تھی اکیلی کیا ہوا ہوں کیوں کٹی ہوئی

وہ کھیت دھان کے تھے مرا دل لبھا گئے
خواہش کوئی ہے جاگتی دل میں دبی ہوئی

اتنا ملا جہاں میں کہ اب یاد بھی نہیں
کس موڑ پر کہاں مجھے کیا کیا کمی ہوئی

تھیں صادقہؔ شکایتیں دل میں بھری ہوئی
میں بھول سی گئی ہوں خود اپنی کہی ہوئی

...... O ......

☆

جو مشکلات سے ہنس کر یہاں نبھا لے گا
مجھے یقیں ہے وہ منزل ضرور پا لے گا

مجھے نہ ڈھونڈ تجھے اب نہ مل سکوں گی میں
اِس آرزو میں کہیں خود کو تو گنوا لے گا

جنونِ عشق کو کیوں رہنما کی حاجت ہو
یہ بہتا پانی ہے خود راستہ بنا لے گا

میں اپنی شاعری قدموں میں تیرے رکھ دونگی
مجھے یقین ہے پلکوں سے تو اُٹھا لے گا

تو ہمسفر ہے مرا ، مجھ کو کوئی فکر نہیں
میں لڑکھڑاؤں تو بڑھ کر تو ہی سنبھالے گا

خرد کے سائے سے مجھ کو خدا بچائے سحرؔ
نہیں تو راہِ جنوں سے مجھے ہٹالے گا

O

☆

موجِ تشنہ لبی رہی مجھ میں
اک نئی زندگی رہی مجھ میں

کیا گلہ کرتی میں زمانے سے
در حقیقت کمی رہی مجھ میں

کہہ رہی ہے چراغ کی ہر لَو
شام ِ آزردگی رہی مجھ میں

خامشی ہی مرا مقدر تھی
بات اک اَن کہی رہی مجھ میں

بے سبب کیوں لڑوں چراغوں سے
اے سحرؔ روشنی رہی مجھ میں

O

شکنتلا (معرا نظم)

گمان تھا کہ اک ایسا بھی وقت آئے گا
بڑھا کے ہاتھ محبت کے پھول کی مالا
گلے میں ڈال کے تم مجھ کو بھول جاؤ گے

شکنتلا سی کھڑی راہ میں نہاروں گی
رِوایتوں کی ڈگر پر چلو گے تُم دُشینت !
محل کے کام سلیقے سے تم نبھاؤ گے
تمام فیصلے کرنے لگو گے مذہب سے
مگر ذرا سا یہ سوچو کہ یہ بھی مذہب ہے
دِیا تھا تم نے جسے نام مذہبِ دِل کا

☆

اِکیسویں صدی کی ایک گھٹنا (دَلِت نظم)

سرکاری اسکول میں پینے کا پانی
دینے والا چپراسی ڈھونڈے نہ ملا
جھبوا نے اپنے ہاتھوں سے برتن لے
منہ میں پانی ٹپکایا اور پیاس بجھائی
اونچے ذات کی ٹیچر آئیں اور دیکھا
'انجانے میں دھرم بگڑنے والا تھا!
اَن دیکھے وہ بھی پانی پی جاتیں تو!!'
آگ اُگلنے لگیں نگاہیں، دِل کانپا،
انہونی سے بچنے کا پھر شکر جگا
ہاتھ کی مٹّی سی چھتری پھر یوں برسی
پیٹھ، پیٹ، سر، پیر کا پھر نہ ہوش رہا
ہاتھ رُکے تھک کر لیکن آنکھیں نہ تھکیں،
جھبوا کی آنکھوں میں لہو اُتر آیا
بوند بوند دھاروں کی شکل میں بہتا رہا
نہیں کہانی کوئی پُرانی برسوں کی
آج کی ہے یہ گھٹنا صدی اکیسویں کی!!!

با وجود (آزاد نظم)

مرا سوال دوسرا تھا تم نے کیا سمجھ لیا
میں آرزو کے محل کی مسحور اک پری سی تھی ،
جس کی چال میں لچک تھی جس کے ہونٹ پہ ہنسی...
تم آرزو کے محل کی دیوار سے لگے ہوئے ،
کھڑے تھے میری زندگی کی ڈور سے جُڑے ہوئے
میں آنکھ بھر کے دیکھتی تمھیں ،
تو پوچھتی کہ تم نے ڈور کیوں ہے تھام لی۔
مگر نظر جو آئے تم تو آنکھ کب اُٹھی مری...؟
جھکی نظر سے میں نے یہ کہا کہ میں وجود ہوں
تمہاری زندگی کی اُلجھنوں کے باوجود ہوں

میں آرزو کے محل کی مسحور اک پری سی تھی
تمہارے لو ہے کے محل کی زنگ سے بھری ہوئی ،
رنگ کا غلاف اوڑھے شان سے تنی ہوئی
گلی میں مجھ کو چھوڑ کر
وجود کی تلاش میں نکل نہ جاؤ تم کہیں....!

☆

ماں ہی نہیں ہے (آزاد نظم)

ماں کا چشمہ، ماں کی کتابیں
وہیں پڑی ہیں
ماں ہی نہیں ہے

کمرے میں ماں کی خوشبو
ویسے ہی بسی ہے
بستر کی بے چین سِلوٹیں
پوچھ رہی ہیں
کیسے کی رنگین دوائیں
یوں ہی پڑی ہیں
ماں کی چوڑی۔۔ ماں کے کنگن
ماں کے جیون کی ہر الجھن
وہیں دھری ہے
ماں ہی نہیں ہے!

دوہے

شکوے سارے چھوڑ کر، دیکھو پیاری رات
لے آئے ہم تھال میں، پیار کی یہ سوغات
☆
دانے لاکھوں تھال میں، پنچھی اُڑ اُڑ کھائے
اک پنچھی کو چھوڑ کے، باقی ہر اک گائے
☆
ٹھنڈی ٹھنڈی آگ ہے، سانوریا کی دھوپ
لاکھوں آنکھیں دیکھ لیں، سب میں اُسی کا روپ
☆
خاموشی اُس کی لگے، بے سُر کی اک بین
وہ کیا سب کو بھائے گا، جس کا دل غمگین
☆
دھوکا تو نے کھا لیا، اب رہ رہ پچھتائے
ہونا تو یہ چاہئے، چیَن کی بین بجائے
☆
گائے ہے وہ ٹھاٹ سے، پاگل من کا گیت
یہ کب سوچا بھاگ میں، ہار لکھی یا جیت
☆
مسجد کا جو دوار ہے، وہی ہے مندر دوار
اور دونوں کے بیچ میں، ہے بس اک دیوار
☆
آنکھ ملا کر بات کر، مت کر ایسی شرم
آخر آیا سامنے، تیرا اُلٹا کرم
☆
تدبیروں کا کھیل تھا، تقدیروں کا کھیل
پیتھ نہ ملے تو لوٹ آ، کر لے مجھ سے میل
○

ماہئے

کانٹوں کا مقدر ہے
ظلم کیئے جانا
آنچل تو سمندر ہے
☆
آنے کو وہ آئے ہیں
دل کی کلی ایسی
مرجھائی کیوں لائے ہیں
☆
دستور زمانے کا
وقت بدلتا ہے
کچھ بھی نہ ٹھکانے کا
☆
ویسے تو پریشاں ہوں
زندگی روٹھی ہے
کہنے کو میں حیراں ہوں
☆
چپ بھی کیا رہوں بولو
تم بھی پریشاں ہو
کیا زیادہ کہوں بولو
☆
کیسی یہ بغاوت کی
دل کا سکوں چھینا
اپنوں کی یہ حالت کی
☆
راہوں میں مڑے کیسے
مل کے جدا ہونے
کیوں ہم سے جُڑے ایسے
○

ہم پنچھی ایک ڈال کے

اسلم نواب
(رائے گڑھ)

صادقہ سے میری شادی کو برسوں بیت گئے۔ ایسا لگتا ہے کل ہی کی بات ہے۔ اتنا لمبا سفر کیسے گزر گیا، پتہ ہی نہیں چلا۔ جتنی ہماری شادی کی عمر ہے، اس سے زیادہ صادقہ کی ادبی زندگی ہے۔ پڑھنے کا شوق تو مجھے بھی رہا ہے۔ میری بھی تعلیم اردو سے ہی ہوئی ہے۔ اتنے سالوں بعد جب میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت تعجب ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ جوڑے آسمان پر بنائے جاتے ہیں۔ اس سوچ کے پیچھے بھی کچھ باتیں ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ اتنے قریب ہوکر بھی ہمارا کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا۔ جب میں امام باڑہ جے آر اسکول میں پڑھتا تھا، انھیں دنوں صادقہ بھی قریب کے ہی امام باڑہ اسکول میں پڑھتی تھیں۔ جب میں انجمن اسلام میں پڑھتا تھا، تب وہ بھی انجمن سیف طیب جی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ میرا کالج برہانی تھا، اسی محلے میں صادقہ کا گھر تھا۔ اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔

میرے والدین ممبئی سے سوکلومیٹر دور کھپولی نام کی صنعتی جگہ پر رہائش پذیر تھے۔ ابا کی بیماری کی وجہ سے مجھے انٹر کے بعد تعلیم کو چھوڑنا پڑا اور ان کے بزنس کو سنبھالنے کے لئے ممبئی سے کھپولی لوٹ آنا پڑا۔ چار سال بعد ماں باپ نے میری شادی کے لئے کوشش کرنی شروع کی۔ جو پہلا رشتہ دیکھا، وہ صادقہ کا تھا۔ اس طرح ہماری شادی ہوگئی۔

صادقہ کو کبھی پڑھائی میں رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ پڑھ رہی ہیں۔ صرف ایڈمیشن لینے اور امتحان دینا ہی معلوم ہوتا۔

جب بھی صادقہ کی کوئی کہانی یا شاعری چھپتی، ہمارے ابا خوش ہوتے تھے۔ شروع میں صادقہ بہت پریشان ہوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ میرے گھر والوں نے ممبئی کی صوفیہ کالج میں پڑھتی ہوئی ایک لڑکی کی شادی ایک گلی کے گاؤں میں کردی۔ کہتی تھیں: ''آپ لوگوں نے خوب خاطر تواضع کرکے میرے گھر والوں کو پٹالیا۔''

ان دنوں ہمارے گھر میں پیسوں کی پریشانی تھی۔ بزنس ٹھیک سے نہیں چل رہا تھا۔ ایسے وقت میں بھی صادقہ نے بہت ساتھ دیا۔ وہ اپنا وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتیں۔ دوسری خواتین کی طرح بے جا شکایتیں، خواہشیں نہیں کرتیں۔ ان کے لکھنے پڑھنے کی وجہ سے کسی قسم کی بے چینی نہیں رہتی کیوں کہ وہ اپنی ذمہ داری اچھی طرح نبھاتی رہتی تھیں اور رہتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ صادقہ نے دونوں کی بہت اچھی طرح پرورش کی۔ دونوں کو اچھی تعلیم دی۔ شادی کی اور اب ہم نانا نانی، دادا دادی بن گئے ہیں۔

جنھوں نے رشتہ لگایا تھا انھوں نے لڑکی دکھانے کے لئے میرے والدین کو ممبئی بلایا۔ وقت دن کے گیارہ بجے کا طے پایا تھا لیکن میرے والدین جب بائیکلہ پہنچے اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ گھر والے بستر اٹھا کر بھاگ رہے تھے۔ دلہن تھک کر سو چکی تھی۔ میرے سسرال والوں کے لئے بہت بڑا surprise تھا۔ بے چارے بہت پریشان ہوگئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ناشتہ لگایا گیا۔ بات چیت ہوئی۔ ہونے والی دلہن کے دیدار ہوئے اور اسی وقت ان لوگوں نے لڑکی کو پسند کرلیا اور تصویر لے کر کھپولی آگئے۔ تصویر دکھائی گئی اور میں نے ہاں کردی۔ پہلی نظر میں ہی بارہ مالے والی صادقہ مجھے پسند آگئی۔

سمجھ دار سلیقے مند اور اپنی عمر سے زیادہ matured لڑکی میرے گلے باندھ دی گئی جس نے میری زندگی کو لائن پر لگا دیا، بے لائن زندگی۔ مجھے خوشی ہے کہ صادقہ کی تحریروں کو لوگ پسند کرتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کو لوگوں نے پہچانا ہے۔ کئی ساہتیہ اکادمیوں نے ایوارڈ سے نوازا۔

لکھنے کے مرحلوں میں صادقہ نے کبھی گھر کو نظرانداز نہیں کیا۔ صادقہ کا لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ کمرے میں بند ہوکر نہیں لکھتیں۔ چلتے پھرتے، گھر کا کام کرتے ہوئے جیسے کھانا پکانا، کپڑے استری کرنا، بچوں کو اسکول سے لانا، انہیں پڑھانا یہ سب کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

اس لئے کسی کو ان کے لکھنے پڑھنے سے پریشانی نہیں ہوتی۔ جاب کے ساتھ تخلیقی کام کرتے ہوئے انھوں نے گھر کو اچھا سنبھالا۔ بچوں کو ہی نہیں، ان کے بچوں کا، دوسرے گھر والوں کا بھی خیال کیا۔

وہ ایک اچھی بیوی ہیں۔ بہت محبت کرتی ہیں۔ وہ ایک کامیاب بیوی، کامیاب ماں ہی نہیں بلکہ کامیاب رائٹر اور کامیاب پروفیسر بھی ہیں۔

انڈمان میں ساہتیہ اکادمی کے پروگرام میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے جب ان کی کہانی ''منت'' کا تجزیہ کیا تھا، تب میں بہت متاثر ہوا تھا۔ بدقسمتی سے جس موبائل میں ریکارڈ کیا تھا، وہ موبائل چوری ہوگیا۔ انہوں نے بہت تعریف کی کہ ''صادقہ ہر چیز کو ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ کلچر کو، لوکل ذائقہ کو، رہن سہن کو، رشتوں کو۔ ان کے افسانوں میں یہ ساری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔'' بعد میں نارنگ صاحب سے مل کر میں نے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا کہ آپ نے ''منت'' کا جو تجزیہ کیا ہے۔ اس سے مجھے اس افسانے کو سمجھ میں آسانی ہوئی کہ افسانے کی یہ خاصیتیں ہیں۔ ایسے ایسے نکتوں کو انہوں نے ڈھونڈ کر بتایا جس پر عام قاری کی نظر ہی نہیں جاسکتی۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ پڑھائی کو discontinue کرچکا تھا۔ شاید یہ معلوم ہوکر ہی صادقہ نے 'ہاں' کی کہ چلو ایک اسٹوڈنٹ مل گیا۔ اس کو گریجویٹ کردوں جبکہ میں کام دھندے میں لگ چکا تھا۔ کان پکڑ کر ایڈمیشن کرالیا اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی اے کرالیا۔

شروع شروع میں ہم جب کار سے ممبئی جارہے تھے۔ ہنس راج لین

پولیس اسٹیشن کی گلی سے گزرتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔
''کیوں! چہرہ چمکنے لگا۔ دھونس جمارہی ہو کہ میرا بھائی وکیل ہے؟''
بڑے گھر سے آئی ہوئی لڑکی بارہویں منزل سے سیدھے گراونڈ پر پہونچی اور سسرال والوں کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے نبھایا۔ ہمارا گھر بدل گیا۔ میں گھر کا بڑا بیٹا ہوں۔ میری ذمہ داریوں میں کندھے سے کندھا ملا کر چلیں یہ اور بات ہے کہ ان کا کندھا میرے کندھے سے نیچے رہا۔ میرا قد اونچا جو ہے۔
صادقہ نے تینوں زبان میں ایم اے اور پی ایچ ڈی وغیرہ شادی کے بعد کئے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ کیسے ہوا۔ جب ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ''اکیسویں صدی میں اردو ناول'' کے سیمینار میں اپنے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کا ایک حصہ پڑھنے کی دعوت ملی، تب مجھے پتہ چلا کہ میری بیوی established writer ہے۔
جہاں کہیں کانفرنس سیمینار ہوتے ہیں/ صادقہ اکیلے نہیں جانا چاہتی، میں خوشی سے ان کا ساتھ دیتا ہوں۔ اس سلسلے میں ہم دوبئی اور ماریشس بھی گئے تھے۔ بچوں کو ساتھ لے گئے تھے۔ بہت پُر لطف سفر تھا۔ جب جب صادقہ افسانے شاعری ناول لکھتی ہیں تو مجھے ضرور پڑھواتی ہیں۔
اگر اس میں مجھے تبدیلی کی گنجائش محسوس ہوتی ہے تو بتاتا ہوں۔ بس ان کا اچھا قاری ہوں۔ ادبی محفلوں میں میں نے کبھی بیزاری محسوس نہیں کی۔ میں سارا پروگرام سنتا ہوں۔ ادیبوں سے بھی ملتا ہوں۔ اس میں مجھے خوشی ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ نے ہمارے لئے بھی کچھ لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے شاید ہمیں خوش کرنے کے لئے ہو۔ آپ بھی پڑھئے اور ہم دونوں کو دعاؤں سے نوازیئے۔

صادقہ نواب سحؔر کا یہ ناول بھی پچھلے ناول کی طرح نہ صرف اردو میں بلکہ ہندی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوسکے گا۔ ۲۰۰۸ء میں ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کی بے حد مقبولیت نے ناول نگار میں ایک اعتماد کی فضا بُن دی ہے۔ ان کا مطالعہ ناول اسی اعتماد بھرے لہجے پر دلالت کرتا ہے۔ موضوع پر گرفت، سماجیات اور انسانی رشتوں کا وسیع و عمیق مطالعہ اور اس کے ماخذات کا اعادہ کہانی کی شکل میں یہ کمال صادقہ نواب سحؔر نے بخوبی دکھایا ہے۔ آج کے انسانی معاشرے کی اُتھل پُتھل، عورت کا محبت کے نام پر استحصال، یہ اس کہانی کے دو بڑے موضوع ہیں۔ جن کے خوبصورت بیان نے کہانی کو اگلے زمانوں تک زندہ کر دیا ہے۔ دِن بہ دن معاشرے کے مذکور دو بڑے موضوع بگڑتے ہی جارہے ہیں اور ان میں سُدھار کے کوئی وطیرے نظر نہیں آرہے ہیں۔ مرد اور عورت کی باہمی کشش اور رشتوں کی شکست و ریخت کی کرچیاں مصنفہ نے بخوبی اپنے اندر سمیٹ کر کرداروں کے ذریعے ہمارے سامنے رکھا ہے تو کہیں کہیں تو دِل دہل جاتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ ہم تو جیسے تیسے جی لیں گے۔ اپنی حیات مکمل کر ہی لیں گے۔ مگر ہم اپنی عزیز از جان نسل کے لیے کس طرح کا معاشرہ اپنے پیچھے چھوڑے جارہے ہیں؟ کیا اِس موڑ پر ہماری ہی یہ ذمّہ داری نہیں ہوگی کہ ہمیں جو معاشرتی خرابیاں نظر آرہی ہیں ان میں اصلاح پر غور اور اقدام نہیں کرنا ہے؟ اس کے سدھار کی تدبیر ہمیں نہیں کرنی ہے؟ یہ سوال سب سے اہم ہے جو اس کہانی کے مطالعے کے بعد قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سوال کے پیدا کرنے اور سوال کا جواب ڈھونڈھنے پر مہمیز لگانے کا کام اور کارنامہ صادقہ نواب سحؔر نے اپنے اس ناول کے ذریعے کیا ہے۔ میں اس موقع پر انھیں اس بات پر مبارکباد دیتا ہوں کہ سماج اور انسانی رشتوں کے برتنے میں بنیادی اور کلیدی نکات کو اِس طرح چُنا ہے جس طرح کوئی ملکہ کے لیے ہار بُنتا ہے۔

حسین الحق
(بودھ گیا، بہار)

اردو شاعری میں باضابطہ غزل کو اعتبار کا درجہ حاصل ہے اور اسی کے ساتھ نظم نگاری کا وقار بھی حد درجہ بلند ہے، جس طرح اردو شعراء نے غزل کے مزاج کو سربلندی عطا کی، اسی طرح نظم نگاری کو ذریعہ بھی موضوعاتی تنوع کو پیش کر کے اس زبان وادب کی ساکھ کو بلند ترین درجہ تک پہنچا دیا۔ عام طور پر اردو کے شعراء اور ادیب اس مزاج کے واقع ہوئے ہیں کہ وہ اپنے شعری مجموعہ کا نام اردو مزاج کے عین مطابق رکھتے ہیں، جس میں فارسی یا عربی کی آمیزش کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔ صادق نواب سحر بیک وقت شاعر و ادیب ہی نہیں، بلکہ محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی خاتون ہیں، جنہوں نے ساری زندگی ہندی زبان اور ادب کی ترقی و ترویج میں حصہ لیا۔ اس لئے ان کے شعری مجموعہ کے نام کے مطالعہ کے ساتھ ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو اور ہندی کی ایک ایسی چاہنے والی خاتون ہیں، جنہوں نے اپنے شعری مجموعوں کو بھی ملی جلی تہذیب کا علمبردار بنایا۔ انہوں نے بیک وقت ایک ہی سال میں چار شعری مجموعہ پیش کر کے تخلیقی صلاحیت کا اظہار کیا، اس کے علاوہ افسانوی مجموعہ، ناول اور تحقیقی کارنامہ انجام دے کر واضح کیا کہ وہ ادب کی ایسی برگزیدہ خاتون ہیں جو اردو ہی نہیں، بلکہ ہندی شعر و ادب کی دنیا کو جگانے میں مصروف ہوں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1996ء میں ''انگاروں کے پھول'' اور 2003ء میں بچوں کی نغموں کا مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' کی اشاعت عمل میں آئی اور 2018ء میں انہوں نے چار شعری مجموعہ ست رنگی، باوجود چھوٹی سی یہ دھرتی اور دریا کو ہی سویا سا'' پیش کر کے ثابت کیا کہ ان کے تخلیقی ذہن کی فضاء اس قدر ہموار ہے کہ وہ مسلسل شعر و ادب کی خدمت انجام دینے میں مصروف ہوں۔ وہ اردو اور ہندی میں کئی انعامات اور اعزازات کی مستحق قرار دی گئی ہیں اور ان کے تخلیقی کارناموں کو پنجابی، تلگو، کنڑی، انگریزی، مارواڑی اور مرہٹی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ ان کی شائع شدہ تازہ تخلیق ''ست رنگی'' بلاشبہ عمدہ طباعت و کتابت سے آراستہ مجلد خوبصورت ہمہ رنگی سرورق سے آراستہ 182 صفحات سے آراستہ ہے، جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی ہے اور انہوں نے انتساب کے ذریعہ شاعرانہ مزاج کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے مجازی خدا اسلم نواب کو اپنی پرواز اور آواز کا درجہ دے کر اس شعری مجموعہ کو انتساب کیا ہے، ان کا اظہار خیال اور پھر افتخار انعام صدیقی کا پیش لفظ خود اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے عہد حاضر کے اہم نقاد کے ذریعہ صادقہ نواب کی غزلوں اور نظموں کا احاطہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ شعری رویہ کے ساتھ ایک ایسا اظہار نمایاں کیا ہے، جس میں سابقہ نواب سحر بھرپور نسائی لہجہ کے ساتھ ہندوستانی مزاج کی نمائندگی میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس شعری مجموعہ ''ست رنگی'' کے عنوان سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرہ نے باضابطہ تیں غزلوں کے علاوہ پابند نظموں اور معریٰ نظموں کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں ہی نہیں، بلکہ طنز و مزاح اور نثری نظموں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دلت نظموں کی نمائندگی بھی کی ہے۔ بلاشبہ ہندوستان کی اردو شاعرات نے ایک ایسی منفرد خاتون قرار دی جاتی ہیں، انہوں نے غزل اور نظم کے عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادب کی آبیاری کی، اس لئے ان کے شعری مجموعہ ''ست رنگی'' کو خیال اور فکر کی ہمہ رنگی سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس طرح ان کا یہ شعری مجموعہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں یادگار کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ انہوں نے اس شعری مجموعہ کو ہمہ جہت شعری اظہار سے وابستہ کر کے نظم کے جدید تقاضوں کی بھرپور نمائندگی کی ہے اور ان کے اشعار میں نسائی حسیت کا کرب پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ انہوں نے غزل کی شاعری میں اپنی روایت سے وابستگی کا احساس دلایا ہے، لیکن ان کی شاعری میں روایتی حسن و عشق نہیں، بلکہ عصری حسیت کی نمائندگی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے غزل کے ایک مقطع میں لکھا ہے۔

روایت سے سحر رشتہ ہیں میرا
وہی رشتہ پرانا چاہتی ہوں

صادقہ نواب نے غزل کے موضوعات کو ہندوستانی ماحول سے وابستہ کرنے میں پوری کوشش جاری رکھی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کی گونج ان کی وطن دوستی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں۔

وہ کھیت دھان کے تھے مرا دل لبھا گئے
خواہش کوئی ہے جاگتی دل میں دبی ہوئی

غزل کی شاعری میں عام طور پر حسن و عشق کے معاملات کو پیش کر کے اردو کے شاعروں نے غزلیں مسلسل کی کیفیت کو نمایاں کیا ہے، جبکہ صادقہ نواب سحر کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہندوستانی ماحول اور مزاج میں شعر گوئی کرتے ہوئے جب غزل مسلسل کی نمائندگی کرتی ہیں، تو اس کے ذریعہ ہندوستان کے ماحول اور معاشرہ کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں، جس میں غزل مسلسل کی خصوصیت جلوہ گر ہے۔

آج ہر سمت جو پھولوں کی قطاریں آئیں
دل نے خوش ہو کے کہا ہے کہ بہاریں آئیں
گود میں دھرتی کے پکنے لگے پھول مہوہ کے
جھرنے بہنے لگے بارش کی پھواریں آئیں
ٹہنیاں جھوم اٹھی، جھک گئیں جھولے لے کر
دور آکاش میں چڑیوں کی قطاریں آئیں
دور پربت پہ رشی ڈوب گیا بھگتی میں
کتنی چڑیوں کی سحر ل کے پکاریں آئیں

صادقہ نواب سحر کو مختصر بحر میں غزل لکھنے کے ساتھ ساتھ طویل بحروں میں غزلیں لکھنے کا بھی تجربہ ہے۔لیکن انکی شاعری کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنے اشعار میں بیرونی جذبات اور احساسات کو پیش کرنے کے بجائے اپنے ملک کے ماحول اور معاشرے کو پیش کر کے غزل کی شاعری میں نئے موضوعات کو سمونے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔یہ بھی صادقہ نواب سحر کی امتیازی خوبی ہے کہ انہوں نے طویل غزلیں لکھنے سے پرہیز کیا ہے' بلکہ اکثر غزلیں پانچ اشعار کے بجائے چار اشعار پر بھی ختم کردی ہے۔ایک طویل بحر کی ایسی غزل کے اشعار پیش کیئے جارہے ہیں' جس میں انہوں نے ہندوستانی مزاج اور اس ملک کی دھرتی کی خوشبو کو سمیٹ کر اردو غزل کی شاعری میں امتیازی وصف پیدا کیا ہے۔ چنانچہ طویل بحر کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھے نہ جوگن پکارے کوئی' میں جوگ لے کر بھی کیا کروں گی
دھنک سی چھائی ہے آسماں پر' میں رنگوں سے زندگی بھروں گی
پہاڑوں سے جھرنے بہہ رہے ہیں غضب کی آواز گونجتی ہے
سمندروں سے نکالو موتی میں تم سے درخواست یہ کروں گی
سحر ہواؤں کی تازگی میں کھلی ہے بیری کی کچی خوشبو
مرا گھروندا تو ریت کا ہے' میں اِن ہواؤں سے کیا ڈروں گی

صادقہ نواب سحر کو قافیہ نبھانے کا ہنر خوب آتا ہے اور قافیہ کے ساتھ ردیف کو چست کرنا ان کے فن کا کمال ہے۔اگرچہ انہوں نے کتاب کے آخری حصہ میں سوانح کوائف کو جگہ دیتے ہوئے اپنے کارناموں کا احاطہ کیا ہے' لیکن کہیں بھی یہ اظہار نہیں کیا کہ شعری گوئی میں انہوں نے اس سے استفادہ کیا ہے اور کونسے شاعر نے انہیں اصلاح شاعری کا شغف سکھایا ہے۔غرض یہی خوبی کیا کم ہے کہ انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرتے ہوئے ہندی ادب کی استاد رہیں' لیکن اپنے بیشتر کارنامے مادری زبان میں پیش کیئے۔ان کی غزلوں میں نزاکت لفظی اور ترنم کا رچاؤ ہی نہیں' بلکہ اظہار کی شدت بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔وہ مردف غزلوں کے ساتھ ساتھ غیر مردف غزلیں لکھنے میں بھی پوری طرح کامیاب ہیں۔ان کی ایک غزل کے وہ اشعار پیش ہیں' جنہیں انہوں نے غیر مردف حیثیت سے پیش کر کے شعری حسن کاری کا ثبوت دیا ہے۔

کچھ روز محبت کے اندھیروں سے نبھا لے
مل جائیں گے اک روز مسرت کے اجالے
حالات جو پیش آئیں ذرا ان سے نبھالے
مل جائے اگر زہر' دوا جان کے کھالے
وہ لوٹ کے آئیں کہ نہ آئیں یہ خبر کیا
آنکھوں میں تو ان کی ذرا تصویر بنالے
تعمیر کے پردے میں ہے تخریب کا جلوہ
تم کو ہی مبارک یہ ترقی کے اجالے
تم کو ہے قسم پیار کی ان کو نہ بھلانا
پیش آئے ضرورت تو سحر خود کو مٹالے

غزل کی شاعری میں جس انداز سے زبان اور اظہار کی خصوصیت اور نغمگی کو شامل کیا ہے۔اسی طرح ان کی پابند نظمیں ہی نہیں' بلکہ معریٰ نظموں اور آزاد نظموں کے علاوہ طنز و مزاح کے ساتھ نثری و دلت نظموں میں بھی بے ساختگی اور برجستگی کا اظہار ہوتا ہے۔''ست رنگی'' شعری مجموعہ میں انہوں نے جہاں تیس غزلیں' پانچ پابند نظمیں' گیارہ معریٰ نظمیں اور پچیس آزاد نظموں کے علاوہ طنز و مزاح کی نمائندگی کرنے والی چار نظمیں کے علاوہ سترہ نثری نظموں کے ساتھ دلت نظموں کی نمائندگی کے لئے چودہ عنوانات کو نمائندگی دی ہے۔اس طرح غزل کے بعد پابند نظموں کا ذخیرہ مختصر ہے' لیکن ان میں بھی شعری حسن و جمال کی کیفیت جلوہ گر ہوتی ہے۔صادق نواب سحر نے پابند نظم کے دوران نہ صرف مثلث' مربع اور مخمس کے پیرایئے کو استعمال کیا ہے' بلکہ بعض نظموں کو قصیدہ کی روایت سے وابستہ رکھا۔انہوں نے سرسوتی نظم میں نہ صرف ہندی لفظیات کو فروغ دیتے ہوئے کیفیتی فضاء قائم کرنے میں بھرپور کامیاب حاصل کی ہے۔ اس نظم کے اشعار سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرہ نے ہندی اور اردو کے حسین امتزاج کو اس نظم میں شامل کیا ہے۔نظم کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

سرسوتی تم کتنی سندر' من موہن اور پیاری
ہاتھ میں اجلے کنول کو لے کر لگتی کتنی نیاری
ساج سنگھار کیئے ہوں لیکن سیدھی سادھی صورت
ہاتھ میں وینا' ہنس پر بیٹھی جیسے کوئی مورت
کومل تن پر اجلے کپڑے' نین کمل کے درشن
شبد اور اکشر' ویدوں کا ہے نام تم ہی روشن
سر میں' لے میں' سنگیتوں میں تم ہی اٹھلاتی ہو
اس لئے تم شاردا دیوی بھی تم کہلاتی ہوں
برہما جی دوپتنی ہیں ' گائتری اور تم
تم کو پاکر وہ گنگا دھر ہو بیٹھے ہیں گم سم
گیان سادھنا کی بے چینی! گیانی میں رہتی ہو
گیان سکوں دیتا ہے' سچ ہے' آنکھوں سے کہتی ہو

صادق نواب سحر کو شاعری میں جہاں اردو تلمیحات کو نبھانے کا ہنر آتا ہے' وہیں ہندو دیو مالاؤں کی خصوصیت کو بھی پیش کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔پابند نظموں کے بعد انہوں نے عصر حاضر کی انسانی زندگی کے مسائل کو پیش کرنے کے لئے معریٰ نظموں کا بھی سہارا لیا ہے۔ان معریٰ نظموں میں ایک نظم گیت کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتا ہے اور آخری نظم حیدرآباد کے ایک ہوٹل کی نمائندگی کرتی ہے' جبکہ سب سے پہلی معریٰ نظم کے ذریعہ شاعرہ نے مناجات کی خصوصیات کو پیش کرتے ہوئے خدا کی مدحت اور دعائیہ صفات کو شاعری میں نظم

عاری کی حیثیت سے نمائندگی دی ہے۔معریٰ نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

داتا ترے کرم سے میں مایوس تو نہیں
پھر بھی بتا کہ دل مرا ناشاد سا ہے کیوں؟
آنکھوں کے سامنے نہ لٹے میرا کارواں
آیا نہیں ہے جینے کا اب تک ہنر مجھے
تو جانتا ہے‘ ہم سے خطائیں ہوئیں ہیں جو
پھر بھی بتا کہ دل مرا ناشاد سا ہے کیوں!!

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ صادقہ نواب سحر نے پابند نظموں کے بعد معریٰ نظموں کے توسط سے پہلی نظم کو مناجاتی انداز سے وابستہ کیا ہے۔جس کے بعد تمام گیارہ نظمیں عصری حسیت کی بھر پور نمائندہ ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرہ نے ہندوستان کے ماحول اور اس ملک کے معاشرہ کو قریب سے دیکھنے کے بعد دلی جذبات کا محاصرہ کرلیا ہے۔ ان کی گیارہ معریٰ نظموں کے عنوانات وعدہ‘ تصورشکن‘ وہ ایک جہاں‘ بچہ مزدوری‘ آنگن وادی‘ ہم وطن‘ پتھروں کا شہر‘ گدھے‘ آنکھ کھول کر چلنا بابو اور خوشبو والی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر نظموں میں ہندوستان کا چلتا پھرتا معاشرہ جلوہ گر ہے۔اسی طرح آزاد نظموں کے 25 عنوانات قائم کرکے انہوں نے ہندوستانی طرز معاشرت ہی نہیں‘ بلکہ اپنی عقیدت کی نمائندگی بھی کی ہے‘ لیکن اس کے ساتھ ہی شاعرہ کی حیثیت سے جمالیاتی احساس کو بھی آزاد نظموں کا وسیلہ بنالیا ہے۔ان کی گیت نما نظم ''ساجن کو سندیش'' کی چند اشعار ملاحظہ ہو۔

چنچل بادل اڑتے اڑتے دور دریش جب جائے گا
ساجن میرا سندیسہ وہ تجھ تک بھی پہنچائے گا
روتے روتے رین کٹے ہے‘ چپ سے جینا مشکل ہے
اپنے کومل بول میں تجھ کو یہ سندیس سنائے گا
بھیتر تپتا باہر الجھا گھر بھی ڈسنے آئے ہے
تجھ بن ساس نندیا میرے من مندر کو ڈھائے ہے
دو پنچھی جب ساتھ اڑے ہیں یاد تری تڑپائے ہے
رین اندھیری تجھ بن ساجن گیت غموں کے گائے ہے
تو پردیس سدھارا‘ جب سے مجھ کو تنہا چھوڑ گیا
دولت کے اندھے لالچ میں‘ سارے بندھن توڑ گیا

نسائی جذبات اور فکری خصوصیات کے پس منظر میں ہندوستانی معاشرت کی نمائندگی صادقہ نواب سحر نے اس نظم میں حددرجہ چابکدستی کے ساتھ انجام دی ہے۔ساری نظم پر ہندی مزاج کا غلبہ ہے‘ لیکن ایک ہندوستانی عورت پر بیتنے والے ستم کی نمائندگی جس انداز سے کی گئی ہے۔ بلاشبہ اس سے ان کے درون بینی جذبہ سے تعبیر کیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ان کی ہر نظم میں کوئی نہ کوئی سماجی حقیقت اور معاشرتی الجھنوں کی خصوصیات جلوہ گر ہیں۔ایک مختصر مضمون میں ہر نظم کا تجزیہ ممکن نہیں اور ان کی پچیس آزاد نظموں میں ہر نظم اپنا جواب نہیں رکھتی۔اسی طرح طنز و مزاح کی چار نظموں کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے طنز ومزاح کے انداز کو اختیا کرنے میں فنی چابکدستی دکھائی ہے۔ چاروں نظمیں موضوعاتی اور طنز ومزاح کی چاشنی سے زیادہ فکر کی تازگی کو نمایاں کرتی ہیں‘ جس کے بعد نثری نظموں کے توسط سے صادقہ نواب سحر نے ہندوستانی مزاج کی نمائندگی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ان کی ہر نظم میں اگر چہ اختصار ہے‘ لیکن بعض نظمیں طوالت کا ثبوت بھی دیتی ہیں۔انہوں نے نظم کردار میں انتہائی سادگی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ شاعر اور ادیب بھی الفاظ کا ناٹک رچاتے ہیں۔جس سے ان کی سوچ کی تازگی کا اندازہ ہوتا ہے۔نظم ''جہاد اور جنگ'' میں انہوں نے واضح کردیا ہے کہ لاشوں پر حکومت کرنے کا فلسفہ درحقیقت ''جہاد اور جنگ'' میں سب کو جائز ہونے کا شاخسانہ ہے۔غرض ان کی نظموں میں نئی آہٹ اور عصری حسیت کی خصوصیت جلوہ گر ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی نثری نظم ''بھجن'' تحریر کی تو اس کے ابتدائی چار مصرعوں میں حقیقت واضح کردی کہ ٹرین کے آخری ڈبہ میں/ایک بالک گاتے گاتے/رک کر بولا/ بی بی جی بھوکا ہوں بھگوان کے نام پر ایک روپیہ مجھ کو یہ آواز بڑی بھائی۔ایک بھجن اور سنادے کے توسط سے واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح انسان دوسروں کی دردمندی کے بجائے اپنی خواہشات کی تکمیل میں زندگی گزار رہا ہے۔ بہر حال صادق نواب سحر نے اپنی شعری مجموعہ ''ست رنگی'' کے توسط سے نہ صرف شاعری کا حق ادا کیا ہے‘ بلکہ موقع بہ موقع شعری سطح سے بلند ہوکر انسانوں کو کسی نہ کسی پیام سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔چنانچہ ان کی شاعری کو صرف شاعری کہہ کر نظرانداز کردینا مناسب نہیں‘ بلکہ انہیں شعری دنیا کے ذریعہ پیام دینے والی ایسی خاتون کا مقام دیا جانا چاہئے جو اپنے کلام کے ذریعہ سماجی سائنسداں ہونے کا حق ادا کررہی ہیں اور اپنے کلام سے شعر وادب کی زلفیں سنوارنے کے ساتھ ساتھ انسانیت اور انسانیت دوستی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

محترمہ صادقہ نواب سحر،السلام علیکم۔
کچھ دن پہلے آپ کا دلچسپ ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ملا تھا،شکریہ۔میں نے اسے بہت دلچسپی سے پڑھا اور کئی جگہ متاثر ہوا۔
حسن اتفاق کہ ابھی چند دن پہلے قاسم امام کی کتاب ''جدید اردو نظم،ایک مطالعہ'' میں آپ کا ذکر جگہ جگہ دیکھا خوشی ہوئی۔
شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

متاشا اور ناول

پروفیسر علی احمد فاطمی
(الٰہ آباد، بھارت)

کہا جاتا ہے کہ عورت اور کہانی لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ادبی وتخلیقی سطح پر ناول نگار یا افسانہ نگار عورتوں کی تعداد کل بھی کم تھی اور آج بھی کم ہے۔ اردو میں بطور خاص جب کہ اردو اور عورت بھی لازم وملزوم رہے ہیں، لیکن ان کی شکلیں مختلف رہی ہیں۔ زمین کی طرح کہ جتنی وہ محبت کرتی ہے، دکھ اٹھاتی ہے، کم وبیش اتنی ہی عورت بھی۔

اس اعتراف واظہار کے ساتھ کہ ناول اپنے عہد کا رزمیہ ہوتا ہے اور معاشرہ کی معتبر وموثر تصویر، تعبیر اور تنقید بھی... بحرانی اور انتشاری دور میں اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بحران کے فوراً بعد اس کشاکش کے حوالہ سے ناول پہلے لکھے گئے باقی چیزیں بعد میں آئیں۔ ۱۹۴۷ء کے انتشار میں بھی ناول نویسی کی تعداد اچھی خاصی رہی۔ آج کے دور کو بھی انتشار اور بحران کا دور کہا جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ یہ بحران لمحاتی اور حادثاتی نہیں ہے لیکن صنعتی تو ہے اور صارفی بھی اور ناول صنعتی دور کی ہی پیداوار مانا گیا ہے۔ پھر بھی آج اردو میں ناول نویسی کی رفتار اور تعداد کم سی ہے اور خواتین ناول نگاروں کی تعداد اس سے بھی زیادہ کم، عمدہ ناولوں کی تعداد تو بیحد کم۔ اگر میری زبان غلط ہے تو فکشن کے معتبر وسینئر نقاد وارث علوی یہ کیوں کہتے ہیں:

''مجھے ان ناولوں کی تلاش ہے جن کی دنیاؤں میں کھو کر آدمی خود کو پاتا ہے۔''

آپ وارث علوی کے ان خیالات سے اتفاق یا اختلاف کر سکتے ہیں لیکن گزشتہ چند برسوں میں انگلیوں پر گنے جانے والی تعداد کی تردید کس طرح کریں گے اور اس کی فکر وفنکاری کے حوالہ سے جو گھیرے بلکہ نرغے جنم لیں گے، ان سے کیسے نکل پائیں گے۔ گزشتہ دنوں ٹائمز ٹریری سپلیمنٹ کے ایک شمارے میں ایک مضمون میں یہ بھی پڑھا:

''آج کے ناول مایوس کن زیادہ ہیں۔ کچھ ناول اسکول کے بچوں کے معیار کے ہیں۔ کچھ گھاڑوں کے ذریعہ لکھے گئے اور کچھ نیم پاگلوں کے ذریعہ۔''

اردو میں خواتین ناول نگاروں کی تعداد ہمیشہ سے کم رہی ہے، جب کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اس سے زیادہ تعداد موجود ہے۔ ذرا غور سے سوچیے تو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء جب کہ مسلم خواتین کا برسرعام ناول لکھنا، چھپنا مذہب وتہذیب ہر اعتبار سے غلط اور نامناسب ہوا کرتا تھا۔ اس وقت کچھ کھلے کچھ ڈھکے خواتین لکھنے والیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، راشدالخیری کی حمایت نسواں کی جادو طبقۂ نسواں پر چھایا ہوا تھا۔ خواتین کی حمایت اور خواتین کے کردار تو آج بھی مرد فکشن لکھنے والوں کے یہاں کم نہیں۔ متبدل دور میں کچھ زیادہ ہی متنوع، پھر بھی خواتین فکشن رائٹرز کم کیوں ہیں۔ تعداد تو مرد لکھنے والوں کی بھی بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن خواتین کی تعداد تشویشناک حد تک کم ہے۔ بس چند نام— ان چند ناموں میں ایک نام صادقہ نواب سحر کا ہے۔ جنہوں نے آج سے چند سال قبل ۲۰۰۸ء میں ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' جیسا ناول لکھ کر اپنی پہچان بنائی اور خوب بنائی اور اب تقریباً آٹھ سال کے بعد ان کا نیا ناول ''جس دن سے...!'' منظر عام پر آیا ہے۔ صادقہ کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں شاعرہ بھی ہیں، بچوں کے لیے نظمیں کہتی ہیں، ڈرامے لکھتی ہیں اور کئی زبانوں میں لکھتی ہیں اور شہرت حاصل کرتی ہیں، جب کہ عمدہ اور بڑے ناول کے لیے گوشہ نشینی اور یکسوئی کی سخت ضرورت ہوا کرتی ہے۔

ان کے پہلے ناول کا عنوان تو عجیب ہے، لیکن کہانی عام سی ہے۔ صوبہ اڑیسہ کی ایک عیسائی فیملی میں متاشا نام کی ایک بچی پروان چڑھتی ہے۔ پہلے خاندان کا پورا تعارف، افراد بڑے بوڑھے، پھر ماں باپ اور بالخصوص باپ جس کا تعارف اس انداز سے ہوتا ہے:

''روڑکیلا کے پاس پان پوس میں اب پاپا کی صرف دس ایکڑ زمین بچی تھی۔ سیکڑوں ایکڑ زمین کیس میں چلی گئی۔ پاپا بات بات میں لڑائی جھگڑا کرتے، کیس ہو جاتا۔ دماغ کی گرمی نے آخر یہ دن دکھائے کہ بیل پہاڑ میں ٹاٹا ایکسپورٹ اینٹ کی فیکٹری میں فورمین کی نوکری کرنی پڑی۔ جب کانٹریکٹ ہاتھ میں تھے تو دادی ہمیشہ سمجھاتی رہتی تھی۔ کم سے کم انگریزوں سے تو جھگڑا مت مول لے۔ پاپا تو بڑی گندی گالیاں دیتے تھے۔ ان سے وہ ہنسی مذاق میں بھی گالی گلوج کرتے تھے۔ وہی ممی سے بھی کرتے تھے، بے رحمی ہوتی... پٹائی ہوتی...''

صرف باپ کی سختی نہیں بلکہ رسمیات اور روایات کی سختی... دادی جوانی میں بیوہ ہوئیں تو سر کے بال کٹوانا ضروری، برادری کی بڑی بوڑھیوں نے ضد پکڑ لی کہ بال کٹوانا ہوگا۔ مذہب ایسا نہیں کہتا مگر سماج کی ریت رواج بھی تو کچھ ہوتے ہیں... ''بال کٹواؤ ورنہ نکل جاؤ...'' اور دادی نے بیوہ بے اولاد دلکشی کے یہاں پناہ لی... ایک طرف مرد کی مردانگی... دوسری طرف رسمیات کی مجبوری... دونوں کے پاٹ میں پستی عورت۔ پہلے دادی پھر متاشا کی ماں اور اب متاشا... جس کی پیدائش سے باپ خوش نہیں ہوئے۔ تین مہینے تک صورت نہیں دیکھی۔ ماں پر غصہ اتارتے رہے اور ننھی متاشا کے معصوم ذہن میں بار بار اس قسم کے خیالات سوالات بن کے رقص کرتے رہے:

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ پاپا کی نفرت کا سبب کیا تھا۔ یہ بات میرے لیے ہمیشہ پہیلی بنی رہی...''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں مجھے اتنا مارتی کیوں ہے؟''

انہیں سوالوں، الجھنوں اور ناہمواریوں کے ماحول میں وہ بڑی ہوتی

ہے۔ مار کے خوف سے جھوٹ بولنے کی عادت، ڈھیٹ بن جانے کی عادت اور پھر ہلکی سی بیزاری یا بغاوت...''مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ نن بن جاؤں، جگہ جگہ گھوموں، گھر کے بندھنوں سے آزاد زندگی گزاروں، ہاسٹل کے دن نسبتاً پرسکون لیکن چھٹیاں آتیں تو پھر جیسے 'پھٹکار گھر' جانا تھا۔

انہیں جوانی کے دنوں میں بزرگ کا کا کے ذریعہ عصمت دری کے واقعہ نے اس کی شخصیت کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ بے باک متاشا ڈر گئی کہ کوئی لڑکی خواہ کتنی بے باک اور جرأت مند ہو لیکن عزت و عصمت کے معاملہ میں حساس اور سنجیدہ ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ بدنامی کا خوف، خاندان کا خوف سب کو رہتا ہے۔ متاشا بھی ڈر گئی... کٹھ پتلی بن گئی۔ اپنے سے کچھ سوچ نہیں سکتی۔ کچھ کر نہیں سکتی۔ ایک پیچیدہ نفسیات اس شکل میں اُبھری۔ بچپن سے پاپا کے ممی پر کیے گئے برے سلوک سے مرد ذات سے مجھے نفرت ہو گئی تھی، کا کا کے ساتھ اس حادثہ نے میری مردوں کی اس جنگلی دنیا سے دلچسپی ختم کر دی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی جوان زندگی میں کئی لڑکے یا مرد آتے ہیں لیکن اس کی بے حسی، سرد مہری سے اوب کر اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور حالات اسے ممبئی پہنچا دیتے ہیں، جہاں ایک شادی شدہ مرد سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ متاشا کے حوالہ سے مختلف کردار، مقامات اور حالات سامنے آتے ہیں۔ حالات کے تحت سماج، معاشرہ اور اس کے پیچ و خم اور کیف و کم بھی آتے ہیں۔ نفسیاتی کشمکش بھی اور حالات کی کشاکش بھی... پھر بھی اس ناول میں جو ایک کردار کے اردگرد گھومتا ہے، واقعات کی رفتار میں اس طور یکسانیت ہے اور سرعت ہے کہ ناول واقعات کی کھتونی بن جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا سوانحی ناول ہے۔ ایک کردار کے بچپن، جوانی کے ماہ و سال اور متنوع جمال و جلال اور پھر سوال در سوال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ واقعات دلچسپ ہیں، متوجہ کرتے ہیں اور اکثر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، لیکن یہ بھی غور طلب ہے کہ محض اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے چلے جانا اور اردگرد کی زندگی، معاشرت، ثقافت سے بے خبر رہنا یا رکھنا، تاریخ تہذیب سے معمولی سا بھی رشتہ نہ ہونا، واقعہ نگاری تو ہو سکتا ہے ناول نگاری نہیں۔ سوانح اور ناول میں صرف حقائق کا بیان ہی حد فاصل قائم نہیں کرتا بلکہ انداز بیان بنیادی طور پر ایک دوسرے کو الگ کرتا ہے۔ افسانویت اور ناولیت کو پیدا کرنا بھی ایک ہنر ہے کہ آپ ایک عام سی کتاب نہیں لکھ رہے ہیں، بلکہ ناول لکھ رہے ہیں۔ جب بھی کوئی کردار .... مضامین میں سماجی اور معاشرتی زندگی کی سچائیوں کو پیش کرتا تو دراصل وہ خود زندگی کی بعض سچائیوں کو از سر نو تلاش کرتا ہے۔ یہ تلاش محض مقصد یا مرکز کی نہیں ہوتی بلکہ حیات و کائنات، زماں و مکاں کی بھی ہوتی ہے۔ اس جد و جہد میں کوئی اور سراپا فلسفہ ہاتھ آئے نہ آئے یہ سرا ہاتھ تو لگتا ہی ہے کہ مرکزی کردار ایک عام انسان ہے۔ زندگی کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں اس کی حقیقت ایک تنکے کی طرح ہے۔ کسی مغرب کے ناقد نے کہا ہے کہ ناول ایک ایسا فن ہے، جس میں انسان سماجی اور تاریخی اعتبار سے کھل کر سامنے آتا ہے اور اس کے سارے روپ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ انسانی زندگی میں حقیقت کے انیک روپ ہوا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ دیکھنے اور دکھانے کے انداز بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ ہندی کے ممتاز ادیب منیجر پانڈے نے اچھی بات کہی ہے:

''سماجیات میں انسان کی سماجی پہچان کے مختلف راستے ہیں۔ ان میں جو راستہ ادبی دنیا سے ہو کر گزرتا ہے، ان میں وہ سب سے اچھا اور بامقصد ہوتا ہے۔ جب ناول کی تخلیق سے ہو کر گزرتا ہے۔''

یہ سچ ہے کہ صادقہ کا یہ ناول گھر سے زیادہ تعلق رکھتا ہے، لیکن گھر بھی تو سماج کی ایک اہم اکائی ہوتا ہے۔ اس لیے گھر کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن گھر کے ساتھ جو گھر کے سنسکار ہوتے ہیں اور سنسکاروں کے ساتھ تہذیب و ثقافت ہوتی ہے، وہ ناول میں رنگ آمیزی کرتی ہے اور اس کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ اس لیے اس ناول میں اڑیا کلچر یا عیسائی کلچر کا عمل دخل بھی ہونا چاہیے، جو کم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ صادقہ کردار کی نفسیاتی کیفیت اور اس کی اندرونی فضا کو پیش کرنے میں زیادہ یقین رکھتی ہیں اور یہ اچھی بات بھی ہے، اس سے کردار نگاری مضبوط ہوتی ہے۔ اسی لیے شاید متاشا جیسا نسوانی کردار نئے اردو ناول میں نظر نہیں آتا، تاہم کردار پس منظر کے ساتھ نمودار ہوتا تو اس میں مزید پختگی اور بالیدگی آ جاتی ہے۔

عورت کی مظلومیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آج بھی لکھا جا رہا ہے اور لکھا جانا چاہیے کہ عورت بعض صورتوں میں آج بھی مظلوم و مجبور ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان عورتوں کو ان کے ناول کی عورتوں کی چیز بڑا بناتی ہیں۔ یہاں مقابلہ مقصود نہیں اور نہ ہی موضوع کا پرانا ہونا عیب ہے۔ تخلیق ادب میں بدلتی ہوئی صورت میں اس ذہن اور وژن کی تلاش ضروری ہے جو اکثر عورتوں کو محض عورت کے ہی مسائل کی حد تک محدود رہنے کی وجہ سے معدوم رہتے ہیں، پھر ان مسائل کا عرفان بھی ضروری ہے اور اس کا وسیع گیان بھی۔ اکثر خواتین لکھنے والیاں صرف خواتین کے مسائل تک یا ان کے اہم مسائل کو محدود نظروں سے ہی دیکھ پاتی ہیں۔ صادقہ کے ساتھ ایسا نہیں ہے، وہ دیگر زبان و ادب سے واقفیت رکھتی ہیں۔ پڑھتی لکھتی ہیں، عہد حاضر کا گیان رکھتی ہیں، لیکن اس گیان کو عرفان میں بدلنے کی ضرورت ہے اور ناول تو محض عرفان سے بھی نہیں لکھا جاتا، اس کے لیے ایک مخصوص غیر معمولی وجدان کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ تخلیق کے لیے علم کائنات سے زیادہ شعورِ کائنات کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور صادقہ میں یہ شعور بدرجۂ اتم موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تصور اور یاد عورت کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس سے وہ گھر، خاندان، آل اولاد کو پالتی اور سجاتی ہے، مستقبل کے خواب دیکھتی ہے یا پھر اپنی انتھک محنت اور قربانیوں کے ذریعہ اس خواب کو حقیقت میں بدلتی ہے۔ یہی غیر معمولی خوبیاں اسے آرٹ اور تحقیق کے میدان میں بھی لاتی

ہیں۔انہیں دوپنکھوں کے ذریعہ وہ دنیا کی سیر بھی کرتی ہے،لیکن اگراس خواب کی دنیا سے نکل کر باہر نہیں آتی تو پھر وہ شکی اور جھکی ہوجاتی ہے۔اسے ہر مرد پر شک ہوتا ہےاور ساری دنیا غلط اور کہیں کہیں ظالم نظر آنے لگتی ہے۔ایک بے نام خوف ابھرتا ہے اور پھر یہ خوف ایک مستقل قدر کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے اور وہ اپنے دائرے سے نکل نہیں پاتی۔ ہندی کے ممتاز افسانہ نگار نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ''عورت کی نجات پورے سماج کی نجات ہے، کیوں کہ نجات اکیلے نہیں ملتی۔'' نجات اکیلے نہیں ملتی اس خیال سے اتفاق کیا جاسکتا ہے،لیکن میں اس جملہ کو یوں بدل کر کہتا ہوں کہ پورے سماج کی نجات میں عورت کی نجات ہے۔صرف عورت کی نجات سے پورے سماج کی نجات ممکن نہیں اور نہ ہی عورت کی نجات...اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خواتین لکھنے والیوں کو چاہیے کہ وہ پورے سماج کی نجات کی فکر کریں۔ دائرۂ مظلومیت کو پھیلائیں اور صرف عورتوں پر کیے جانے والے ظلم کی ہی نہیں ہر طرح کے ظلم کی مخالفت کریں۔

مغرب سے آئی ہوئی تانیثی تحریک یا رجحان کے کچھ اچھے پہلو ضرور ہوسکتے ہیں لیکن ایک اثر یہ تو ہوا ہی کہ مرد اور عورت جو فطرت کے آئینہ میں ایک ایسی ملی جلی تصویر ہیں، جنہیں الگ کرکے دیکھ پانا مشکل ہے، لیکن وہاں سماج میں مرد الگ ہے اور عورت الگ۔نتیجتاً تیزی سے بڑھ رہا ہے تنہا اور ویران زندگی کا مزاج، جس نے گھریلو اور سماجی زندگی کا حسن چھین لیا ہے۔سماج ٹوٹ رہا ہے۔گھر بکھر رہے ہیں۔رشتے منقطع ہورہے ہیں۔ پوری کی پوری انسانی و اخلاقی تہذیب منتشر ہورہی ہے،جس سے اجتماعیت متاثر ہورہی ہے،ساتھ میں انسانیت بھی۔ ایسے بحران اور انتشار میں خود تانیثیت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ عورت کی کامیابی چومکھی ترقی، تعلیمی بیداری، کھلے اور روشن معاشرہ میں ہی ممکن ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ عورت کی آزادی اور خوشحالی کے بغیر سماج کی ترقی ممکن نہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ سماج کی مکمل ترقی اور روشنی کے بغیر عورت کی خوشی ممکن نہیں۔اس لیے یہ عمل متوازی طور پر ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ایک دوسرے کی معاونت کرنا چاہیے۔ مرد اور عورت کے رشتے محبت اور مضبوطی سے بھرے ہونے چاہئیں، تبھی انسان اور انسانی معاشرہ ایک مثالی شکل میں دکھائی دے گا۔ یہ باتیں، یہ آدرش اور یہ نظریہ آج کے اردو ناولوں میں کم دکھائی دیتا ہے کہ ناول نگاری کوری حقیقت نگاری نہیں ہوتی۔ ناول سماج کا آئینہ ضرور ہوتا ہے، لیکن ایک ایسا آئینہ جس میں صرف حقیقت نہیں ہوتی، بلکہ کچھ خواب ہوتے ہیں، کچھ آرزوئیں اور کچھ تخیل و تصوّر بھی۔

اچھی بات یہ ہے کہ صادقہ کے یہاں کچھ خواب ہیں...جو حقیقت سے رشتے استوار رکھتے ہیں۔ان دونوں کا سنگم ہی اس ناول کو لائقِ مطالعہ بناتا ہے۔صادقہ خواب دیکھنا بند مت کرنا، ایک خوش حال، روشن معاشرہ اور زندگی کا خواب...اس میں ہم سب کی نجات ہے...عورت کی بھی۔

''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' صادقہ نواب سحر کا انتہائی دلچسپ، معنی خیز اور معنی آفریں ناول ہے۔

ناول نگاری میں خواتین کا بڑا اور اہم حصہ رہا ہے، دوسرے اصناف ادب کے علاوہ اردو میں بھی خواتین نے اس صنف میں اپنی بساط بھر اور کبھی اپنی فردِ زندگی کے دائرہ سے باہر جھانکتے ہوئے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔صادقہ سحرؔ کے اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے، ابتدائی چند صفحات پڑھتے وقت میرے ذہن نے عجیب سی الجھن محسوس کی۔آخر یہ تحریر ادب کی کس صنف میں مخصوص جگہ کی حق دار ہے؟ الف لیلیٰ کی طرح قصے میں قصے، رشتے میں رشتے اور حادثات میں حادثے کا ایک سیل بے پناہ رواں دواں ہے۔ میں سوچتی رہی، کیا یہ سوانحی ناول ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر بے شمار کرداروں کی زندگی کے جزئیات کی اتنی معلومات کیسے ایک ہی ذہن اور ایک ہی قلم کی متحمل ہوسکے گی۔ میں نے اس بارے میں صادقہ سحر سے براہ راست ایک سوال کیا...کیا یہ سوانحی ناول ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو اس میں آپ کا کردار کون سا ہے...؟ انہوں نے یہ جواب دیا ''میری کسی سہیلی کی زندگی پر مبنی ہے یہ داستان...'' بہت مختصر مگر بہت جامع جواب تھا، اس لیے میں اپنا سا قلم لے کر بیٹھی رہی۔

ویسے بھی خواتین کو ہر شئے کی حقیقت جاننے کی ایک فطری خواہش ہوتی ہے، اس کی ایک نہایت اہم مثال متاشا کی زندگی اور 'فکر' سے دی جاسکتی ہے، وہ ایک عام ہستی ہونے کے باوجود صرف اپنے خاندان، ماحول اور معاشرے ہی کی نہیں بلکہ اپنے پردادا کے عہد سے آج کے دور تک کی ایک نہایت اہم کردار بن کے صرف اپنا سر اٹھا کے جینے کا درس دیتی ہے بلکہ سماج سے آنکھیں ملا کے شانہ بشانہ چلنے کی تلقین بھی کرتی ہے۔

سلمیٰ صدیقی (ممبئی)

اک آہوئے خوش چشمہ

نورالحسنین
(اورنگ آباد)

صادقہ نواب سحر نے افسانے کب سے لکھنا شروع کیا اس کا مجھے اندا.ہ نہیں ہے لیکن میں اُس وقت چونکا جب اُن کا پہلا ناول ''کوئی کہانی سناؤ متاشا'' میرے ہاتھوں میں آیا۔ یہ ناول مجھے اس لیے بھی پسند آیا کہ اس کی کہانی کسی دریا کی طرح بہتی ہے۔ ناول کے کردار صادقہ نے تخلیق نہیں کیے بلکہ یہ وہ کردار ہیں جو ہمارے اپنے آس پاس جیتے ہیں، سانسیں لیتے ہیں۔ ان کرداروں کی زندگی میں آنے والے واقعات بھی انہونے نہیں ہیں۔ اس طرح کے کردار اور واقعات حقیقی زندگی میں آئے دن نظر آتے رہتے ہیں۔

وقت کے ساتھ ہی ساتھ میں اُن کی افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، مضمون نگاری اور شاعری سے بھی واقف ہوتا گیا اور وہ نہ صرف اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوگئیں بلکہ نہایت تیزی سے فن اور شہرت کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئیں اور آج یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت ادیبہ ہیں، اور ادبی رسائل سے پوری طرح جُڑی ہوئی ہیں، کبھی افسانے کی صورت، کبھی شعری تخلیقات کے بہانے، کبھی اُن کی کسی کتاب پر تبصرہ، کبھی افسانے اور ناولوں پر لکھے گئے مضامین میں اُن کا تذکرہ دکھائی دیتا ہے اور اُن کا نام ذہنوں میں گونجتا رہتا ہے۔ یعنی اب وہ اُس منزل پر پہنچ چکی ہیں جہاں عصری ادبی تنقید اُن کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ کیا یہ مقام صادقہ نے ذود نویسی سے حاصل کیا؟ اس کے جواب میں یہ بات کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ادبی تنقید کا حوالہ بننا آسان نہیں بہت مشکل ہے۔ اس مقام پر وہی پہنچ سکتا ہے جو اپنی تخلیقات میں عام روش سے مختلف ہوتا ہے، یا جو اپنی تخلیقات کو فن پارہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو، خواہ موضوع کی سطح پر، یا تکنیک اور اسلوب کی بنیاد پر ایک نئی تازگی کا احساس دلاتا ہو۔ مجھے نہایت مسرت ہوتی ہے کہ صادقہ نواب سحر نے ادب کے اس صحرا میں قدم بھی رکھا اور اپنی آبیاری سے اس صحرا کو گُل بوٹوں سے سجانے کی کوشش بھی کی اور اُن تمام ہنر مندیوں سے خود کو آراستہ بھی کیا جو فکشن کے سفر کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

اُن پر لکھے گئے مضامین و تبصروں کو کتابی صورت میں تبدیل کرنے سے پہلے جب اُس کا مسودہ اُنھوں نے میرے حوالے کیا کہ میں اس کا پیش لفظ لکھوں، تو اُن کی تعداد کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اپنی مصروفیت اور اپنی اہلیت کے پیش نظر میں نے اُنھیں مشورہ دیا کہ وہ میرے بجائے کسی مستند ناقد یا ادیب سے لکھوالیں، بلکہ کئی نام بھی اُن کے سامنے رکھے، لیکن وہ راضی نہ ہوئیں اور مجھ ہیچمداں کے سر یہ ذمہ داری ڈال گئیں۔ اُن کے فن پر لکھنے والوں میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی، عابد سہیل، علی امام نقوی، بلقیس ظفر الحسن، پروفیسر قدوس جاوید، خورشید اکرم، ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک، محمود شاہد، ف۔ س۔ اعجاز، مصطفٰی کریم جیسے بے شمار نام ہیں جنھوں نے اُن کے فن کے مختلف جہتوں پر کھل کر لکھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس، اقبال مسعود، ذکیہ مشہدی، مشرف عالم ذوقی، وصیل خان جیسے ناقدین و ادیبوں نے اپنے تاثرات سے نوازا ہے۔ یہ ساری تحریریں وہ ثبوت ہیں جو اُن کی فنکاری کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ناول اور ناول نگار کے فن کا احاطہ کرتے ہوئے اُنھیں ایک ایسا مشورہ دیا ہے جو اُنھیں فن کی تابنا کی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اچھی بات یہ ہے کہ صادقہ کے یہاں کچھ خواب ہیں ۔۔ جو حقیقت سے رشتے استوار رکھتے ہیں ۔ ان دونوں کا سنگم ہی اس ناول کو لائق مطالعہ بناتا ہے ۔۔ صادقہ خواب دیکھنا بند مت کرنا۔ ایک خوشحال، روشن معاشرہ اور زندگی کا خواب ۔۔ اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔''

دیکھا جائے تو ایک ادیب کا سفر کھلی آنکھ سے عبارت ہے لیکن کھلی آنکھ سے دیکھے جانے والے مسائل اور دکھ کا مداوا کسی ادیب کے دسترس میں نہیں ہے۔ ان مسائل اور دکھ سے نکلنے کے لیے وہ خواب ضرور دکھاتا ہے، یہی خواب وہ تسلیاں ہیں جو زندہ رہنے کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر اُن کا پہلا ناول اس لیے بھی پسند ہے کہ اس میں عورتوں کے استحصال کی جو داستان بیان ہوئی ہے، اُس کے مجرم کون ہیں؟ یہ استحصال کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ صادقہ نے وہ بات بتائی ہے جس میں ہم سب کو اپنے ہی چہرے نظر آتے ہیں:

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ پاپا کی نفرت کا سبب کیا تھا؟ یہ بات میرے لیے ہمیشہ پہلی بنی رہی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں مجھے اتنا مارتی کیوں ہے؟''

دیکھا جائے تو یہ سوالات صرف ناول کے کردار کے نہیں ہیں۔ غور کیا جائے تو یہ فکر ہر اُس متنفس کی ہے جو عورت کے جون میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اس ناول کے حوالے سے صادقہ کا یہ سوال سارے معاشرے سے ہے۔

صادقہ نواب سحر کا دوسرا ناول ''جس دن سے ۔۔۔'' پھر ایک بار معاشرتی، سماجی زندگی کا احوال پیش کرتا ہے۔ اس ناول سے متعلق ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک لکھتی ہیں:

''ان کا دوسرا ناول بھی سماج ، ثقافت، معاشرت کے گونا گوں پہلوؤں سے روشناس کرواتا ہے۔ میں بلا جھجک کہہ سکتی ہوں کہ صادقہ نواب کی لگن و جستجو اور عمیق ادراک نے ناول کو پُر وقار، پُر اثر بنادیا ہے۔ ایک نچلے متوسط مراٹھی پریوار کے بکھرنے ، ٹوٹنے اور منتشر ہونے سے پریوار کے بچیوں کی نفسیاتی، ذہنی کیفیت کا مطالعہ بڑی عقابی نظروں سے کیا گیا ہے۔ نوجوان پود میں آج زندگی کو دیکھنے، سمجھنے کا نظریہ بالکل بدل گیا ہے۔ اس ناول میں موجودہ دور کی کئی سمسیاؤں کو سمجھنے سمجھانے کی اور اُن کا تدارک کرنے کی ایماندارانہ کاوش کی گئی ہے۔ اس میں دو پیڑھی کی کشمکش اور تناؤ بھی ہے اور عورت کی مجبوری و بیکسی کے ساتھ ہی اُس کی انا کی آواز کو صاف صاف سنا جاسکتا ہے۔ ایک طرف مرد کا ہرجائی پن اور دوسری طرف ڈکٹیٹروں والا رویہ۔۔۔''

صادقہ اپنے ناول اور افسانوں کے لیے کردار اپنے اطراف واکناف

ہی سے اُٹھاتی ہیں اور اُن کے اطراف وہ جو کہانی بنتی ہے وہ بھی حقیقی زندگی سے اتنی قریب ہوتی ہیں کہ فسان پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اُن کے تازہ ناول کے کرداروں سے متعلق بڑی عمدہ بات لکھی ہے:

''صادقہ نواب کے اس ناول میں جیتو (جنیش) اُس کے ماں باپ، مینکا، ملی، ساحل، سائرہ وغیرہ بہت سارے کردار ہیں جو ناول میں مربوط واقعات پیدا کر کے ناول کے پلاٹ اور کہانی کو مستحکم کرنے کے بجائے اپنے منطقی اور مدلل مکالموں کے ذریعے ناول میں ایک دانشورانہ فضا کی تشکیل کرتے ہیں جو عصری زندگی کی سچائیوں کے حوالے سے معاصر ناول کی شعریات کا نمایاں عنصر ہے۔''

ناول نگاری کے ساتھ ہی ساتھ صادقہ نواب سحر نے افسانہ نگاری میں قاری کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ اُن کے افسانوں کا محور وہ عصری انسان ہے جو ذہنی انتشار کا شکار ہے جس کا اثر اُس کی زندگی کی نفسیاتی اُلجھنوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مادّی اغراض اُس کی ازدواجی زندگی کو بھی بے سکون کر رہے ہیں۔ حالات کا جبر اُس کی انا کو ڈس رہا ہے۔ خاندانی رشتے بکھر رہے ہیں، اُن میں خلوص و محبت کا فقدان ہے، سماج میں عورتوں کا استحصال ایک عام سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ دن بدن خود غرضی و بے حسی بڑھ رہی ہے۔ اور ایک ایسا معاشرہ سامنے آ رہا ہے جس کے چہرے پر ایک دو مکھوٹے نہیں بلکہ بے شمار مکھوٹے ہیں جو حسب ضرورت اُنھیں بدلتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن اُن کی افسانہ گاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صادقہ نواب سحر کی ہر کہانی اپنا ایک الگ موضوع لیے ہوئے ہے اور ہر کہانی ایک الگ پس منظر لیے ہوئے ہے۔ وہ سماج کی خانہ دار اور پیشہ ورانہ خواتین اور مردوں کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات و کیفیات سے کہانی کے تانے بانے بنتی ہیں۔ کچن سے لیکر آفیس، سڑک سے لے کر شاہراہ، اور قریہ سے لے کر شہر، ڈرائینگ روم سے لے کر دفتر، بزنس سے لے کر ملازمت تک کی باتیں ان کے یہاں در آتی ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں Joint family کا تصور پایا جاتا ہے جس میں بھائی بہن، ماں باپ، خالہ خالو، چچا چاچی، ماموں مامی، گاؤں کی عمر رسیدہ خواتین یہاں تک کہ دور کے رشتے دار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اکثر افسانوں میں ''عورت'' مرکزی کردار ہوتی ہے اور ''مرد'' ضمنی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

خورشید اکرم کے مطابق صادقہ اپنی کہانی کے مطابق صرف کردار ہی نہیں بلکہ وقت اور مقام کو بھی پوری طرح نگاہ میں رکھتی ہے اور اسی مناسبت سے اپنے بیانیہ کو ڈھالتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اُنھوں نے ایک اور خاص بات کہی ہے:

''ان کا فکشن پڑھتے ہوئے مجھے جس بات پر تھوڑی حیرانی رہی ہے وہ یہ کہ اوّل تو اُنھوں نے بیشتر اُردو کی حد تک نامانوس ماحول اور معاشرے کو اپنا موضوع بنایا ہے اور پھر ان نامانوس کرداروں کو (جو عام انسان ہیں اور اپنی عامیانہ زندگی کی جنگ اپنی قوت بھر پوری سنجیدگی سے لڑ رہے ہیں، گزر رہے ہیں، اُٹھ رہے ہیں) اس طرح جیا ہے کہ اکثر محسوس ہوتا ہے کہ قاری اور کردار کے درمیان مصنف ہے ہی نہیں اور واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے فطری طور پر اسی طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ان کا وقوع پذیر ہونا ہونی انہونی کے فطری کھیل کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔''

خورشید اکرم نے اگر اُن کے کردار، مقام اور وقت کے ساتھ اُن کے عمل ردعمل کی بات کی ہے تو محمود شاہد نے ناول ''جس دن سے۔۔۔'' کے اسلوب اور زبان پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کے اس ناول میں زبان کے دو دھارے ہیں:

''جہاں تک اسلوب کی بات ہے نہایت رواں دواں اور بے تکلف طرزِ بیان ہے۔ زبان کی دو سطحیں نظر آتی ہیں۔ مکالموں کی زبان کو ممبئی میں استعمال کی جانے والی روزمرہ زبان کے قریب رکھا گیا ہے۔ جب کہ مکالموں سے ہٹ کر بیانیہ حصوں میں زبان کسی قدر صاف شستہ نظر آتی ہے۔ کردار ایک ہوں یا ہزاروں، صادقہ نواب سحر ان کی شکل وصورت، عادات واطوار، فکر و عمل، مزاج ونفسیات کو ایسے بیان کرتی ہیں جیسے یہ کردار ان کے اپنے خاندان کے ہوں، جن کو وہ قریب سے جانتی اور پہچانتی ہیں۔''

صادقہ کا کمال یہی ہے کہ اُن کے کرداروں کے مکالمے اُن کے ماؤتھ پیس سے نکلنے ہوئے نظریات کی تبلیغ نہیں ہے بلکہ اُن کے کرداروں کی وہ آزادانہ سوچ ہے جسے کہانی کے تقاضے چاہتے ہیں۔ قدوس جاوید جیسے ذہین نقاد بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صادقہ کے ناول ''جس دن سے۔۔۔'' میں کال سینٹر، کارپوریٹ ورلڈ، عدلیہ اور تعلیمی اداروں سے وابستہ نئی نسل کے مردوں اور عورتوں کے حوالے سے جو مکالمے ملتے ہیں وہ ترقی یافتہ شہروں کی طرزِ حیات، طرزِ گفتگو اور لفظیات ومحاورات کا آئینہ ہیں اور ناول میں اُن کا استعمال شعوری طور پر نہیں، بے محابہ فطری انداز میں ہوا ہے۔ قاری کو کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا جیسے ناول نگار نے اپنے ناول میں ان کرداروں کی سوچ اور فکر کی شعوری پیوند کاری کی ہے۔''

صادقہ شاعرہ بھی اور بقول سکندر علی وجد، ''شاعری کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ وہ انسان کو لفظوں کی کفایت سکھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صادقہ کا یہ ہنر ناول اور افسانوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کتاب میں اور بھی مضامین شامل ہیں جن کے لکھنے والے معروف بھی ہیں غیر معروف بھی، لیکن اُنھوں نے محنت اور لگن سے صادقہ کے فن کا جائزہ لینے کی اچھی کوشش کی ہے۔

میرے نزدیک یہ کتاب صادقہ کے فن کا صرف ایک پڑاؤ ہے، کیونکہ ابھی اُن کا ذہن تازہ ہے۔ ابھی اُن کے مشاہدے اور مطالعے کی منزل صرف دوپہر تک ہی پہنچی ہے۔ ابھی اُن کا اسپِ قلم تیز بہت تیز دوڑ رہا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں حال، ماضی اور مستقبل کے جانے کتنے مناظر پوشیدہ ہیں جو رفتہ رفتہ کاغذ کی سطح پر اُتریں گے۔ وہ جس رفتار سے ادب میں داخل ہوئی اُسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادب کے کئی آسمانوں کو سر کر کے ہی دم لیں گی۔

میں بحیثیت معاصر اُن کی اس ادبی کامیابیوں کو سہراتا ہوں، پسند کرتا ہوں، اور دعا گو ہوں کہ اسی طرح ادب کی سرزمین پر نئی صبح وشام پیدا کرتی رہیں''

بحیثیت افسانہ نگار

ڈاکٹر رضوانہ پروین
(پٹنہ)

بیسویں صدی بلا شبہ اُردو فکشن کا عہد زرّیں مانا جائے گا۔اکیسویں صدی کے اس صنعتی عہد کی برق رفتار زندگی میں انسان کے پاس جہاں ایک طرف وقت کی قلّت ہے تو وہیں مشغولیات کے ذرائع میں تبدیلی آئی ہے اور اضافہ بھی ہوا ہے۔آج انسانوں کا ناطہ کتابوں سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔اس کی جگہ Internet نے لے لی ہے، کیونکہ ہر قسم کے معلومات کی فراہمی کتابوں سے بیش تر Internet کے ذریعہ ہو جاتی ہے۔باوجود ان جدید ذرائع کے کتابوں کی اہمیت مسلّم ہے۔اس بدلتے عہد میں بھی کتابیں اپنا وجود منواتی رہی ہیں اور سنجیدہ قارئین کتابوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔بہر کیف انسانی مسائل جو کل تھے وہ آج بھی ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گے۔البتہ اس کی نوعیت اور وجوہات میں تبدیلی ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔قدیم زمانے میں جب انسان کے پاس فرست کے اوقات زیادہ اور مشاغل کے ذرائع کم ہوا کرتے تھے تو وہ قصّے کہانیوں اور داستانوں کے ذریعہ اپنے خیالوں کے انجمن سجاتا تھا اور محظوظ ہوتا تھا۔آج زمانہ بدلا، حالات بدلے، ذرائع ابلاغ میں تبدیلی آئی ہے، لیکن انسانی نفسیات وہی ہے۔انسان قصّے کہانیوں کے ذریعہ اپنے نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کل بھی کرتا تھا اور آج بھی کر رہا ہے۔بس صورت اور ذرائع میں تبدیلی آئی ہے۔زمانہ قدیم میں زبانی کہانیوں اور داستانوں کے مطالعہ سے اس شوق کی تکمیل ہوا کرتی تھی اور آج فلمیں، ٹی وی سیریل نے اس کی جگہ لے لی ہے۔بہر حال آج بھی قصّے کہانیاں پہلے لکھے جاتے ہیں تبھی ان پر سیریل اور فلمیں بنتی ہیں۔یہ کام سنجیدگی سے کل بھی قلم کار ہی کر رہے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں، بلکہ آج قلم کاروں پر سماج کے تئیں ذمہ داری زیادہ آن پڑی ہے۔دورِ جدید میں جس طرح سے نئے نئے مسائل سامنے آ رہے ہیں ان کو بروئے کار لانا قلم کاروں کے لئے اہم challenge ہے۔موضوعات میں روز افزوں جدّت اور بیان میں ندرت پر focus لازمی ہے۔اب انسانی ذہن سماج کی حقیقت کو دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہے اور حقیقت سے روبرو کرانے کا کام ہمارے قلم کار بخوبی انجام دے رہے ہیں۔آج کے قلم کار طرح طرح کی تکنیک کے ساتھ ساتھ مختلف النوع موضوعات و مسائل کو پیش کر رہے ہیں۔ایسے ہی جدید سوچ و فکر کے قلم کاروں میں ایک اہم نام صادقہ نواب سحؔر کا ہے۔

صادقہ نواب سحؔر نے ادبی سفر کی شروعات شاعری سے کی۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' (۱۹۹۶ء) اور ''پھول سے پیارے جگنو'' (بچّوں کی نظموں کا مجموعہ، ۲۰۰۳ء) منظر عام پر آیا۔اس کے بعد موصوفہ کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا اور بہت مقبول ہوا۔

دراصل یہ ناول صادقہ نواب سحؔر کی ادبی زندگی میں آیا ایک اہم پڑاؤ ثابت ہوا جس نے ان کا نام ادب میں متعیّن کر دیا۔اس ناول کے بعد ان کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ ''مکھوٹوں کے درمیاں'' شائع ہوا۔یہ کتاب ان کے ادبی سفر میں آئے پڑاؤ کے بعد آگے کا ایک قدم ثابت ہوا۔اس کے بعد صادقہ نواب سحؔر کے افسانوں کا مجموعہ ''خلش بے نام سی'' ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا اور بہت مقبول ہوا۔دراصل یہ افسانوی مجموعہ صادقہ نواب سحؔر کے ادبی سفر کا ایک اہم موڑ ہے۔

صادقہ نواب سحؔر کا افسانوی مجموعہ ''خلش بے نام سی'' سولہ افسانوں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے میں شامل تمام افسانے اپنے اندر ایک الگ کشش رکھتے ہیں۔کسی میں موضوع کی ندرت ہے تو کوئی تکنیکی اعتبار سے بہت عمدہ ہے، تو کسی کی کہانی قاری کو چونکا دیتا ہے۔بہر حال اس مجموعے میں شامل پہلا افسانہ ''شریاں والی'' ہے۔اس کہانی میں افسانہ نگار نے صوبہ آندھر پردیش کے کئی علاقوں کا ذکر کیا ہے۔یہ افسانہ سہی معنوں میں اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔اس افسانے کا موضوع اچھوتا نہیں ہے لیکن انداز بیان بالکل نیا ہے۔اس افسانے کی ہیروئن نصیبن ہے۔اس کی شادی محض نو برس کی عمر میں ابڑی بہن کے انتقال کے بعد اس کے چالیس سالہ شوہر کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔بظاہر تو نصیبن اس شادی سے آسودہ ہے کیونکہ اسے خوب سارا دولت ہاتھ آتا ہے۔لیکن یہ خوشی زیادہ دنوں تک اس کی مقدّر میں نہیں کیونکہ جلد ہی اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔شوہر کے انتقال کے بعد نصیبن اپنی زندگی میں خوشی اور مرد کا ساتھ پانے کے لئے یکے بعد دیگرے دو دو شادیاں کرتی ہے لیکن اسے پریوار کی خوشی نصیب نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے مکمل سکون و طمانیت حاصل ہو پاتی ہے۔بالآخر وہ بے یار و مددگار تمام دولت ختم ہو جانے کے بعد بھیک مانگ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔اس افسانے میں بہت وسعت ہے۔لیکن اہم مدعا جو میری فہم میں آیا وہ بے جوڑ شادی کا ہے۔جس کی وجہ سے اسے شوہر کا مکمل ساتھ میسّر نہیں آتا اور وہ سکون و طمانیت کی تلاش میں بھٹکتی ہے۔اس افسانے میں آندھر پردیش کے مختلف علاقوں کی طرز معاشرت اور بولی ٹھولی کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس ضمن میں افسانہ ''شریاں والی'' سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے اماں، بھایاں، بہناں اور انُوں کیسے ہیں؟ رقیہ نے ہر ایک کے بارے میں پوچھا۔

''سوب کے گھر بنستے بستے ہیں مگرانے، تیرا آدمی اب تک چھٹرا گھومتا ہے۔تمہاری یاد میں جیتا ہے۔بس گھر سے مسجد، مسجد سے گھر۔''

(خلش بے نام سی، ص:۱۶)

افسانہ ''شریاں والی'' انسانی رشتوں کی جہتوں پر مبنی ایک خوبصورت افسانہ ہے۔صادقہ نواب سحؔر اپنے افسانوں میں دکھ کے مارے انسانوں کو موضوع

بنا کر سماجی برائی کو اجاگر کرتی ہیں۔افسانہ ''منّت'' کا موضوع اپنے آپ میں اچھوتا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار ممتا ایک ایسی لڑکی ہے جس کی شکل و صورت میں کوئی کمی نہیں لیکن کسی بیماری کے سبب اس کی شادی نہیں ہو پاتی اور وہ پوری زندگی گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔دراصل اس افسانے کے ذریعہ مصنفہ نے ہمارے معاشرے میں پنہاں توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی پر چوٹ کیا ہے جس کے تحت لوگ علاج نہ کرا کر دیوی دیوتاؤں سے منتیں مانگنے اور چڑھاوے چڑھانے کو ترجیح دیتے ہیں، جس کے سبب ایک انسان کی زندگی صحیح علاج نہ ہونے کے سبب تباہ ہو جاتی ہے۔

''خلش بے نام سی''، ''ادھڑا ہوا فراک'' اور ''سلگتی راکھ'' پہلی نظر میں تو رومانی افسانے معلوم ہوتے ہیں۔لیکن افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ اس نے ان افسانوں میں بڑے سبق آموز اور گہری باتیں بڑی سادگی سے کہہ ڈالی ہیں۔افسانہ ''سلگتی راکھ'' کا موضوع محبت میں ناکامی اور اس کے انجام پر مبنی ہے۔یہ ایک مؤثر افسانہ ہے۔یہ سماج کی اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے جہاں محبت کرنا اور پانا تو سبھی چاہتے ہیں لیکن اس کے انجام سے ڈر کر غلط فیصلے لے لیتے ہیں۔لوگ دوسروں کی محبت کو غلط نظریے سے دیکھتے ہیں جس کے تحت ایک سچّی محبت گناہ قرار دے دی جاتی ہے۔

''خلش بے نام سی'' اور ''خدا کی دنیا بہت وسیع ہے'' ان دونوں افسانوں کا موضوع ایک ہے۔لیکن افسانہ نگار نے ایک جیسے موضوع کو بڑے منفرد انداز میں پیش کیا ہے جس سے دونوں افسانوں میں انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔یہ دونوں افسانے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ان دونوں افسانوں میں ایسے نسوانی کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جو اپنے بھائی اور بیٹے سے تو محبت کرتے ہیں لیکن بھائی اور بیٹا کسی سے خصوصاً اپنی بیوی سے محبت کرے تو انھیں ناگوار گزرتی ہے کیونکہ وہ بھائی اور بیٹے کی محبت کو بانٹنا نہیں چاہتیں اور اس کے لئے مختلف قسم کے ہتھکنڈے اپناتی ہیں اور بالآخر بھائی کی زندگی کی خوشیوں میں آگ لگا دیتی ہیں۔صرف اس لئے کہ ان کا بھائی اور بیٹا اپنی بیوی سے محبت نہ کرنے لگے۔ دراصل یہ ایک بہت عام مسئلہ ہے لیکن قابلِ توجہ بھی۔یہ ہر گھر کی کہانی ہے جس سے ہر شادی شدہ عورت متاثر ہوتی ہے، لیکن جوں ہی خود کے بیٹے اور بھائی کا معاملہ آتا ہے تو وہی عورت ایک جابر حاکم کا روپ لے لیتی ہے۔یہ دونوں افسانے عورتوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ گھر خاندان اور معاشرے میں سکون پیدا ہو اور کوئی بہو خود کو سسرال میں غیر یا بے سہارا نہ محسوس کرے۔صادقہ نواب سحر کے افسانوں میں زندگی کے تئیں مثبت نظر پایا جاتا ہے۔مثلاً ''خدا کی دنیا بہت وسیع ہے'' کا کردار سمن مہتاب جس کو اپنے والدین کے یہاں ہر عیش و آرام مہیا ہونے کے باوجود اس کی زندگی میں سکون میسّر نہیں لیکن وہ زندگی سے ہار نہیں مانتی اور اپنی انا کو آواز دیتی ہے۔اس کی قوت ارادی اور عزم ملاحظہ ہو:

''آج میری انا جو زندگی کے بے رحم ہاتھوں سے کوڑے کھا کھا کر بے ہوش ہو چکی تھی، اپنے حواس دوبارہ پا چکی ہے۔آج مجھے یہ گھر جہنم نظر آ رہا ہے۔

ہر پھول کو باغباں میسّر نہیں آتا۔

مگر زندگی بہت خوبصورت ہے، اسے بے رحم مالی کے سفاک ہاتھوں کے سپرد نہ کرنا چاہئے ورنہ یہ جل کر بھسم ہو جائے گی۔

میں وہ سمن ہوں جسے کوئی مالی راس نہ آ سکا۔

تب کیوں نہ میں ایک خودرو پودے میں تبدیل ہو جاؤں! کیوں نہ اپنی جڑوں کو اتنی دور دور تک زمین کی گہرائیوں میں پھیلا دوں کہ مجھے پانی کے ایک ایک بوند کے لئے آسمان کا محتاج نہ ہونا پڑے!''

(خلش بے نام سی، ص:۱۰۴)

درج بالا اقتباس دراصل چوٹ کھائی ہوئی ایک عورت کے دل کی آواز ہے جو اب پر عزم ہو چکی ہے۔اپنی خودداری کو بیدار کر چکی ہے۔یہ ایک معاشرتی افسانہ ہے۔جو عورتوں کو عورتوں پر ظلم نہ کرنے اور اپنے حقوق کے تئیں بیداری اور قوت ارادی کا سبق دیتا ہے، تا کہ وہ سماج میں عزّت کے ساتھ جی سکیں اور اپنے حقوق حاصل کر سکیں، ساتھ ہی مردوں کو بھی گھر کے معاملات میں اپنی آنکھیں اور کان کھلی رکھیں تا کہ ان سے بھی عورتوں کی حقوق تلفی نہ ہو۔مجموعی طور پر یہ ایک بہت ہی خوبصورت اور کامیاب افسانہ ہے۔

افسانہ ''میٹر گرتا ہے'' اور '' پہلی بیوی'' جیسے افسانے مکمل طور پر مزدور طبقے کی پریشانیوں کو پیش کرتے ہیں۔تو وہیں ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' اور ''ٹی شرٹ'' نئی نسل کی بیدار مغزی پر مبنی ہے۔افسانہ ''ایس ایم ایس'' نئی تکنیک کے استعمال خصوصاً تکنیک کا غلط استعمال کر دوسروں کے جذبات سے کھیلنے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کے غیر مہذّب عمل کو پیش کرتا ہے۔افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' میں افسانہ نگار نے ذرائع ابلاغ کے نت نئے ذرائع سے واقفیت کے تحت نوجوان نسل کی ذہنی بیداری کو بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔اس افسانے سے ایک تراشا پیش ہے:

'' اخبار، رسالے، ٹی وی، کمپیوٹر، اسکول کالج سب بکواس کرتے ہیں گھر کی چہار دیواری میں پہنچ کر ہم صرف عورت ہیں نا ......اور کچھ نہیں نا....محکوم، مظلوم.....!

''اور آزادی کا لیبل پیشانی پر لگا کر پنجرے میں رہنا کتنا مشکل ہے نا باجی!!''

(خلش بے نام سی، ص:۹۲)

درج بالا اقتباس اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جدید تکنیک سے واقفیت کے تحت نوجوان نسل میں ذہنی بیداری آئی ہے اور اب وہ اپنے حقوق کو جاننے لگے ہیں لیکن عملی اقدام سے دو چار قدم پیچھے ہیں وہ ابھی پنجرے میں پھڑ پھڑا کر اپنے پر گننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مجموعہ ''خلش بے نام سی'' میں شامل دیگر افسانوں میں موضوعاتی اعتبار سے ندرت ہے۔افسانہ ''چاہے ان چاہے'' حالات کے تحت پیدا ہونے

والی نفسیاتی ضروریات اور لغزشوں پر مبنی ہے۔تو افسانہ ''شرارہ'' اور ''نوٹس'' ہلکی پھلکی نفسیاتی کہانیاں ہیں۔افسانہ ''ابارشن'' عہد صارفیت کا آئینہ دار ہے۔ جہاں انسانی احساس وجذبات پر پیسے کمانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

صادقہ نواب سحر کے افسانے تواتر کے ساتھ ملک کے موقر رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں۔یوں تو موصوفہ کا ایک افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا ہے ،جس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔لیکن اس کے علاوہ ان کے متعدد افسانے ہیں جنھیں شامل کر ایک مجموعہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔بہر حال چند خوبصورت افسانے جو مختلف رسائل کے ذریعہ میرے مطالعہ میں آئے جن کا ذکر نا گزیر معلوم ہوتا ہے ۔ان میں درج ذیل افسانے قابلِ ذکر ہیں:

''دیوار گیر پینٹنگ'' ایوان اردو، دہلی ،شمارہ مئی ۲۰۱۴ء، ''وہیل چیئر پر بیٹھا شخص'' ماہ نامہ آجکل، مئی ۲۰۱۴ء، ''سہمے کیوں ہو انکش'' رسالہ آجکل، جون ۲۰۱۶ء، ''اُلوّ کا پٹھّا'' رسالہ استفسار، ''پہاڑوں کے بادل'' ماہ نامہ شاعر اپریل ۲۰۱۶ء، ''اکنا مکس'' اور ''راکھ سے بنی انگلیاں'' وغیرہ اہم ہیں۔یہ تمام افسانے کم وبیش عورت کی مجبوری اور اس کے سماجی سروکار سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں افسانہ ''راکھ سے بنی انگلیاں'' کے تعلق سے چند باتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں۔اس افسانے میں متوسط طبقے کی پڑھی لکھی خاتون کے جذبات اور اس کے اصولوں کو بیان کیا گیا ہے، کہ وہ کس طرح ذہنی طور پر بیدار ہونے کے باوجود معاشرتی اور سماجی بندشوں میں الجھی ہوئی روایت کی پاسداری کرنے پر مجبور ہے۔اس افسانے میں مصنفّہ نے تبسم زیدی (معروف افسانہ نگار) کے کردار کو پیش کر یہ مثال پیش کی ہے کہ کس طرح ہمارے معاشرے میں عورتیں سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود مردوں کے استحصال کو صرف اس لئے برداشت کرتی ہیں کیوں کہ یہ ہماری پرورش کی دین ہے اور ہم اس سے آزاد نہیں ہو سکتے۔بہر حال یہ ایک طنزیہ افسانہ ہے۔جو قارئین کو اس موضوع پر سوچ وفکر کی دعوت دیتا ہے کہ اپنے حقوق اور اصول کی قدر کیسے کریں تا کہ دوسرے ہمیں مشورہ نہ دیں۔

صادقہ نواب سحؔر کے تمام افسانوں کے مطالعہ کے بعد جن نکات پر روشنی پڑتی ہے، ان میں موصوفہ کے پیش کردہ مختلف النوع موضوعات جن سے نہ صرف وہ واقف ہیں بلکہ وہ اپنے مشاہدات کو بخوبی فن کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ان کے افسانے سماجی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی،فکری اور تاریخی پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کے زیادہ تر افسانے عصری حالات اور مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔''منتّ''، ''ابارشن'' اور ''سلگتی راکھ'' جیسے افسانے سوچ وفکر میں تبدیلی کی دعوت دیتے ہیں۔ان کے افسانے قاری کو متحّر نہیں کرتے بلکہ دعوتِ فکر دیتے ہیں۔صادقہنواب سحؔر کے یہاں اظہار کی زبردست شدّت ہے۔وہ کہانی کہنے کا فن بخوبی جانتی ہیں۔موصوفہ کثیر اللسان ہیں۔انہوں نے افسانوں میں زمان ومکان کا خیال رکھا ہے۔کردار سے مکالمے ان کی اپنی مادری اور فطری زبان میں ادا کراتی ہیں۔ان کے افسانے زیادہ تر مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کے پس منظر میں لکھے ہوتے ہیں، باوجود اس کے ان کے پیش کردہ موضوعات آفاقی ہوتے ہیں۔بہر حال تجربات ومشاہدات کی بھٹی میں تپ کر صادقہ کے افسانوں کا خمیر تیار ہوا ہے۔صادقہ نواب سحؔر کے قلم میں نشتر کی سی تیزی کے ساتھ اسلوب کی بے ساختگی اور مشاہدے کی گہرائی شامل ہے، جو ان کی تخلیقات کو فنّی پختگی عطا کرتا ہے۔

میں فکشن کا ماہر تو نہیں ہوں لیکن چار ناولوں اور اسّی کی تعداد میں افسانے لکھنے کے بعد کلیّتاً نظمیہ شاعری کی طرف راغب ہوا ہوں۔اس لئے کچھ کہہ ضرور سکتا ہوں۔

آپ خوب لکھتی ہیں۔کردار اور واقعات کے تانے بانے کو بہم دگر پیوست کرنا ہر افسانہ نگار کامیابی سے نہیں کر سکتا۔اس فن میں آپ ماہر ہیں۔حقیقت نگاری کیمرے کا فن نہیں ہے، برش اور رنگوں کا ہے۔جس کا نعم البدل افسانہ نگار کے پاس الفاظ ہیں۔آپ انہیں بخوبی برتتی ہیں۔

سماجی ناہمواریوں پر بھی ہر فنکار کی نظر نہیں جاتی۔کچھ تو رومان کی پہلی کچّی عمر سے بھی آگے نہیں بڑھ پاتے۔لیکن آپ اُن ناانصافیوں کو ایک گہری نظر سے دیکھ کر ان کا احاطہ کرتی ہیں۔اللہ آپ کے قلم کو اور زیادہ طاقت بخشے کہ ابھی آپ کو بہت کچھ اور لکھنا ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

(وی اے یو ایس اے)

افسانوی سحر کاری

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی
(پٹنہ)

ہمعصر اردو ادب میں صادقہ نواب سحر ایک مانوس قلمکار کا نام ہے جنھوں نے بیک وقت اظہار کی کئی شمعیں روشن کر رکھی ہیں۔شاعری،ڈرامہ ،ناول اور افسانہ کو یکساں طور پر ایک معیار کے ساتھ برتنا آسان نہیں۔لیکن صادقہ نواب سحر نے نہ صرف اظہار کی ان تمام شمعوں سے جہان ادب کو روشن کیا ہے بلکہ اپنی مختلف الجہات شخصیت اور تخلیقی ہنر مندی سے اردو دنیا کو اپنا معترف بھی بنایا ہے۔انگاروں کے پھول ،''پھول سے پیارے جگنو'' کی شاعری یا'' کھوٹوں کے درمیان'' کے ڈراموں کا آپ اعتراف کریں یا نہ کریں''کہانی کوئی سناؤ متاشا''،''منت''اور''خلش بے نام سی'' کی کہانیوں سے آپ ہرگز صرف نظر نہیں کر سکتے ،جن کے حوالے سے صادقہ نے فکشن کی ایک نئی کائنات تخلیق کی ہے،ایسی کائنات جس کی ہر دیوار پر ان کی شناخت قائم ہے۔

''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کو ہی لیجیے،جس نے صادقہ نواب سحر کو بر صغیر ہندو پاک میں بے انتہا شہرت و مقبولیت عطا کی۔تانیثیت کے موضوع پر جب بھی اردو ناول کی بات ہوگی وہ اس ناول کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی کیونکہ یہ صرف ایک عورت متاشا کی کہانی نہیں ،ترقی یافتہ اکیسویں صدی میں بھی ظلم اور استحصال کی شکار ان تمام عورتوں کی کہانی ہے،جنھوں نے مرداساس معاشرہ میں صنفی عدم مساوات،ظلم وتشدد اور جنسی استحصال کو اپنا مقدر سمجھ لیا ہے۔فنی طور پر بھی یہ ناول اپنے بیانیہ کی وجہ سے منفرد ہے کہ واحد متکلم کی تکنیک میں پوری کہانی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کی گئی ہے۔چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے بُنا گیا پلاٹ،کرداروں کی خوبصورت عکاسی،متوسط طبقے کی معاشرت کے ساتھ مختلف علاقوں کی زبان،محاوروں اور تہذیبی عناصر کو جس تفصیل اور حقیقت کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے وہ ناول نگار کی فنی مہارت اور دسترس کا ثبوت تو ہے ہی ناول کی مطالعیت (Readablity) کو بھی مہمیز کرتا ہے۔

ناول کی بے انتہا کامیابی کے بعد عام طور پر ناول نگار افسانے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور دھڑا دھڑ ناولوں کی قطار لگا دیتے ہیں مگر صادقہ بہت تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔نہ صرف یہ کہ انہوں نے ناول کی کامیابی سے بہت زیادہ خود کو غلط فہمی کا شکار ہونے سے بچایا بلکہ اپنی دوسری تمام پسندیدہ اصناف ادب سے حسب سابق رشتہ استوار رکھا۔چنانچہ شاعری،افسانہ،ترجمہ نگاری اور تنقید سے ان کا رشتہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کے بعد دو افسانوی مجموعے ''منت'' اور ''خلش بے نام سی'' کی اشاعت سے آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

صادقہ نواب سحر کے افسانوں کا موضوعاتی تعلق عورتوں کی زندگی، رشتوں کی پامالی،قدروں کی شکست وریخت اور بہت تیزی سے غائب ہوتی ہوئی محبت سے ہے،جس پر ہماری خوبصورت زندگی کا دارومدار تھا۔وہ نت نئے انداز اور نت نئے واقعات اور صورت حال کی مدد سے ان مسائل کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔فکشن کی شعریات میں اس کے فنی لوازم،زبان وبیان،تکنیک اور کردار نگاری کے مباحث کو نئے سیاق وسباق میں استعمال کی طرف جو توجہ دی جا رہی ہے،صادقہ نواب سحر ان مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔وہ اپنے افسانوں کو تہ دار اور کرداروں کو ہمہ جہت بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اپنے اسلوب کا انتخاب کرتی ہیں اور کرداروں کی نفسیات میں بھی گہرائی تک اتر کر ہمیں نئے حقائق سے آشنا کراتی ہیں۔شریاں والی،منت،میٹر گرتا ہے،ٹی شرٹ،خلش بے نام سی،سلگتی راکھ اور ابارشن جیسی کہانیوں کو پڑھ کر آپ بہ آسانی یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ صادقہ سحر کو موضوعاتی اور احساسات پر مبنی افسانے لکھنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔اُن کے افسانوں میں تجربے،مشاہدے،حادثات اور واقعات کا بیان پورے کہانی پن کے ساتھ قائم رہتا ہے اور کہانی اپنے کرداروں کی زندگی کے اطراف گھومتی رہتی ہے۔ان کے کردار تخیل کی بھول بھلیوں سے جلوہ گر نہیں ہوتے بلکہ ہمارے آس پاس ہی زندگی کے دکھ بھوگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ماحول اور مناظر مہاراشٹر بالخصوص ممبئی اور کھپولی کے آس پاس کے ہوتے ہیں مگر ان میں زندگی اور اس سے وابستہ احساسات ایسے ہیں جنھیں کسی جگہ اور مقام میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ان کا تعلق انسان اور انسانیت سے ہے۔انسان جو افسانہ نگار کی نگاہ میں روز بروز ارزاں اور ارزل ہوتا جا رہا ہے اور انسانوں کا معاشرہ جہاں قدروں کی شکست وریخت ،رشتوں کا بکھراؤ،جنریشن گیپ کے نام پر بزرگوں اور ان کی اولاد کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ،خودغرضی اور کاروباری ذہنیت کا فروغ،نیز سماجی سطح پر لڑکیوں کی ناقدری اور ان کے جذبات کے تئیں عزیزوں کی بے حسی جیسے مسائل افسانہ نگار کو بار بار اظہار کے لیے اُکساتے ہیں۔صادقہ نواب سحر نے ایسے مسائل اور واقعات کا نہ صرف گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے بلکہ خود ان کی تہہ میں اتر کر اس کی تہ داریوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔

مثال کے طور پر''خلش بے نام سی'' مجموعہ کو سامنے رکھئے جس میں صادقہ کے کل ۱۶ افسانے ہیں۔صادقہ نواب کے نظریات کی وسعت،مشاہدہ کی گہرائی،تجربوں کی ہم آہنگی،اسلوب کا انفراد اور کہانیوں کی رنگارنگی دیکھنی ہو تو اِن افسانوں سے ایک بار ضرور گزریے۔''شریاں والی'' رشتوں کی بے وقعتی،قدروں کا زوال اور نسوانی جذبات کی عکاسی کرتا ہے تو ''میٹر گرتا ہے'' متوسط طبقہ کی ضرورت اور اس کی معاشی صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''چاہے ان چاہے'' شکست اعتماد کے ساتھ زندگی کی نیرنگیوں اور تہ داریوں کا اشاریہ ہے تو ''نوٹس''،''ابارشن'' اور ''باڈی

'جیسے افسانے عہد حاضر کی بے چہرگی، سکون کی تلاش اور معاشرتی زوال کا علامیہ ہیں۔''ٹی شرٹ''،جنریشن گیپ اور بزرگوں و نوجوانوں کے مابین فاصلے کی عکاسی کرتا ہے تو ''ہزاروں خواہشیں ایسی''، ''سلگتی راکھ'' اور ''منت'' کی روح میں عورتوں کے ابدی کرب اور بے چارگی کا بھرپور بیان ملتا ہے۔آج کل محبت پر کہانیاں کم لکھی جارہی ہیں۔محبت تو ہمارے فکشن کا بہت پرانا اور روایتی موضوع ہے مگر تجریدیت کے رجحان نے محبت کی معصومیت اور اس کی کیفیت کو دبیز تہوں میں گم کردیا تھا۔صادقہ نے اپنے افسانوں ''خلش بے نام سی''، ''شرارہ'' اور ''ادھڑی ہوئی فراک'' میں اِسی پرانے اور روایتی موضوع کو اس خوب صورتی، ندرت اور تازگی کے ساتھ برتا ہے کہ محبت جیسے جذبے کی بازیافت محسوس ہوتی ہے۔

صادقہ نواب سحر کے افسانوں کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہے اور تنوع کی وجہ سے ہی بعض سیدھے سادے ہیں، بعض داستانوں کے رنگ کے حامل ہیں اور بعض حیران کن حد تک ایمائی اور اشاراتی بھی مگر یہ تنوع ہی اِن افسانوں کا حسن ہے۔یہ افسانے اضطراب کے ساتھ ساتھ احساس کے افسانے ہیں۔یہ افسانے قوس قزح کے ایسے دائرے ہیں جن کی کجی اور رمزیت میں ہی فنکاری پوشیدہ ہے۔دراصل صادقہ اس بات کی قائل ہیں کہ برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائیست۔اس لیے وہ کیا کہنا ہے سے زیادہ اس پر توجہ دیتی ہیں کہ کیا نہیں کہنا ہے۔اس آ گہی نے ان کے افسانوں کو نہ صرف حد درجہ گٹھاؤ اور Compactness عطا کیا ہے بلکہ ان کی مطالعیت یعنی Readability میں بھی اضافہ کیا ہے۔

صادقہ نواب کے افسانوں میں مقامی کلچر اور زبان وبیان پر مقامیت کی گہری چھاپ نہایت واضح ہے۔اکثر کردار، مقامات کے نام اور ان کے طرز معاشرت سے ان کے علاقے اور تہذیب کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

''دسترخوان پر بگھارا کھانا، مرغی کا قورمہ، امباڑے کی کھٹی بھاجی اور تلی ہوئی کھاری مچھلی کا مزہ لیتے ہوئے نصیبن نے سوچا رقیہ کی شادی بھی اسی طرح گیارہ بارہ سال کی عمر میں وجے واڑہ میں ہوئی تھی'' (شریاں والی)

''ممبئی سے پنڈھرپور جانے والی ٹولیاں لیزم بجاتی نرم سخت دھوپ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سر پر پھینٹا باندھے، لکڑی کی ڈنڈی میں وٹھل کی مورتی کے لیے پندرہ دنوں کی جترا میں شامل ہونے کے لیے بڑھتی چلی جارہی تھیں۔''

(منت)

''کاجو واڑی کے اس حصے میں بے حد غریبی دکھائی دی۔جھونپڑے ایک دوسرے سے لگے ہوئے تھے۔ان کے درمیان تنگ گلیاں تھیں۔پہاڑی کے اس چھور پر جھونپڑے کے سامنے کچھ بچے اور تین عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔پیشانی پر بندی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے مسلمان لگیں ورنہ وہ ساجھے کلچر کا نمونہ ہی تھیں۔''

(پہلی بیوی)

صادقہ نواب کے کردار اور علاقے اسی ساجھا کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔کردار اور علاقے ہی نہیں صادقہ کی زبان وبیان بھی اس مشترکہ کلچر کی عکاسی کرتی ہے۔بقول وسیم بیگم:

''ان کی زبان وبیان میں ہندستان کے مختلف علاقوں کی معاشرت کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے'' (پشت کی تحریر)

مختصر یہ کہ صادقہ نواب سحر کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔موضوعات اور مسائل کی کمی نہیں، ایک حساس فنکار کی طرح ان کی باریک بین نگاہیں ان مسائل کی تہہ تک جاکر کہانیاں خلق کرتی ہیں لہٰذا ان کے افسانے صرف تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ ہماری بصیرت کا موجب بھی ہیں۔ان کے افسانے تجسس، دلچسپی اور چونکانے کا عمل تو رکھتے ہی ہیں اپنے اختتام پر فکر کی ایک دنیا آباد کردیتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ مواد ہر لکھنے والے کے پاس ہوتا ہے، مگر برتنے کا ہنر سب کے پاس نہیں ہوتا۔صادقہ نواب سحر اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کا ملتہب اور حساس دل افسانے کی Delicacy کو پا گیا ہے، اس لیے ان کی کہانیوں میں کم از کم 'شریاں والی' اور 'منت' ایسی ہنرمندی رکھتی ہیں کہ خواتین کے لکھے گئے ہم عصر افسانوں کے سخت سے سخت (مگر غیر جانبدارانہ) انتخاب میں بھی انہیں نظر انداز کرنا مشکل ہوگا۔

صادقہ نواب سحؔر ہمارے دور کی بے حد نمایاں اور اہم فکشن نگاران کے پہلے ناول ''کہانی کوئی سناؤ، متاشا'' نے شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچایا۔جہاں برسوں کی جدوجہد کے بعد کسی ادیب کا بھی پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔میرا خیال ہے کہ متاشا اردو فکشن کا سب سے مظلوم کردار ہے جس کے ساتھ زمانے نے بے رحمانہ سلوک کیا اور صادقہ نواب نے اس ناول میں متاشا پر ڈھانے کے لیے ایسے ایسے مظالم تخلیق اور اختراع کیے ہیں جن سے ان کے مشاہدے کی تیزی اور باریک بینی کے علاوہ ان کے فنکارانہ اور خلاّقانہ ہنر کا اندازہ ہوتا ہے۔شاید اتنے ظلم کسی ناول نگار نے اپنے کسی کردار پر ڈھائے نہیں ہوں گے۔اسے اتنے مظالم سے گزارا نہیں ہوگا۔میرا خیال ہے کہ شاید ایسا تانابانا کسی نے بُنا نہیں ہوگا۔''کہانی کوئی سناؤ، متاشا'' ایک بہت ہی زبردست ناول ہے۔

پدم شری مجتبیٰ حسین

(●)

صادقہ سحر کے افسانے

ارتضٰی کریم (اسکاربرو یوکے)

ہر فن کی طرح افسانے کی تخلیق بھی مشکل کام ہے۔ چند صفحات میں کسی کردار کو اس طرح نمایاں کرنا کہ وہ ہماری اس جبلت کو ظاہر کردے جس سے ہم ناواقف ہوتے ہیں یا جاننا بھی چاہتے ہیں، آسان نہیں۔ اسی طرح کسی ایک واقعہ کو اس طرح اہم بنا کر پیش کرنا کہ ہم اسے ہمیشہ یاد رکھیں، ایک مشکل کام ہے۔ افسانہ کیا ہے اور کسی طرح فکشن کے دوسرے عناصر سے مختلف ہوتا ہے، اس پر رائے مختلف ہوتی رہی ہے اور شاید آئندہ بھی ہوگی لیکن بہت سوچنے کے بعد چیخوف کی رائے درست محسوس ہوتی ہے۔ اس نے کہیں لکھا تھا:

Short story is a slice of life.

انگریزی ادب کے افسانہ نگاروں میں آئیرش افسانہ نگاروں کا بڑا نام ہے۔ ان میں کسی نے لکھا ہے:

A story is a way to say some thing that can't be said in any other way and it takes every word in the story what the meaning is.

ان نظریات کے علاوہ مختصر افسانوں کے مبصر یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ اب مختصر افسانے کو کسی ایک کردار یا کسی ایک واقعہ یا کسی خاص احساس کا تابع ہونے کی ضرورت نہیں اور مختصر افسانہ ایک ناول کا بھی تاثر دے سکتا ہے۔ صادقہ نواب سحر کے افسانوں میں حساس قاری کو یہ ساری خوبیاں نظر آئیں گی۔

ہندی ادب میں کسی ایسی ادیبہ کا نامور ہونا جو اردو بولنے اور لکھنے والے گھر میں پیدا ہوئی اور پرورش پائی، ایک ایسی بڑائی ہے، جس پر جتنا بھی خوشی کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور کارنامہ ہندوستان ہے۔ اسی ایک خوبی نے مجھے ان کے فن کی جانب متوجہ کیا۔ پچھلی صدی میں ہندوستان کا ٹوٹنا اور بڑے پیمانے پر قتل وفساد جس نے تاریخ کو خونی تو کیا ہی، ایک تہذیب کو بھی مٹانے کے راستے ہموار کردیئے لیکن بھلا ہو ہندوستان کی عظیم سیکولر روایت کا جس نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ یقیناً اس روایت کو ان ادیبوں نے بھی توانائی دی جنھوں نے اردو اور ہندی کو اپنی مادری زبان سمجھا اور انہیں باثروت بنایا۔ ان ادیبوں میں ایک اہم نام صادقہ نواب سحر کا بھی ہے، جنھوں نے ہندی ادب میں ڈاکٹریٹ کیا اور فکشن کے لیے اس زبان کو بھی چنا۔

ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' عمدہ اور دلچسپ ہے، جس میں تانیثی کردار متاشا کے پس منظر میں وہ ستم اور جبر ہیں جو ایک عورت پر بار بار ٹوٹتے ہیں اور عورت کو محض اپنے جنس کی وجہ سے انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس ناول کے مطالعے کے بعد یہی خیال آتا ہے کہ مصنفہ اپنے افسانوں میں بھی ان ہی مظالم کو پیش کریں گی لیکن ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت سے دور ہو کر اپنی شناخت بنائی اور انفرادیت قائم کی ہے۔ دیگر فنون کی طرح ادیبوں کو بھی اپنی آواز پانا پڑتا ہے۔ ایک ایسی آواز جس پر کسی دوسرے ادیب کا اثر نہیں محسوس ہوتا۔ ان کے افسانوں میں انسانیت کی روشنی بکھری ہوئی ہے۔ گو ان افسانوں میں کوئی پلاٹ نہیں محسوس ہوتا لیکن یہ سبھی زندگی کی ایک قاش ضرور لگتے ہیں۔ صادقہ نے اپنے افسانوں میں اردگرد چلتے پھرتے اور دکھ کے مارے انسانوں پر گہری نظر ڈال کر انھیں ہمارے سامنے اس طرح لا کھڑا کردیا ہے کہ ان میں ہم اپنے آپ کو بھی دیکھتے ہیں۔

میں نے اوپر جس انسانیت کا ذکر کیا ہے، اسے افسانے یا ناول میں دھیما رکھنا ضروری ہے۔ یعنی ادیب چیخ کر اس کی جانب متوجہ نہ کرے جبھی اس کا دل پر اثر گہرا ہوتا ہے۔ افسانہ 'پہلی بیوی' میں ایک راہ چلتی تعلیم یافتہ عورت کی نگاہ جب اس ننھے سے بچے پر پڑتی ہے جس کے لئے اس کے غریب ماں باپ انکیو بیٹر کی تلاش میں حیران وپریشان ہیں۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ وہ کچھ کر سکیں گے۔ عورت انھیں روک لیتی ہے اور بچے کے لیے اس کی مامتا اس طرح جاگتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے پرخلوص الفاظ بلکہ مالی طور پر بھی مدد کرنا چاہتی ہے لیکن بچہ کے باپ کی مردانہ سائیکی سے عورت کی انسانیت کی ٹکر ہوتی ہے اور ایک المناک صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جو ہر روز ہی ہوتا رہتا ہے اور جسے مصنفہ نے فنکاری سے پیش کیا ہے:

'''' چاہے ان چاہے' میں ادھیر عمر کا ریڈی اپنی بیوی اور بچوں سے دور ایک ریستورانت کھول کر اپنی روزی روٹی کمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ نیک انسان ہے لیکن اس کے ریستوراں میں ایک جوان بیوہ خادمہ جب آجاتی ہے تو کوشش کے باوجود اس کی کشش سے خود کو دور نہیں رکھ سکتا۔ عورت کے دل میں بھی امنگ ہے لیکن دونوں ہی اپنے جذبات پر پردہ ڈالے رہتے ہیں، محض ہلکے اشاروں سے ان کی چاہت کا راز کھلتا ہے۔ یہی تہہ داری افسانے کی جان ہے اور عام افسانوں سے الگ بلند مقام حاصل کر لیتی ہے۔ اس کہانی میں دلچسپ نکتہ یہ بھی ہے کہ اس عورت کو ریڈی کی بیوی نے اس کے پاس بھیجا تھا، اس لیے بیوی کی بابت بھی چند دلچسپ سوالات قاری کے ذہن میں اٹھ سکتے ہیں، جن کی وجہ سے افسانے کا جمالیاتی رخ سامنے آتا ہے۔''

افسانہ 'منت' کے بارے میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا کیوں کہ اس طرح افسانے میں تجسس کا عنصر ختم ہوجائے گا لیکن افسانے میں جو سماجی اقدار کا ٹکراؤ ہے اور مقامی تہذیب کی جو جھلکیاں ہیں، وہ اس کہانی کو دلکش بناتی ہیں۔ افسانہ 'شریاں والی' میں انسانی رشتوں کے جو **Dynamics** ہیں، وہ ہوا کے تیز جھونکوں کی طرح قاری کے گرداڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ اسے پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ کاش صادقہ نواب سحر اسے ناولا کی طرح تحریر کرتیں۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ یہ افسانہ مزید پھیلاؤ مصنف سے طلب کر رہا ہے۔

'ایس ایم ایس' نام کی کہانی ایک **Thriller** کی طرح تیز محسوس ہوتی ہے۔ گو محبت کا موضوع نیا نہیں لیکن اسے نیا بنا کر لکھا جاسکتا ہے اور کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ اس افسانہ میں آج کی ٹکنالوجی کس طرح انسان کے جذبات سے کھیلنے کے مواقع دیتی اور نئے رشتے کو جنم دیتی ہے، وہ اسے ماڈرن بھی بناتی ہے۔ اردو اور ہندی ادب میں صادقہ یقیناً ایک اہم قلم کار بن چکی ہیں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ وہ آج جس مقام پر ہیں اس سے اور بھی آگے جائیں گی۔

معاصر دوست کی نظر میں

ثروت خان
(راجستھان)

معاصرین کے فن کا تجزیاتی مطالعہ، جہاں خوشگوار احساس پیدا کرتا ہے وہیں ایک چیلنج بھی ہوتا ہے۔ تنقید میں جانب داری معیوب ہے اور اندیشہ اسی کا رہتا ہے۔ بہر حال صادقہ نواب سحؔر کے فکشن کے متعلق اتنا تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے وہ بہت محنت سے قلم کو تھامے رکھتی ہیں۔ تخلیقی عمل کی جدوجہد میں سرگرداں رہتی ہیں۔ بہتر سے بہتر کی طرف گامزن ہیں اور متوازن رویوں کی حامل ہیں۔

ان کا اپنا ایک حلقہ ہے، دائرہ ہے۔ ان کے قارئین، ان کے مدّاح، انہوں نے بڑی محنت سے بہت کم وقت میں پیدا کر لئے ہیں۔ گرویدہ کرنا انہیں بہ خوبی آتا ہے اور یہ کام کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں، ان کی محنت و مشقت۔ تخلیقیت کے لئے یہ حلقے یہ دائرے آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔ ادیب میں تحریک پیدا کرتے ہیں اور تعریف۔ وہ تو خدا کو بھی بے حد پسند ہے تو قلم کار تو انسان ہے۔ صادقہ نواب کو بھی تعریف پسند ہے، تخلیق کار جو ہیں۔ افسانے، ناول، ڈرامے اور مضامین کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں میں گرم جوشی سے حصہ لینا، ادبی پروگرام منعقد کروانا، یہ وہ کام ہیں جن کے لئے صادقہ نواب نے شاید اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ لگتا ہے یہ خاتون خانہ داری امور کو کیسے نبھاتی ہوگی؟ لیکن آپ دیکھئے! مسکراتے شوہر کے ہمراہ خود بھی مسکراتی، ہشاش، بشاش نظر آتی ہیں۔ میری دوست ہیں، اس لئے جانتی ہوں کہ بچوں کے لئے کتنی فکر مند اور مستعد رہتی ہیں۔

رشتے نبھانا وہ جانتی ہیں۔ ایک دوست ہونے کے ناطے میں نے ان میں ہمیشہ خلوص اور ہمدردی کی جھلک پائی ہے۔ کسی بھی ادبی گفتگو کے دوران بحث و مباحثہ میں الجھتے کبھی نہیں دیکھا انہیں۔ کبھی بھی احتجاج کرتے، مشتعل ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ مہذب بغاوت دیکھی، نہ خاموش آگ محسوس کی۔ ادبی دنیا میں منفی رویوں کو آنچ دینے اور سامنے والے کی (اگر وہ خاتون ہو تو پھر حوصلے اور بڑے ہوتے ہیں) کردار کشی کے سو افسانے مل جائیں گے...... مگر صادقہ نواب میں ان کو پی جانے کا مادّہ قوی ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ کسی خاتون قلم کار پر بھی اگر آنچ آ رہی ہوگی تو وہ دخل اندازی سے پرہیز کریں گی۔ ہماری ملاقاتیں سمیناروں اور کانفرنسوں میں ہی ہوئیں۔ ایک بار ساہتیہ اکادمی کے ہی ایک خواتین کے پروگرام میں آرگنائزر کی حیثیت سے میرے بلانے پر اودے پور بھی تشریف لا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں کے ذریعے سے بھی انہیں جاننے سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کے فن سے آشنائی ہوئی ہے۔ سب میں ان کا ذہن، ان کی فکر، ان کی ادبی قدروں میں، میں نے توازن پایا ہے۔

ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کافی مقبول ہوا۔ میں ان کے اس ناول کے متعلق یہ رجحان رکھتی ہوں کہ ''یہ نہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی، یہ ہے تو بہت اچھا ہے۔'' ان کے افسانے پڑھتی ہوں۔ ان کی شاعری پڑھتی ہوں۔ فکری اعتبار سے ایسا لگتا ہے کہ ایک ندی ہے جو اپنی متوازن رفتار سے بہتی جاتی ہے، مسلسل، رواں دواں۔ نہ اس میں زور ہے کہ چٹانوں کو توڑ کر ریزہ کر دے، نہ اس میں شور ہے کہ مضبوط درختوں کو اکھاڑ پھینکے، نہ اس میں اتنی گہرائی ہے کہ ڈوب جائیں، نہ اس میں اتنی کمی ہے کہ تیر نہ سکیں۔ ان کی کہانی ''وہیل چیئر پر بیٹھا شخص'' نے مجھے بہت چونکایا۔ باطن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اس کہانی نے۔ ذہن پر برابر دستک دیتی رہتی ہے۔ یہ صادقہ نواب کا فن ہے۔ فن کا سحر ہے، جو کہانی کو بھولنے نہیں دیتا۔

دراصل فن میں جذبہ ظاہر ہوتا ہے اور وہ جذبہ کسی ثباتی احساس کا پالا ہوا ہوتا ہے اور وہ ثباتی جذبہ یا جاودانی نقش تخلیق کار کے احساس سے غذا حاصل کر کے فن کی صورت میں ڈھلتا ہے۔ تخلیقی عمل کی یہ سرگوشیاں تخلیق کار کے باطن میں خوشگوار امکانات کو جنم دینے میں معاون ہوتی ہیں۔ کب کہاں چلتے چلتے کون سی مسکراہٹ، کون سی تکلیف، کون سا لمحہ فکشن نگار کی بصیرت و آگہی سے ہمکنار ہو جائے، کب کون تخیل میں پھلنے لگے، کون پناہ گزیں ہو جائے، خود فنکار بھی نہیں جانتا۔ زندگی سامنے ہونا بہت ضروری ہے، پھر دیکھئے زندگی کا ہر رنگ تخلیق میں ڈھلنے کے لئے بیتاب ہو جائے گا۔ ادیب کا غم، غصہ، خوشی، مسرت، خواہش، آرزو، تمنا، خواب، انسان، دنیا، کائنات، خدا، عورت، موت اور زندگی کے اصل بھید اور ان کے معنیٰ تخیل میں چکر لگاتے رہتے ہیں، پیکر بناتے رہتے ہیں۔ خیال بنتا ہے، بگڑتا ہے، الجھتا ہے، سلجھتا ہے، سنورتا ہے، مہکتا ہے اور پھر ادیب کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرواتا ہے، تب ہی وہ تجربات و مشاہدات، تخیل اور حقیقت، جمالیات و روحانیت، تاثر اور جذبے کے باہم تخلیقی سفر پر گامزن ہوتا ہے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا، جب تک کہ فن کا بہترین شاہکار پیش کرنے کی سعی میں خود فنا نہ ہو جائے۔ دورِ حاضر کا نسائی ادب فنا ہو جانے کی اسی راہ پر گامزن ہے، جس کی ایک مسافر صادقہ نواب سحؔر بھی ہیں۔

لیکن مایوسی سی جب ہوتی ہے کہ اردو فکشن کی تنقید نے فکشن کے خزانے میں بیش بہا اور نایاب اضافے کرنے والی خواتین فکشن نگاروں کی طرف توجہ کم ہی دی ہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے ہی ہماری تنقید تانیثیت کا شکار رہی ہے۔ نقاد ہو یا قاری۔ اگر Genderism کے طور پر وہ Male ہے تو تانیثی رجحان کا شکار ہے۔ اس کی نظر، اس کی فہم اور اس کا ادراک اسے اس حلقہ سے آزاد ہونے نہیں دیتے، کیونکہ اس کی پرورش اور تربیت بھی سماجی ثروت میں پیوست تانیثی رجحانات کے زیرِ سایہ ہی ہوئی ہے، جہاں Complete Man کا تصور تو قوی ہے لیکن Complete woman کا کوئی تصور سرے سے ہی غائب ہے، اسی لئے نسائی ادب کو عموماً ثانوی حیثیت کا حامل مانا جاتا رہا ہے لیکن آج تصویر بدل رہی ہے۔ تنقید کے میدان کی طرف خواتین قلم کار قدم بڑھائے

ہیں۔رسائل نے بھی اس میں بھرپور تعاون دیا ہے۔پبلیشر کا رویہ بھی کافی حد تک ترقی یافتہ ہے۔اردو صحافت کا انداز بھی اس ضمن میں خوش آئند اور غیر متعصّبانہ ہے۔یعنی خواتین فکشن نگاروں کی کاوشات کو اردو صحافت اور خود خواتین ناقدین کا دانشوری سمجھ بوجھ رہی ہے، Space تنقید وتجزیہ کررہی ہے اور تعین قدر کے مسائل کو حل کرنے کی سعی میں اپنے قدم بڑھارہی ہے۔

صادقہ نواب کے سامنے تعین قدر کا مسئلہ قطعی نہیں ہے۔وہ برابر چھپ رہی ہیں۔ان پر کام ہورہا ہے۔یہ تسلی بخش صورت حال ہے۔

دراصل ادب کا کام ایک طرح کی خدمت ہی ہے۔ایک عبادت ہے، جنون ہے جو بے نیازی چاہتا ہے......کام کیجئے اور آگے بڑھتے رہیے۔ پیچھے دیکھئے مگر اپنے تنقیدی شعور کو بیدار کر کے دیکھئے۔اعتراض، نکتہ چینی، تذلیل، مصائب......سب پر محققانہ نظر ضروری ہے لیکن فنکار کو گمان سے، نقاد کو جانبداری سے اور محقق کو سستی اور چوری (دوسرے کی تحقیق کی نقل) سے پرہیز بھی کرنا لازمی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ افکار ہر تخلیق کار کے ذہن کا مخصوص حصہ ہوتے ہیں۔صادقہ نواب سحر سے مجھے امید ہے کہ وہ تنقید کی طرف بھی آئیں گی اور پیچھے مڑکر نہیں دیکھیں گی۔ادب کو وہ سب کچھ دیں گی جو بہتر سے بہتر کی تلاش ہوتی ہے اور بے نیازی کی شان کے ساتھ!

بلبل بنالہ ونالۂ پُرسوز وساز کن
درفکرِ آں مباش کہ نہ شنید یا شنید

صادقہ نواب ایک ہمہ صنعت فنکارہ ہیں۔انہوں نے شاعری، افسانہ، ڈرامہ، تنقید ترجمہ اور ادب اطفال غرض مختلف الاصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنی تخلیق آرائی کے گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ان کی قلم رو میں اردو کے علاوہ ہندی کا علاقہ بھی آتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے وہاں بھی اپنی شناخت اور انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔

اردو، ہندی اور انگریزی میں ایم اے کیا ہے اور ہندی میں ''ساٹھوتری ہندی غزل پر'' ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے۔

اردو میں عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے بعد خواتین قلمکاروں میں بہت کم نام ملکی سطح پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔صادقہ نواب سحر کی کثیر الجہات صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی ادبی روایت کو آگے بڑھانے والی خواتین قلم کاروں میں ایک نمایاں کردار ادا کریں گی۔

''کہانی کوئی سناؤ، متاشا'' صادقہ کا پہلا ناول ہے۔سماج میں عورت کے استحصال کی داستان بڑی دل سوز ہے مگر، جب کوئی عورت اس تھیم کو بیان کرتی ہے تو اس کی شدت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' میں صادقہ نواب نے ایک عورت کے کرب و بے بسی کو اس پراثر انداز میں بیان کیا ہے کہ مظلوم نسواں کی ایک تصویر سی آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔

میرے نزدیک فکشن کی پہلی شرط اس کا مطالعاتی وصف ہے اور یہ وصف ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔اپنے تخلیقی اظہار، رواں دواں بیانیہ اور حقیقی کردار نگاری کے سبب یہ ناول شروع سے آخر تک قاری کو نہ صرف باندھے رکھتا ہے، بلکہ ورق ورق اس کے اندر ایک دبی دبی سی کسک کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔ناول کا مرکزی کردار، متاشا پورے ناول میں لہرلہر ڈوبتی اور گھاٹ گھاٹ ابھرتی ہے۔ناول ختم ہوجاتا ہے مگر متاشا قاری کے ذہن پر دیر تک دستک دیتی رہتی ہے۔

امید ہے کہ ''نسائی ادب'' سے دلچسپی رکھنے والے قارئین ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کا گرم جوشی سے خیر مقدم کریں گے۔

سلام بن رزاق
(ممبئی)

''راجدیو کی امرائی۔'' صادقہ نواب سحر کا تیسرا ناول ہے۔اس سے قبل ان کے دو ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' اور ''جس دن سے'' شائع ہو چکے ہیں۔

صادقہ نواب سحر ایک ہم جہت قلم کار ہیں۔وہ اچھی شاعرہ ہیں۔انہوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔اس کے علاوہ تنقید کے موضوع پر بھی ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اور اپنے ناولوں سے انہوں نے اس سے قبل ہی ناول نگاری میں لوہا منوالیا ہے۔

عام طور پر اردو زبان میں خواتین ناول نگاروں کا ایک الگ ہی طبقہ ہے،جس کو ایک حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔خواتین ناول نگاروں کی ایک بڑی فوج ہے جو آزادی کے بعد سے اب تک اردو ادب میں ناول نگاری پر طبع آزمائی کر رہی ہیں۔لیکن ان کے اردو زبان میں لکھے گئے دیگر ناولوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ خواتین ناول نگاروں نے صرف درون خانہ مسائل اور اور انسانی رشتوں کو ہی اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔صرف قرۃ العین حیدر اور جیلانی بانو جیسی ناول نگار ہیں جنہوں نے ان موضوعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جس پر عام طور پر صرف مرد حضرات قلم اٹھاتے ہیں۔

اس وجہ سے ڈاکٹر صادقہ نوب سحر کے ناولوں سے بھی اردو ناقد اور قارئین ان خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کے سے موضوعات کی توقعات رکھیں گے۔لیکن اصل میں میں صادقہ نواب سحر نے اپنے ناولوں کے ذریعے خود کو جیلانی بانو اور قرۃ العین حیدر کی صف میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔

انہوں نے اپنے ناولوں کے موضوعات دیگر خواتین ناول نگاروں کی طرح کے روایتی موضوعات نہیں رکھے ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں انسانی رشتوں اور درون خانہ کے موضوعات کے ساتھ ساتھ عورتوں کے مسائل جیسے روایتی موضوعات کو اپنے ناولوں کا موضوع ایک نئی جدت کے ساتھ بنایا ہے۔بلکہ انہوں نے اپنی ناولوں کی مرکزی کردار بھلے ہی عورت کو رکھا ہے اور اور اس کے مسائل اور جس طرح آج وہ اس نئے زمانے نئی تہذیب میں اپنی بقا کے لئے جدو جہد کر رہی ہے اس کو بنایا ہے۔ان کے ناول ''کہانی کوئی کوئی سناؤ متاشا '' کا موضوع یہی ہے۔تو انھوں نے اپنے دوسرے ناول ''جس دن سے میں'' میں کسی عورت کو مرکزی کردار نہ بنا کر ایک مرد کو مرکزی کردار بنایا ہے اور پورا ناول اس مرد کے گرد گھومتا ہے۔انہوں نے نے اس ناول میں جن خواتین کرداروں کو پیش کیا وہ عام طور پر دیگر خواتین ناول نگاروں کے تخلیق کردہ خواتین کرداروں سے قطعی مختلف ہیں۔انہوں نے اس ناول میں روایتی خاتون کے کردار کو پیش کرنے کے بجائے ا؟ ج کی خواتین کو پیش کیا ان کے مسائل ان کے کردار کی عکاسی کی اور حقیقت نگاری کرتے ہوئے خواتین کے صدیوں پرانے روایتی کردار کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول راجو کی 'راجدیو کی امرائی'' کا موضوع بھی کوئی خاتون نہیں ہے بلکہ اس ناول کا مرکزی کردار بھی ایک مرد ہے۔یہ ناول اول ایک مرد راج دیو کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔نہ صرف راجدیو کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے بلکہ صادقہ نواب سحر نے اس ناول میں راجدیو کی زندگی میں آنے والی تین عورتوں کی زندگی کی عکاسی کر دی ہے۔

اس ناول میں راج دیو کے والد اور اس کی ماں کا بھی خاطر خواہ ذکر ملتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اس ناول میں راج دیو کی زندگی کی مکمل عکاسی تو کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے راج دیو کی اولادوں،اس کے بیٹوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اس طرح یہ ناول راج دیو خاندان کی تین نسلوں کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

دنیا کی دیگر زبانوں میں میں کسی خاندان مکمل زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے یا ڈائنسٹی کے بارے میں ناول لکھے گئے ہیں۔لیکن اردو زبان میں اس طرح کے ناولوں کا چلن بہ نسبت کافی کم ہے۔

عام طور پر ڈائنسٹی پر اردو کے قلم کاروں نے اگر قلم اٹھایا بھی ہے تو اس کی دو چار مثالیں ہی ملتی ہیں۔ایسے میں آج کے دور میں ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا یہ ناول ناول ''راجدیو کی امرائی'' اسی طرز پر لکھا گیا ہے۔یہ اردو زبان کے لیے ایک اچھی مثال ہے۔

ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین اس ناول کی گہرائی اور گیرائی میں کھوتا چلا جاتا ہے۔صادقہ نے چھوٹے چھوٹے ابواب کے ذریعے اس ناول کا تانا بانا بنا ہے۔اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان ابواب کو عنوان بھی دے دیے ہیں۔عنوان کے زیر موضوع میں ہی انہوں نے اس باب کا تانا بانا بنا ہے او اس بات کے واقعات بیان کرتے ہوئے ناول کو آگے بڑھایا ہے۔ناول کے ابواب کے عنوان کو پڑھتے ہوئے دل میں ایک تجسس پیدا ہوتا ہے اور قارئین اس عنوان سے متعلقہ واقعات کو اس باب میں کھوجنے کے لئے ابواب کو پڑھتا ہے اس وجہ سے اس کی ناول میں دلچسپی قائم رہتی ہے۔

اس ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہ صادقہ نواب سحر نے اس ناول کے اولین ابواب میں بیان کئے گئے واقعات،کردار دار کے لیے کافی محنت کی ہے۔انہوں نے اس ناول کا موضوع اور پس منظر ایک ایسی قوم اور ایسے علاقے کو بنایا ہے جس سے اردو زبان کے قارئین بہت کم واقف ہیں۔

انہوں نے اس ناول کا پس منظر مہاراشٹر کوکن کے چپلون کے پرشرام تیرتھ نامی

مقام کو بنایا ہے اوراس مقام کی مکمل عکاسی اس ناول میں کردی ہیں۔اس ناول میں انہوں نے اس مقام،اس شہرکی جوعکاسی کی ہے جہاں پراس ناول کے مرکزی کردارراج دیوکی امرائی ہے،انہوں نے نے اس مقام کانقشہ قارئین کے سامنے لاکرکھڑا کردیا ہے ۔ یہ ناول کی تہذیب ہے۔ ناول کی تہذیب یہی ہے کہ کسی واقعے کومختصرانداز میں بیان نہ کرتے ہوئے اس واقعے سے متعلقہ تمام واقعات ،کردارکومفصل انداز میں بیان کریں تاکہ قاری کے ذہن میں میں ایک فلم سی چلنے لگےاوقارئین اس واقعے کے کرداروں،واقعات کوکسی فلم کی طرح اپنے ذہن کے پردے پردیکھتے رہے۔

راج دیوایک برہمن ہے،صادقہ نواب سحرنے اس ناول میں ایک برہمن خاندان کومرکزی موضوع بنایا ہے اور بڑی خوبصورتی سے برہموں کی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ براہموں کی اپنی طرززندگی ہے،طرزحیات ہے۔ان کی اپنی اپنی الگ روایتیں ہیں،ان کے الگ خیالات اوراحساسات ہیں۔عام طور پر براہمن ناول نگاروں نے بھی کبھی ان باتوں کوپیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ یہ قوم اپنے آپ کو ہمیشہ مخفی رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحرنے نے براہموں کی مکمل تہذیب کی عکاسی کرتے ہوئے ان کی زندگی کے واقعات اوران کی تہذیب سے جڑے واقعات،چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس ناول میں بڑی خوبصورتی سے بیان کردیئیہیں ۔ان واقعات کوپڑھنے کے بعد بعداس پرغوروفکرکیا جائے تو ایک برہمن خاندان اور برہموں کی کردارکی کامکمل نقشہ قارئین کےذہن میں ابھرتا ہے۔

راج دیوکے والد کا انتقال ہوگیا تھا،بیوہ ماں راج دیواوراس کے بھائی بہنوں کی پرورش اس کے چاچانے کی۔ یہ براہموں کے کےمشترکہ خاندان ان کی تہذیب کی عکاسی کرتا ہےاورراجدیوکا چاچاراج دیوکے خاندان کے لئے جوکچھ کرتے ہیں وہ ہماری تہذیب کے مشترکہ خاندان کی ایک مثال ہے یہ تہذیب جواب دھیرے دھیرےختم ہورہی ہے۔ صادقہ نواب سحرنے اس کی عکاسی کرکے ماضی میں اس تہذیب کی وجہ سے ہمارے خاندانی رشتے کتنے مضبوط تھےاس بات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔

پوراناول ایک فردایک کردارراج دیوکی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ کس طرح وہ بچپن میں یتیم ہوجاتا ہےاوراس کی پرورش اس کے چاچاکرتے ہیں،اس کے چاچاڈاکٹرہیں اوروہ راج دیوکوبھی ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں،لیکن راج دیوکی دلچسپی ڈاکٹر بننے میں نہیں ہے۔اس لیے وہ اس انداز میں تعلیم حاصل نہیں کر پاتا ہےجس انداز میں اس کے چاچاچاہتے ہیں۔

ڈاکٹر کے لئے جن مضامین میں محنت کرنے کی ضرورت ہے راج دیوان پرتوجہ نہیں دیتاہے۔تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ پونا آتا ہے۔پونا جوتعلیم کامرکز ہے۔وہاں پر وہ جدوجہد کر کے ایک اچھے کالج میں میں داخلہ بھی لے لیتا ہےاوراپنی تعلیم جاری رکھتا ہے۔وہیں پراس کی ملاقات انکیتا نامی ایک لڑکی سے ہوتی ہے۔تعلقات مضبوط ہوتے ہیں دھیرے دھیرے وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں ، اور بعد میں میں دونوں خاندانوں کی مرضی سے وہ ایک دوسرے سےشادی کرلیتے ہیں۔

راج دیوڈاکٹرکی تعلیم حاصل نہیں کرپاتا ہے،لیکن اپنی تعلیم اورتعلیم کی بدولت وہ کانچ کا سامان بنانے کی ایک فیکٹری قائم کرتا ہے۔جس میں میں عام طور پراسکولوں کی سائنسی لیبرٹری میں استعمال ہونے والے کانچ کےسامان بنائے جاتے ہیں۔اس کے لئے وہ اپنی فیکٹری میں ایسےلوگوں کوملازم رکھتا ہے جو نوکری کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ان کی صلاحیتوں اوقابلیت کا فائدہ اٹھاکر راج دیواپنی فیکٹری میں میں اچھاسامان بناتا ہے۔جس کی چاروں طرف مانگ ہوتی ہےاوراس کی وجہ سےاس کا کاروبارترقی کرتا ہے۔

اس کے اپنے اس کاروبار کی وجہ سے وہ پونا میں اچھا گھر لے لیتا ہے۔اپنے بچوں کواچھی تعلیم دلاتا ہے۔اپنی بیوی انکیتا کوبھی آگےتعلیم جاری رکھنے میں پوری مددکرتا ہےاوراورایک کامیاب زندگی وہ گزارتا ہے۔

راج دیوکے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرلیتے ہیں۔ایک بچہ ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ایک انجینیر بنتا ہے۔اس کی ماں اس کے پاس آکررہنےلگتی ہے۔لیکن عمرکےآخری دورمیں میں اس کی کی زندگی میں ایک طوفان سااٹھتا ہوتا ہےاوروہ طوفان اس کی زندگی بکھیردیتا ہے۔

راج دیوکی زندگی کےاس اس طوفان کی وجہ سےاس کی بیوی انکیتا اس سے الگ ہوجاتی ہے۔ وہ اس کے خلاف میرج کورٹ میں میں طلاق کا مقدمہ دائرکردیتی ہے،راج دیوبیوی کوطلاق دینانہیں چاہتا ہے۔لیکن وہ اس کے ساتھ رہنانہیں چاہتی ہے۔آخرمیں وہ ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔لیکن اسے اپنی بیوی کے گزارے کے لئے اسے ماہانہ خرچ دیناپڑتا ہے۔ راج دیواس کے بچے جنہیں اس نے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے وہ بھی اس سے بدظن ہوکراس سےالگ ہوجاتے ہیں۔

اپنے آبائی گاؤں میں راجدیوکی ایک امرائی ہے،وہ سال میں ایک باراسامرائی میں آم کے لئے جاتا ہے۔وہیں پراس کی ملاقات ایک عورت تلسہ سے ہوتی ہے۔تلسہ ایک چھوٹا سا ہوٹل اس گاؤں میں چلاتی ہے۔راج دیواس ہوٹل میں کھانا کھانے جاتا ہے وہیں پران کی ملاقات ہوتی ہے جودھیرے دھیرے محبت میں بدل جاتی ہے۔

مصنفہ نے اس محبت کوبیان نہیں کیا ہے،لیکن جگہ جگہ اس بات کے اشارے ضرورچھوڑے ہیں کہ راج دیوکے دل میں تلسہ کے لیے ایک نرم گوشہ ہےاوروہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔وہ اسے حاصل ہوتی ہے یانہیں یااس کے کے دل میں جوبات ہےاس کا جواب تلسا دیتی ہے یانہیں نہیں اس بات کوکہیں بھی کھل کربیان نہیں کیا گیا ہے۔لیکن اس کی اورتلسہ کی قربت کی وجہ سےہی اس کی بیوی انکیتا اس سےالگ ہوجاتی ہےاوراس سےطلاق لینے کے لئے کورٹ

میں نہ صرف عارضی کرتی ہے بلکہ پولیس سٹیشن میں اس کی شکایت بھی کرتی ہے اور اس پر کئی الزامات بھی لگاتی ہیں۔

یہ اس کی اور تلسہ کے تعلقات کا شاخانہ ہوتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود پورے ناول میں کہیں بھیراج دیو اور تلسہ کے تعلقات پوری طرح ابھر کر نہیں آتے ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے برہمنوں کے تمام شوق، عادات واطوار، فطرت، تہذیب کی بہت اچھی اور گہری عکاسی کی ہے۔اردو زبان میں اس طرح کی عکاسی شاید ہی کسی قلمکار نے اپنی کسی تخلیق میں کی ہے۔

ناول کیونکہ عصر حاضر میں چلتا ہے۔اور اس اس کا کا وقفہ یا دور اور ساٹھ ستر سالوں پر محیط ہے اس لیے ساٹھ ستر 70 سالوں میں جو اہم واقعات ملک میں رونما ہوے ہیں بہت اچھی طرح ان واقعات کو بھی بڑی ہی خوبصورتی سے جگہ جگہ اس ناول میں بیان کر دیا گیا ہے۔جس کی وجہ سے اس ناول پر کسی کی آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔

کبھی کبھی تو اس ناول کو پڑھتے ہوئے کسی مراٹھی زبان کے شاہکار ناول کا کا اردو ترجمہ کا گمان ہوتا ہے لیکن جب ناول میں راج دیو کی اردو زبان سے محبت میں اردو کے ایک شاعر انور کا قصہ بیان کرتے ہوئے اسکی بیوی کی جدجہد بیان کی کی گئی گی اور جب یہ باب قارئین کے سامنے آتا ہے تو اسے اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ یہ کسی مراٹھی ناول کا ترجمہ نہ ہو کر طبع زاد ناول ہے۔

غرض کہ نواب سحر نے اس ناولوں میں کئی کرداروں کی بہت اچھی عکاسی کیہے۔ان میں میں ناول کے مرکزی کردار راج دیو کا کردار تو ہے، ساتھی ساتھ اس کی بیوی انکیتا کا بھی کردار ہے اور اس کی محبوبہ تلسہ اس کا جس سے دلی رشتہ ہے اس کا بھی کردار ہے۔اس نے راج دیو کی ماں کے کردار کی بھی بہت اچھی عکاسی ملتی ہے اور راج دیو کے کے بیٹوں کے کرداروں کی بھی۔

صادقہ نے راج دیو کے جس ڈاکٹر بیٹے کے کردار کی کی عکاسی کی ہے وہ بڑی فطری ہے۔اور آج کل کے سفاک ڈاکٹروں کے حقیقی کرداروں سے ملتی ہے۔یہ ڈاکٹر نہ صرف اپنے مریضوں کے لئے سفاک ہوتے ہیں بلکہ یہ پیسوں کے لئے اپنی سفاکیت کا مظاہرہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ بھی قائم رکھتے ہیں اور اپنے پیدا کرنے والے پال پوس کر بڑا کرنے والوں کے لئے بھی ان کا برتاو اپنے کسی مریض کی طرح ہوتا ہے۔

صادقہ نواب سحر نے اس ناول میں جو چھوٹے چھوٹے ابواب بنائے ہیں، کہیں کہیں تو یہ چھوٹے چھوٹے منی افسانے محسوس ہوتے ہیں اور کہیں ان پر افسانوں کا گمان ہوتا ہے۔سیدھی سادی زبان میں ایک ایک منفرد اسلوب کا استعمال کر کے انہوں نے نے اردو اردو زبان میں جو سحر قاری کرنے کے امکانات تھے تھے ان کا بہت اچھا استعمال کر کے قارئین کو کہیں کہیں تو الجھایا ہے اور کہیں پوری طرح باندھ کر رکھا ہے۔

راج دیو کے نام پر اناول میں انہوں نے ایک جامع کردار تو پیش کیا ہے اس کی بیوی اونتیکا کے نام پر ایک نیا کردار انہوں نے نے اس ناول میں پیش کیا ہے۔انکیتا کا عورت کا کردار، عورت جو صرف پیار کی مورت نہیں ہے، ایثار اور قربانی کا جذبہ رکھنے والی عورت نہیں ہے بلکہ موقع پرستی ابن الوقتی بھی اس میں کوٹ کوٹ کر کر بھری ہوئی ہے، اور وقت پڑنے پر وہ اپنے مفاد کے لیے اپنے شوہر کو بھی ٹھکرا سکتی ہے اور اسے وہ ایک معمولی بات سمجھتی ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا یہ ناول کیونکہ ایک شخص اور اس کے خاندان کی کی زندگی میں واقعہ جو واقعات پیش آتے ہیں ان کی عکاسی کارتا ہے۔ جو واقعات اس پیش آتے ہیں وہ ساٹھ ستر سالوں پر محیط تھے ان کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔اس طرح انہوں نے نے اپنے اس ناول میں ناول کی تہذیب کو بخوبی نبھایا ہے اور وہ اس ناول کو پڑھتے ہوئے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے مہاراشٹر کا ماحول، وہاں کے لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ان کی زندگی ان کے عادات واطوار سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔

جن لوگوں کو تہذیبوں اور انسانوں کے مطالعہ میں دلچسپی ہوتی ایسے لوگوں کو اس ناول کو پڑھنے میں میں بہت لطف آئے گا۔ان لوگوں کس سامنے نے انسانی حیات کے نئے دریچے کھلیں گی اور وہ خود کو ایک عجیب سے نئے ماحول ایک نئی تہذیب میں محسوس کریں گے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر ہندوپاک کی مشہور و معروف ڈرامہ، ناول وافسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانے اور ناول لکھنے کا انداز دلچسپ اور منظر کشی بہت دلکش ہوتی ہے۔ایک بار افسانہ یا ناول شروع کرنے کے بعد ناممکن ہے قاری درمیان میں رک دیا جائے۔اندازِ بیان اتنا دلکش کہ پڑھنے والا منظر میں پوری طرح ڈوب جاتا ہے اور آخر تک پڑھتا ہے۔زبان آسان اور عام فہم ہوتی ہے۔ڈاکٹر صادقہ نواب گھر آنگن کے موضوعات پر بھی لکھتی ہیں۔ان کا حسّاس قلم زمانے کے ظلم وستم، خوشی اور غم کو تحریر میں ڈھالتا ہے کیونکہ صادقہ صاحبہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ان کا دماغ تخلیقی صلاحیتوں سے پُر ہے۔میری دعا ہے ’اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ‘

طارِق فاروق (ایڈمنٹن۔البرٹا۔کیناڈا)

صادقہ نواب سحر اردو فکشن کی دنیا میں ایک ابھرتا ہوا نام ہے۔'' کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ان کی انعام یافتہ ناول ہے۔ افسانوں کے مجموعے، بچوں کے لیے کہانیاں، لوریاں، نظموں کے علاوہ چند ڈرامے زیر طبع ہیں۔ موصوفہ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اسٹیج ڈراما سے خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ اسٹیج کے تقاضوں سے باخبر ہیں۔ کہانی کو مختصر مکالموں کے ذریعہ منتہا تک پہنچانا اور پھر ڈرامائی حل پیش کرنا ان کا فن ہے۔ سردست ان کے گیارہ ڈرامے پیش نظر ہیں:

'دیا جلے ساری رات'، 'ظلم تو ظلم ہے'، 'اور گھنگرو بجتے رہے'، 'رنگ برنگا بھارت میرا'، 'ڈاکٹر کفن پھاڑ'، 'تین دو پانچ'، 'میرج بیورو'، 'ڈسکو کالج ممبئی'، 'سلطان محمود غزنوی'، 'با ادب با ملاحظہ ہوشیار'، 'خودکشی یا موت عرف انجام ہمیں معلوم نہ تھا' وغیرہ۔

یہ تمام ڈرامے سماجی اور نفسیاتی مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ جو کہ ڈراما نگار کی حساس طبیعت کو منکشف کرتے ہیں۔ وہ انسانیت میں یقین رکھتی ہیں۔ قلم کے ذریعہ عوامی خدمت کا حق ادا کرنا چاہتی ہیں۔ عورت کی مظلومیت، مرد اشراب نوشی کر کے پورے خاندان کو زندہ درگور کر دینا، بچوں کے ارمان اور مایوسیاں، یہی وہ موضوعات ہیں جو کہ انکے ڈراموں کے محرک ہیں۔

'' دیا جلے ساری رات'' سہ بابی طویل طبعزاد ڈراما ہے۔ ''باشا'' اور ''نوری' مرکزی کردار ہیں۔ باشا گھر کا نوکر ہے۔ نوری مالک کی نازنخروں میں پلی ہوئی ہی دوشیزہ ہے۔ نوری کی شادی اپنے پھوپھی زاد 'وسیم' سے بچپن سے طے ہے لیکن شادی کے وقت جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جائیداد بیٹی کے نام ہے، داماد کے نہیں، تنازعہ ہوتا ہے۔ اب نوری کے والد 'بابو بھائی' کو علم ہوتا ہے کہ شادی صرف جائیداد کی لالچ میں کی جارہی ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ بارات لوٹ جاتی ہے، بدنامی سے بچنے کے لیے وہ فوری فیصلہ کرتے ہیں، باشا کی خوبیوں سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ اسکا نکاح نوری سے کر دیتے ہیں۔ نوری گھر کے نوکر کو شوہر کی شکل میں کسی طرح ذہنی طور پر قبول نہیں کر پاتی ہے۔ اسی نفسیاتی گتھی کو مرکزیت دی گئی ہے۔ نوری باشا سے فرار حاصل کرنے کے لیے دو مرتبہ بدقماش نوجوانوں کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے آخرش واپس آتی ہے۔ اپنی بدکرداری پر شرمندہ ہوتی ہے۔ اب وہ باشا کی قدر و قیمت پہچانتی، اپنے آپ کو باشا کے لائق نہیں سمجھتی۔ باشا کی لاعلمی میں اس کی چچی کے یہاں پناہ لیتی ہے۔ انہیں آمادہ کرتی ہے کہ باشا کو گھر بسانے پر تیار کریں۔ باشا نوری سے مایوس ہو کر اپنے گاؤں کی لڑکی طاہرہ سے شادی کر لیتا ہے اور صاحب اولاد بھی ہو جاتا ہے۔ نوری پچھتاوے کی آگ میں جلتے جلتے ختم ہو جاتی ہے۔

باشا کا کردار پیش کرنے میں ممبئی کی فضا اور جرائم کی دنیا کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نوکری کی تلاش میں آئے ہوئے نوجوان کن حالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ باشا پر تو بابو بھائی کی نظر کرم ہو گئی کہ وہ جرائم کی دنیا میں داخل ہونے سے محفوظ رہا۔ اس کی خوبصورتی، ایمانداری اس لائق تھی کہ وہ کسی باعزت گھر کا داماد بنتا لیکن نوری کا ردعمل بھی فطری ہے۔ شوہر کے لئے حسین خواب دیکھنا فطری بات ہے۔ معاملے کی نزاکت اور گہرائی کے لئے جس پختگی عمر کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس سے دور تھی۔ باشا کی چچی اس کے کردار کا تصفیہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

''اس نے حالات سے بغاوت کی۔ تقدیر سے بغاوت کی، ماں، باپ سے بغاوت کی...... مگر صحیح طرح سے نہیں کی، وہ بار، بار حالات سے بھاگتی رہی۔ زندگی کے چیلنج کو اس نے صحیح طرح سے قبول نہیں کیا۔''

یہی پیغام ڈرامہ نگار دینا چاہتی ہیں کہ قوم کی دوشیزاؤں کو والدین اور ان کے فیصلوں کا احترام کرتے ہوئے، اپنی تقدیر پر شاکر رہ کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ والدین اولاد کے دشمن نہیں ہوا کرتے، ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، اولاد سے بہتر انھیں کون سمجھ سکتا ہے؟ فرار کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا ہے۔

''ظلم تو ظلم ہے'' میں انسانی نفسیات کی اس کیفیت کو مرکزیت دی گئی ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو انسان کا اعتبار انسان سے ہٹ کر جانوروں پر ہو جاتا ہے جیسا کہ اس ڈرامے کا کردار ظالم سنگھ کہتا ہے......'' جانور کا کاٹا اور سانپ کا ڈسا بچ سکتا ہے لیکن عورت کا کاٹا نہیں،...... پانی بھی نہ مانگے......'' یہ سبق اسے اپنی ہرجائی ماں اور جائیداد کے لالچی بہنوئی سے ملتا ہے۔ اس کی اپنی محبت بھی شادی کے ایک سال بعد بے وفائی کر گئی کیوں کہ وہ طوائف تھی، لہٰذا ظالم سنگھ کا چوٹ کھایا ہوا دل بغاوت اور ظلم میں یقین کرنے لگا۔

تیسرے اور آخری منظر میں سیلاب کی تباہی دکھائی گئی ہے۔ ایک چھوٹی سی کشتی میں ظالم سنگھ، آتمارام کچھ سامان اور اپنے کتے کو لے کر سوار ہو جاتے ہیں کہ ایک عورت ایک بچہ لے کر سوار ہونے کہ منت کرتی ہے۔ ظالم سنگھ کے منع کرنے کے باوجود آتمارام سارا سامان پھینک کر اسے سوار کر لیتا ہے، اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اب یہ راز کھلتا ہے؛'' عورت: میں ظالم سنگھ کی بیوی ہوں وہ مجھے بے وفا سمجھتا ہے۔ یہ بچہ اسی کا ہے۔ مگر اب وہ اسے کیوں کر قبول کرے گا۔ اصل میں وہ دل کا بڑا نرم اور بھولا ہے، صرف باہر سے سخت دکھائی دیتا ہے......''

آتمارام: لوگوں سے دھوکا کھا کھا کر اس کا انسانوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے بیچارہ!

جاگیر: ماں کی بے وفائی نے اس کی دنیا اجاڑ دی ورنہ......شاید وہ ساری دنیا کی بے وفائی کو سہہ لیتا......''

اس آخری مکالمے نے ماں کے کردار پر کئی اہم سوال کھڑے کئے ہیں کہ

محبت کا پہلا سرچشمہ جب خشک ہوجاتا ہے تو بچے کی تشنگی کہیں سے سیراب نہیں ہوسکتی۔
دو ضمنی کرداروں کی مدد سے آسان مختصر مکالموں، چند بلاکس، اور روشنیوں کی مدد سے اس ڈرامے کو آسانی سے اسٹیج کیا جاسکتا ہے۔

''اور گھنگھرو بجتے رہے'' میں چتو ایک سیٹھانی کے گھر میں ملازم ہیں۔ ان کی ایک بیٹی بندیا ہے جسے یہ لوگ مالک کے بچوں کی طرح انگریزی اسکول اور ڈانس سکھا کر مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری جانب جھونپڑپٹی کی معاشی اور معاشرتی مجبوریاں حائل ہیں۔ لنگڑ دادا ایک فلیٹ کا وعدہ کر کے تین سال سے روپے اینٹھ رہا ہے۔ بابو نیتا ہے جو کہ کٹورا اور کمبل بانٹ کر الیکشن جیت رہا ہے۔ لنگڑ دادا نے کلوا جیسے لوگوں کو پال رکھا ہے جو کہ چار سال کی معذور بچی 'بے بی' کی عصمت دری کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ان حالات میں نندی سیٹھ کے بچوں کی طرح کیسے پروان چڑھ سکتی ہے؟ یہ طبقاتی کشمکش بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے سوال جنم لیتے ہیں:

''نندی: دادا یہ بے بی کی جگہ میں ہوسکتی تھی نا؟ پریما، رنکو، ریٹا بھی ہوسکتی تھی نا؟ (دادا کا کالر پکڑ کر) کلوا کی جگہ تو بھی تو ہوسکتا تھا نا؟...... بول ...... بول......'' چند کرداروں کی مدد سے اسے بآسانی اسٹیج کیا جاسکتا ہے۔ اس کا تاثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔

''رنگ برنگا بھارت میرا'' بچوں کے لئے ہے۔ اس میں آپسی میل و محبت، ہمدردی، اتحاد و اتفاق کا پیغام بچوں کے ذریعہ دیا گیا ہے۔
اس کے یہ بول اپنے اندر بہت کچھ سموئے ہوئے ہیں۔
'رنگ برنگا بھارت میرا...... میرا بھارت رنگ برنگا...... پیارا پیارا اس کا ترنگا...... بھارت اپنا ہے...... ہم سب ایک ہیں' اس دور میں یہ ذہنیت بنانا ضروری ہے۔

''ڈاکٹر کفن پھاڑ'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یک بابی مزاحیہ ہے۔ ایک ڈاکٹر، للو کمپاؤنڈر اور چند مریضوں کی مدد سے تیار شدہ ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر جانوروں کا ہے لیکن جانور کم بیمار پڑتے ہیں اس لئے انسانوں کا علاج کرنے کی ٹھانی ہے۔ بڑے عجیب و غریب مریضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مرض اور تشخیص کجا، فیس بھی وصول نہیں ہوتی! اس کا لطف دیکھنے سے کھلتا ہے۔

''تین دو پانچ'' طبع زاد، یک بابی مزاحیہ ہے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر اور ان کی بیوی کی نوک جھونک سے شروع ہوتا ہے پھر تو لطیفوں کا ایک سلسلہ سا چل پڑتا ہے۔ اس کو اسٹیج کرنے سے مسلسل ہنسی کے فوارے سے چھوٹتے ہوئے محسوس ہوں گے۔ حاضر جوابی، تسلسل اور سوال وجواب کی موزونیت لاجواب ہے۔ آج کے اس مسائل سے بھرے ہوئے دور میں کچھ وقت ہنسی مذاق کا مل جائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہئے بلکہ نعمت سمجھ کر محظوظ ہونا چاہئے۔ اسی طرح ''میرج بیورو'' بھی یک بابی، طبع زاد مزاحیہ ہے۔ مختلف قسم کی دوشیزائیں پیش کی گئی ہیں لیکن کوئی شادی طے نہیں ہوتی ہے اور مزاحیہ کا ڈراپ سین ہوجاتا ہے۔ ''ڈسکو کالج ممبئی'' بھی ایک طبع زاد مزاحیہ ہے۔ اس میں نہایت دلچسپ انداز میں تمام مضامین ڈسکو کرتے ہوئے پڑھائے گئے ہیں۔ اس کا لطف دیکھنے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ ڈسکو کالج کھولنے کا خیال کیوں آیا؟ دکھی رام چپراسی کے استفسار کرنے پر جواب نہایت پرلطف ہے۔

پرنسپل...... فٹ پاتھ پر میرے ساتھ والے دوسرے اسٹال پر میں نے دیکھا کہ وہاں ڈسکو جوتے، ڈسکو چپل، ڈسکو چوڑیاں اور ڈسکو بھجیے...... کی پکوڑیاں زور دار بکری کرتے تھے۔ اسی سے مجھے ڈسکو کالج ممبئی میں کھولنے کا آئیڈیا ملا۔

''سلطان محمود غزنوی'' ایک تاریخی اور سنجیدہ ڈراما ہے۔ اس میں سلطان کی انصاف پسندی کی داد دی گئی ہے۔ سلطان کا بھانجہ فریادی کی بیوی کی عصمت دری کرتا ہے اور شکایت نہ کرنے کی دھمکی بھی دیتا ہے۔ بادشاہ اس فریادی کے گھر شب میں موقع پر جا کر شمع گل کر دیتا ہے اور بھانجہ کو قتل کر کے پانی پیتا ہے۔ بغیر انصاف کئے اس نے پانی پینا بھی گوارہ نہ کیا...... یہ ہے تاریخ میں ایک ظالم دکھائے جانے والے بادشاہ کا انصاف! ہمارے مؤرخین نے کتنی دیانت داری سے تاریخ لکھی ہے، یہ ایک واقعہ مثال کے لئے کافی ہے۔

''باادب با ملاحظہ ہوشیار'' ایک سماجی ڈراما ہے۔ اس میں بیٹے، بیٹیوں کے درمیان برتے جانے والے امتیازات کے جالوں کو اذہان سے صاف کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ایک بچی لیکھا کی زبانی سماج کے اس سنگین مسئلہ کو بڑے فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ ''خودکشی یا موت'' ایک دردناک ڈراما ہے۔ اس میں ایک شرابی اور جواری باپ اپنے بیٹے کی تعلیمی کامیابیوں پر خوش ہونے کے بجائے جوئے میں جیت کر لائے ہوئے پیسوں کا تقاضا کرتا ہے۔ والدین کے درمیان جھگڑے، گھر کا خراب ماحول اور غذا کی کمی بری صحبت اسے آخر کار ایڈز جیسے موذی مرض میں گرفتار کر دیتی ہے۔ ایسے مریضوں کو ہمارا سماج قبول نہیں کرتا لہٰذا وہ گھر پر رہ کر موت کا انتظار کرتا ہے۔ یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہے۔ اس طرح یہ المیہ ہمارے سماج کی کئی اخلاقی پستیوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ ڈرامے صادقہ نواب سحر صاحبہ کی اصلاح معاشرہ کی خواہشوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں اسٹیج کر کے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی جائے کہ ناامیدی کے مایوس مطلع پر کہیں سے امید کی کوئی کرن چمکے جو انسانیت کو زندہ کردے۔

> آپ کے ناول کی زبان میں لہروں کے جل ترنگ سے محسوس ہوتے ہیں۔ آپ نے جس طرح ناول سے باہر رہ کر اسے تحریر کیا ہے، ایسا ناول شاید میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھا ہے۔ میں بہت محبت کے ساتھ اپنے کسی مضمون میں اس کا ذکر کروں گا، اسے ۲۰۰۸ء کے اچھے ناولوں میں شمار کروں گا۔
>
> (•) پروفیسر قمر رئیس

افسانہ

منّت

صادقہ نواب سحر

ممبئی سے پنڈھر پور جانے والی ٹولیاں لیزم بجاتی، نرم سخت دھوپ میں سر پر پھیٹا باندھے، لکڑی کی دِنڈی (پالکی) میں وِٹھل کی مورتی لئے آگے بڑھی چلی جارہی تھیں۔ پونے، بارامتی، اندا پور روڈ کے راستے یہ ٹولی شولہ پور روڈ چھوڑ کر پُونے ضلع کے آخری گاؤں باوڑا سے آگے بڑھی۔ باوڑہ میں ہون راؤ اپنی بہن ملتا اور ماں شانتا، جسے وہ 'آئی' کہتے تھے، کو لیے ٹولی کے ساتھ ہولیا۔ باوڑہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی دو دکانیں ہیں۔ پورے گاؤں میں کوئی پانچ سو گھر ہوں گے۔ گاؤں کے آس پاس کھیت ہیں جن میں گیہوں، جوار اور گنّے کی فصل ہوتی ہے، یہ بہت شانت گاؤں ہے۔ یہاں ہفتے میں ایک دن یعنی جمعہ کے دن ''آٹھوڑے بازار'' (ہفتہ بازار) لگتا ہے۔ جس میں سبزیاں کھانے پینے کی چیزیں، کرانہ، راشن، اور تھوڑا بہت کپڑا فروخت ہوتا ہے۔ باقی دنوں میں خریداری کے لیے گاؤں والوں کو 'آکلج' جانا پڑتا ہے۔ یہیں ان لوگوں کا بڑا سا گھر ہے، آئی ملتا کے لیے منت کرنا چاہتی تھیں۔

''اگلی بار تبھی آؤں گی، جب میری منوتی پوری ہوگی۔''

''ہے وِٹھل پانڈو رنگ! میری لیک (بیٹی) کو شادی لائق بنادے۔'' اپنے سر پر گملے میں تلسی کا پودا اٹھائے انہوں نے عقیدت سے کہا تھا۔

اس وقت ملتا اٹھارہ سال کی تھی۔ گدرائے جسم کی، تیکھے نین نقش، درمیانہ قد، کھلتا ہوا رنگ، شوخ رنگ چوڑیوں سے ہاتھ بھرے ہوئے، بیچ کی مانگ، دو چوٹیاں لال ربن سے بندھی ہوئی، بڑے گھیر کے لہنگے جیسا ٹخنوں تک کا پرکر، اور شرٹ جیسا چھوٹا کرتا، ماتھے پر کم کم کا ٹیکہ۔۔ کھیت پر بابا کو کھانا دینے جاتی، تو گاؤں کے لڑکے آہیں بھر کر دیکھتے..... ہون کی آنکھ چل جاتی اور وہ فوراً آنکھ پکڑ کر رگڑنے لگتا، کیونکہ رک کر اسے ملتا گھورتی۔

''شادی کرے گی میرے سے؟''

''اپنے بابا کو بھیجوں''؟

''چل بھاگ جاتے ہیں؟'' ہون ہر بار ایک نیا فقرہ پھینکتا۔

''کیوں؟ اپنے بابا کو بھیجتا کیوں نہیں رے؟ ......خالی بڑ بڑ کرتا ہے۔ میرے بابا سے ڈرتا ہے کیا؟''

''نہیں، تیرے بابا سے نہیں......''

''تو؟''

''اپنی ماں سے......!''

''تو جانا گھر اپنے! مجھ سے کیوں پوچھتا ہے؟......شادی کرے گی کیا میرے سے؟ ہونہہ!! اپنی ماں سے پوچھنا!!''

ہون کی ماں سر پیٹ لیتی ہے۔

''کیا کمی ہے اس میں؟ لنگڑی ہے کہ اندھی کانی؟''، ہون چڑ کر کہتا ہے

''وہ بھی چل جائے گی مگر ملتا نہیں۔''

''آئی، تو ملتا سے جلتی ہے کیا؟''

''اب کیا بولوں رے تجھے؟''

ملتا بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح کھیلتی کودتی بڑی ہوئی تھی۔ اسکول جانے کا شوق تینوں ہی بہنوں میں نہیں تھا۔ بھائی نے تو حساب کتاب تک کی پڑھائی کرلی تھی۔ سود پر پیسہ دیتا تھا۔ باپ کسان تھے۔ ایک ایک کرکے دونوں بہنیں جوان ہوگئیں۔ ملتا ویسی ہی رہی۔ کتنے ڈاکٹروں، ویدوں کو بتایا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کسی نے ممبئی کے کسی بڑے زنانہ بیماریوں کے ڈاکٹر کا نام سجھایا، مگر شہر جا کر علاج کیسے کرائیں۔ وہاں کوئی ایسا بھی تو نہیں، جس کے پاس جا کر کچھ دن رہ سکیں۔ بات دھری رہی۔ دوائیوں کا فائدہ تو نہیں ہوا لیکن ہاں، ملتا کا جسم ضرور پھول گیا تھا۔ وہ عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔ چھوٹی بہنیں ایک کے بعد دوسری سولہ سال کی ہوئیں اور بیاہ کرکے بدا کردی گئیں۔

لڑکوں کی ماؤں نے انہیں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ملتا کو نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ مگر نظروں پر کسی کا بس چلا ہے؟ ان کی اپنی نظریں بھی اُس پر تھیں، دولت مند گھرانے کی لڑکی جو تھی، بہت ملے گا۔ ہون کی ماں کو بھی یہی لالچ ملتا کی ماں کے پاس لے گئی۔ مگر شانتا تائی نے سمجھا کر بھیج دیا۔

''بعد میں دکھ اٹھانے سے اچھا ہے، شادی ہی نہ کریں۔ لڑکی ہم پر بوجھ نہیں ہے۔''

کیسی چہکتی تھی ملتا بچپن میں۔ سب بہنوں سے تیز تھی، وہ باپ کی لاڈلی! اب وہ ایک طرح سے خوش تھا کہ بیٹی اس کے پاس رہے گی۔ بیٹے کا کیا ہے بیاہ تک اپنا! مگر کبھی کبھی اس کا دل بھی کچھ کے لگاتا۔

''کاش سب کچھ ٹھیک ہوتا......!''

چھوٹی بہنوں کی شادیوں کے بعد سے ملتا کچھ بجھی بجھی سی رہنے لگی تھی۔ گھر میں بھابی آچکی تھیں۔ سبھی کے تین چار بچے تھے۔ بھابی کے ساتھ کچن میں چخ چخ رہنے لگی تو ماں نے کہا۔ ''تو گائے بھینس دیکھ لے۔''

ملتا بڑی صفائی پسند تھی۔ اپنے ہاتھوں سے طویلے کی صفائی کرتی، گائے بھینسوں کو نہلاتی، انہیں چارہ دیتی، دودھ دوہتی۔ اسے پانی بہت اچھا لگتا تھا۔ بار بار ہاتھ صاف کرتی، اپنے برتن خود دھو کر رکھتی۔ گیہوں جوار وغیرہ صاف کرتی۔ مگر چولہے کے پاس نہیں پھٹکتی تھی۔ جلدی جلدی وِلی (پاؤں درانتی) پر سبزیاں کاٹ کر رکھ جاتی۔ کبھی کبھی وہ اپنے برتنوں کے ساتھ ساتھ سارے برتن دھو ڈالتی۔ لیکن جب موڈ نہیں ہوتا تو، کہنے پر بھی کہہ دیتی ''نہیں کروں گی۔''

ملتا کی تین سہیلیاں بن بیاہی تھیں۔ فرصت میں ان سے گپیں لڑاتی، مگر شیلا، پھر مایا پھر ریکھا۔ تینوں سہیلیاں مشکل سے ہی سہی، بیاہ دی گئیں۔ اور کچھ دنوں میں اپنی گرہستیوں میں کچھ ایسی الجھیں کہ ملنا ملانا تک مشکل ہوگیا۔ ملتا کو چپ

لگ گئی۔'اِجّی' یعنی دادی کے پاس بیٹھی رہتی۔گائے بھینسوں کا کام بھی چھوڑ دیا۔ کھانا لگ جاتا تو دادی کے ساتھ رسوئی میں آجاتی اور دادی کی طرح ہی سیدھے ہانڈیوں سے برتن میں کھانا لے کر بیٹھتی، دوبارہ نہ لیتی۔ بھابھی ناراضگی سے دیکھتیں کہ کھانا بنانے میں تو نہیں آئی لیکن پروسنے بھی نہیں دیتی، خود لے گی ہونہہ! 'دادی ساس' کے ڈر سے وہ کچھ بولتی نہیں تھی۔ پھر اسے بھی اس کی عادت ہوگئی۔ کھانے کے بعد دادی مکتا کو لے کر چلی جاتیں۔

ماں مٹی کے چولہے پر پانی گرم کرتیں، کپڑے حمام میں لگاتیں اور آواز لگاتیں۔

"مکتا......"

مکتا آتی اور گرم پانی کی بالٹی اٹھا کر حمام میں چلی جاتی۔عمر کے ساتھ ساتھ مکتا میں ایک خاص قسم کی ضد آگئی تھی۔یا پھر اکیلے پن کی خواہش! دادی کی موت کے بعد تو وہ تنہائی پسند ہوگئی تھی۔بس دہلیز پر بیٹھی دروازے کی طرف دیکھ کر خود سے باتیں کرتی رہتی۔کوئی بات بار بار بڑبڑاتی اور پھر اپنے آپ سے کہتی۔

"چپ بیٹھ، تھپڑ ماروں کیا؟"

وہ دن میں کبھی نہ سوتی۔بیٹھی رہتی یا گھر میں گھومتی رہتی۔کھانا بھی وہ ذرا سا کھانے لگی تھی۔گھر میں سبزی آتی تو صاف کرنے ضرور بیٹھ جاتی۔بہنیں مائیکے لوٹتے ہوئے اس کے پیر پڑتیں، تو کہتی:

"مجھے پونا آنا ہے"۔

"چلو ناماؤسی!" بھانجے بھانجی بلاتے۔

"نہیں، بعد میں۔"، وہ ڈر جاتی۔

کسی کی شادی میں یا کسی کاج میں زبردستی لے جاتے تو گھبراتی۔

"یہاں کیوں آئے؟" گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتی تھی۔بھیڑ میں ہاتھ کس کر پکڑ لیتی۔وہ اپنی کسی پسند کا اظہار نہ کرتی۔

سویرے کے نو بجے ہوں گے۔بھابی الگنی پر کپڑے سکھا کر تہہ کر کے لائی اور ماں نے مکتا کے لیے حمام میں کپڑے لگا کر آواز دی کہ وہ آکر نہانے کا گرم پانی لے جائے۔

"میرے کپڑے مُڑا دیے، میں نہیں نہاؤں گی...... کپڑے مُڑا دیے...... میرے کپڑے......"

مکتا نے ہمیشہ کی طرح حمام میں گرم پانی رکھا تھا، کپڑے دیکھے تھے اور چلانے لگی تھی۔ماں دوڑی آئیں۔

"کپڑے مڑا دیے......میرے کپڑے......"

"آہستہ بول وہنی (بھابھی) کو برا لگے گا۔بیچاری سارا دن گھٹتی ہے۔"

"میرے کپڑے......"

"چپ کر بیٹا......چپ کر، وہنی کو......"

شاید بھابی نے سن لیا تھا۔اس کے بعد مکتا مقررہ وقت پر بھابی کے ہاتھ کے دھلے کپڑے جھٹک کر ڈالتی اور سوکھتے ہی اچھی طرح تہہ کر کے رکھ لیتی۔

ایک ایک کر کے نہ جانے کتنے برس گزر گئے۔آج بھائی ہون راؤ کی بڑی بیٹی کے لیے رشتے والے آنے والے تھے۔ماں بہو کی مدد کرنے میں پیچھے نہیں رہتیں۔شاید بیٹی کی بھرپائی کرتی تھیں۔مکتا کی دادی کے مرنے کے بعد وہ کسی بھی کام میں کیوں نہ ہوں، درمیان میں مکتا کے پاس ضرور جا بیٹھتیں......آج ماں نے سمجھا بجھا کر مکتا کو اندر، اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ناشتہ لگانے میں مدد کی۔کچھ دیر لڑکے والوں کے ساتھ بیٹھ کر، پوتی کو ان کے پاس بٹھایا اور بیٹی کے کمرے میں آگئیں......مکتا آئینے میں اپنا چہرہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

ماں نے اسے دھیان سے دیکھا۔اس نے اپنے سارے گہنے پہنے ہوئے تھے اور اپنی بھابی کی شادی کا گھونگھٹ سر پر اوڑھے ہوئے تھی۔مانگ کی جگہ پر ایک چھوٹا سا سفید گھنگھرالے بالوں کا گچھا بندیا کی طرح جھول رہا تھا۔ماں چپ چاپ پلٹ گئیں۔کمرے کے دروازے کے باہر آکر گہری گہری سانسیں لینے لگیں، پیر کانپنے لگے، لگا گر پڑیں گی۔زمین پر بیٹھ گئیں۔

"ساسو ماں!" بہو ڈھونڈتی ہوئی آئی، "کیا ہوا؟ ......اُہو!......سنو...... دیکھو تو کیا ہوا آئی کو......" ادھر سے ہون راؤ، اُدھر سے مکتا ماں کے پاس دوڑے آئے۔ماں نے مکتا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔وہ ویسی ہی سیدھی سادی چھ گز کی عام عورتوں کے پہننے والی شوخ گلابی رنگ کی پھولوں والی ساڑی میں لپٹی تھی۔بدن پر زیور تھا نہ گھونگھٹ۔پھر وہ سچ تھا کہ خیال!......ان کی کپکپی زور پکڑ رہی تھی۔

"جا کھانا کھا کر آ"، اس حالت میں بھی ماں کو سرہانے بیٹھی ٹکٹکی لگائے اپنے کو دیکھ رہی مکتا کی فکر تھی، لیکن اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر پانچ بجے آئے گا، شہر گیا ہے۔" ہون راؤ دوڑ کر پتہ کر آیا، "ایک گھنٹہ ہے۔"

"ساسو بائی، خود کو سنبھالیے۔" بہو نے ان کے پیروں کی مالش کرتے ہوئے کہا۔

"تو نے کھایا سون بائی؟" انہوں نے بہو کو پوچھا۔

"ہاں ساسو ماں" بہو نے مکتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اِس کا من ٹھیک نہیں۔ٹھیک لگے گا تو لے لے گی......ہو سکے تو بیٹی کے ہاتھ سے اِسے دودھ بھجوا دو۔" مکتا نے انکار میں سر ہلایا، تو بولیں، "ٹھیک ہے۔نہیں لائے گی......تُو گھبرا مت......میں تیرے مرنے کے بعد ہی مروں گی۔" بستر پر پڑی تیز بخار میں وہ بڑبڑا رہی تھیں......ان کی حالت دیکھ کر سب رو رہے تھے۔

ماں ٹھیک ہوگئیں مگر ان کے پیر اکڑ گئے۔کھڑی نہیں ہو پاتی تھیں۔گھر بھر میں گھسٹتی پھرتیں۔لیکن بہو کی مدد کرنے میں بیٹھے بیٹھے جو کر سکتیں، کرتیں۔پیروں کی مجبوری کم ہی آڑے آتی۔بہو بہت کہتی۔

"بیٹی مدد کر دے گی۔"

"نہیں، پڑھنے دو میری پوتی کو۔اس کی شادی کے دن دور نہیں۔" وہ بڑے پیار سے کہتیں اور بہو مسکرا دیتی۔ماں بوڑھی ہوگئی تھیں۔بابا بھی لکڑی ٹیکتے تھے۔کھیت پر کم جاتے۔مزدور، کسان گھر آکر آنگن میں بیٹھتے۔حساب دیتے، گپیں لڑاتے۔

ماں کتنی بار بیمار ہوئیں اس کی گنتی کیا! ہر بار اٹھ بیٹھتیں۔ ہر بار کہتیں۔

"مکتا کو چھوڑ کر نہیں مر سکتی۔"

کچھ دنوں سے مکتا نے بھی ہانڈیوں سے کھانا لینا چھوڑ دیا تھا۔ بس چمچ بھر چاول اور دال لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ کھانا کھا کر اپنے برتن دھو کر کونے میں رکھ دیتی۔ صرف دوپہر میں کھانے لگی تھی۔ رات میں ماں گھسٹتی ہوئی آتیں اور دودھ پلا جاتیں۔ گدرایا بدن دھیرے دھیرے ہڈیوں کا ہار دکھائی دینے لگا۔

مکتا اب دو دنوں میں ایک بار کھانا کھانے لگی تھی۔ اس کے باقی روزمرہ کے کام برقرار تھے۔ صبح کے کاموں سے نپٹ کر وہ اپنی پسندیدہ دہلیز پر جا بیٹھتی۔

آج ہبن نے مکتا کو پچیس سال بعد دیکھا تھا۔

ویسی ہی، بالکل ویسی ہی سندر اور معصوم۔ لال پھولوں کی ساڑی، سونے کی چوڑیاں، گلے میں چین، کانوں میں موتی کے پھول۔

"پہچانا؟...... میں ہبن...... پڑھائی کے لیے امریکہ گیا تھا نہ، وہیں بس گیا تھا۔ پچیس سال بعد آیا ہوں...... تم تو بالکل ویسی ہی ہو۔"، اس نے اپنی خوشی بھری ہنسی دبائی۔ مکتا نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ آنکھیں مسکرائیں، پھر شانت اور انجان ہو گئیں۔ وہ اپنی ساڑی کے پلو میں چھپا کر اپنی انگلیاں گننے لگی۔ ہبن وہیں رک کر اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ سر کھجانے لگی۔

"پتنی بھی آئی ہے۔ کل لاؤں گا ملانے۔"

"چل ہٹ"، مکتا نے پاس پڑا اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر پھینکا۔ ہبن کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔

"سالی......! آئی ایم ساری۔ آئی ایم ساری......"

"معاف کر بیٹا، یہ باؤلی ہوئی ہے، تو برا مت ماننا۔" مکتا کی ماں گھسٹتی ہوئی آئیں۔

"اندر آ جا پٹی کرتی ہوں۔ ماتھے سے خون بہہ رہا ہے۔"

"کاکی آپ کے پیروں کو کیا ہوا؟"، انہیں گھسٹتے دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔ مگر پھر اچانک پیشانی کی چوٹ سے بہتے خون اور شرمندگی کا خیال آیا اور ـــ "کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں۔" کہتا ہوا جواب سنے بغیر ہی ہبن وہاں سے چلا گیا۔

شام گہرا گئی تھی۔ مکتا کی ماں سرہانے بیٹھی اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔ صبح سے وہ کچھ بولی نہ ہلی ڈلی۔ کئی دنوں سے اس کا کھانا بند تھا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر بولیں۔

"ہون راؤ دیکھ تو، دیدی ٹھیک تو ہے؟"

"آئی! دیدی تو ٹھنڈی ہو گئی"، ہون راؤ ناڑی دیکھ کر بولا۔

"جا بابا کو بتا دے"، انہوں نے اتنی شانتی اور بغیر کسی تناؤ کے ہون راؤ سے کہا تو وہ تڑپ کر ماں کے گلے لگ گیا۔

مکتا کو مرے آج تیرہ دن ہوئے تھے۔ پورا گاؤں کھانا کھا کر گیا تھا۔ ماں بخار سے تپ رہی تھیں پھر بھی ہاتھ میں جھاڑو لیے صفائی کر رہی تھیں۔ بہو ہاتھ سے جھاڑو لینے لگی تو پیار سے ڈانٹا۔

"کیا سکھ اٹھایا تو نے بھی! ہم بلاتے تھے مگر تجھ پر بوجھ نہیں ڈالنا تھا نہ، اس لیے میں نہیں گئی" انہوں نے ہنس کر بہو کو گلے لگا لیا۔

اگلی صبح گاؤں والوں کو پھر اسی گھر میں جمع ہونا پڑا۔

مکتا کی ماں نہیں رہی تھیں۔

ہبن پنڈھر پور کی یاترا کے لیے لکڑی کی ڈنڈی (پالکی) میں وٹھل کی مورتی کو سجا رہا تھا۔

"تو، تو اسے پسند کرتا تھا لیکن مکتا تو تیرے سے پیار کرتی تھی۔"

"کیسے معلوم؟؟؟"، ہبن نے سوچا 'آج ماں کو کیا ہو گیا ہے!'

"وہ بولی تھی میرے کو، ایک بار...... اپنے کھیت میں آئی تھی پوچھنے کو کہ......"

"کہ؟"، ہبن راؤ کی بے چینی ماں سے چھپی نہیں رہی۔

"کہ میرا کیا دوش ہے؟؟"

"پھر؟"

"میں بولی پورے رشتہ داروں کو معلوم ہے تجھے ماہواری نہیں آئی۔ کتنی جڑی بوٹیاں ہضم کر گئی۔"

"اب اس میں میرا کیا دوش!!"

"پھر!!!" ہبن نے پوچھا۔

"وہ پلٹ کر جانے لگی تھی تو میں نے اسے روکا اور بولی۔

"سن بیٹا، کسی کو معلوم نہیں ہوتا یا ہم دوسرے گاؤں کے ہوتے تو اور بات تھی۔ اب لوگ پوچھیں گے نہ کہ تیرے بیٹے میں کیا دوش تھا کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی۔"

ممبئی سے پنڈھر پور جانے والی ٹولیاں لیزم بجاتی نرم سخت دھوپ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سر پر پھینٹا باندھے، لکڑی کی ڈنڈی میں وٹھل کی مورتی کو لیے پندرہ دنوں کی جترا میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ پونے، بارامتی، اندا پور روڈ کے راستے سے یہ ٹولی شولہ پور روڈ چھوڑ کر پُونے ضلعے کے آخری گاؤں باوڑہ کے لیے بڑھی ہے۔ ہر سال ہبن کی ماں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ آشاڑھ اور کارتک کے مہینوں میں وٹھل رکمائی (کرشن رکمنی) کے درشن کرنے پیدل جاتی ہیں۔ اس بار فرق صرف اتنا تھا کہ باوڑہ میں امریکہ رٹرنڈ ہبن راؤ اپنی آئی اور بیوی کی ضد پر انہیں لیے ٹولی کے ساتھ شامل ہونے کو کھڑا تھا۔ کچھ لوگ سر پر پینے کے پانی کی کلسیاں اور تلسی کا پودا بڑی عقیدت سے اٹھائے ہوئے تھے۔

"اگلی بار تبھی آؤں گی جب میری منوتی پوری ہو گی۔" ہبن کی آئی اپنی بہو کے لیے منت کرنا چاہتی تھیں، "ہے وٹھل پانڈورنگ! میری سون کی گود بھر دے۔"، اپنے سر پر گملے میں تلسی کا پودا اٹھائے انہوں نے شردھا سے کہا تھا اور وہ، "ہری وٹھل، ہری وٹھل، ہری وٹھلا" کا جاپ کرنے لگ گئیں۔

راجدیو کی امرائی

صادقہ نواب سحر

☆رات،خواب ماں کے

''آج میں تمھیں ایک کہانی سناتی ہوں۔'' رات کھانا کھانے کے بعد ماں بچوں کے بستر میں تھیں۔

''چپلون تعلقہ سے دس کلومیٹر اونچائی پر 'شیتر پرشورام' نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک برہمن بھکشو پنڈت رام داس جوشی' کا گھر تھا۔''

''یہ تو ہمارا گاؤں ہے!'' چھوٹے نے پوچھا۔

''بیچ میں بولے تو کہانی ختم۔ ہاں گاؤں۔ گاؤں کیا تھا ،بغیچہ سا تھا۔تقریباً پچاس ساٹھ گھر ہوں گے۔ رام داس کے گھر پر گھاس کا چھپر تھا۔ پہاڑی پر آباد گاؤں کے گھر الگ الگ سطح پر تھے۔ اکثر گھروں میں بڑی غریبی تھی۔رام داس جوشی اپنی مفلسی سے تنگ تھا۔

''چاہتا ہوں بیٹا لکشمن پڑھ لکھ کر کوئی اور کام کرے۔ پنڈتائی نہ کرے۔مجھ سے اب دور جانا بھی نہیں ہوتا۔'' پنڈت نے بیوی سے کہا،''میں خود تو اسکولی پڑھائی پڑھ نہیں پایا۔چھوٹے سے گاؤں میں پنڈتائی چلے بھی تو کتنی!''

''کہنا کیا چاہتے ہو؟'' پنڈتائن سمجھ گئی،''کس بات کی تمہید باندھ رہے ہو!''

''نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔''

آج آپ کا انداز کچھ الگ سا ہے!'' پنڈتائن سمجھ گئیں کہ ہو نہ ہو یہ کسی بات کا تمہیدی لہجہ ہے۔

''کلکتے سے چھٹی پر بھولا رام کا لڑکا گاؤں آیا ہے نا!''

''ہاں ہاں!''

''وہ لکشمن کو کلکتہ بلا رہا ہے۔'' پنڈتائن ان کا اور بیٹے کا چہرہ تک رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور بیٹے کا کان اینٹھا۔

''کیوں رے! بابا کے ساتھ مل کر سب کچھ طے کر چکا ہے نا!! سچ سچ بول!! کون ہے جو تجھے بلا رہا ہے؟''

''چندر بولتا تھا ،میرے ساتھ چل۔ میں کام پر لگا تا ہوں۔کلکتے میں۔وہاں ریلوے کلرک کی نوکری کا اشتہار لگا ہے۔تُو تو میٹرک پڑھا ہوا ہے۔'' لکشمن ماں کا ہاتھ اپنے کان سے ہٹاتے ہوئے بولا۔''بابا نے تو فوراً اجازت دے دی لیکن تجھے ماں،تجھ کو منانا تو بڑا کام تھا نا!'' پنڈتائن کی آنکھیں چھلچھلا گئیں۔ بس یہیں سے ان کے پریوار کے دن پھر گئے۔لکشمن دھیرے دھیرے ترقی کرتے ہوئے مغربی ریلوے کا چیف بن گیا اور کئی جگہ تبادلہ ہوتے ہوئے ممبئی میں بس گیا۔وہ وہاں کے گنجان آبادی والے گرگاؤں علاقے میں رہتا تھا۔لکشمن نے کئی بار اپنے ماں باپ کو ممبئی بلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔وقت تیزی سے گزرتا رہا۔

لکشمن کے دو بیٹے تھے۔بڑا بیٹا راگھو ممبئی کے گرینڈ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس تھا۔ پڑھائی کے درمیان اس کی شادی ایک رئیس پلمبنگ ٹھیکیدار اور بزنس مین ،جس کے ہاتھ میں سات آٹھ چھوٹے کانٹریکٹر تھے، کی پڑھی لکھی بیٹی سے کر دی گئی تھی۔

لکشمن کا دوسرا بیٹا بھاویش بائیس سال کا لاابالی سا لڑکا تھا۔ چہرے پر چیچک کے گڑھے گورے رنگ میں بھی نمایاں تھے۔

''آپ کے پڑوس کے گھر میں انکم ٹیکس آفس کے کلرک رہتے ہیں۔''، کسی نے خیال دلایا،''ان کی ایک بیس اکیس سال کی اونچے قد کی لڑکی ہے۔جب سترہ سال کی تھی، روٹی بناتے وقت پھونکنی سے لکڑی کے چولھے میں پھونکا۔چنگاری اُڑی۔بایاں پیر جھلس گیا۔چال میں ہلکا سا فرق ہے۔یوں دیکھنے میں پیر کا عیب پتہ نہیں چلتا۔ساتویں کلاس پڑھی ہوئی ہے۔چاہو تو اپنے بھاویش کے لیے مانگ لو۔''

سرسوتی دلہن بن کر لکشمن کے گھر آ گئی۔

ملک کی تقسیم نے بڑا نقصان کیا ہے۔ملک کی آزادی کے بعد کے دنوں میں جو خون بہا، وہ ناحق ہی بہا۔بڑے شہروں میں ملک بھر سے کام دھندوں کے لیے آئے ہوئے لوگ ذات پات بھید بھاؤ کے چکروں سے دور میل ملاپ سے رہتے تھے۔اس وقت ہر مذہب، ذات اور صوبے کا مقصد آزادی ہی تھا۔پھر دھرم، ذات اور صوبوں میں کیوں بٹ گیا تھا۔مجھے لگتا ہے، ساری لڑائی وزیر اعظم بننے کی تھی۔اتنا اچھا نقشہ تھا ہمارا۔کلاسیکی گلوکار وسنت راؤ دیشپانڈے ، راہل دیشپانڈے لاہور کے تھے لیکن ۱۹۴۸ کے ہندو مسلم دنگوں نے لکشمن کو ایسا جھٹکا دیا کہ اس نے اپنا فلیٹ اونے پونے داموں میں فروخت کر کے کوکن لوٹنے کا منصوبہ بنا لیا۔نوکری سے رٹائرمینٹ لے کر شیتر پرشورام اپنے آبائی گاؤں میں جا بسا۔

''اُہو! گھاس کے چھپر والے گھر کو ٹین کی چھت ڈال دیتے ہیں نا!'' ماں باپ کے انتقال کے بعد لکشمن کی بیوی نے التجا کی۔

''اس چھت میں تو میرے بچپن کی یادیں بھری پڑی ہیں۔''، لکشمن کا دل تڑپا لیکن اس نے بیوی کی خواہش پوری کر دی۔

چپلون ایک ہرا بھرا شہر ہے نا! چاروں طرف کاجو، آم، کٹھل، اناس کے باغوں اور چاول کے کھیتوں میں ہمیشہ ہریالی رہتی ہے ۔لکشمن نے اپنے پروویڈینٹ فنڈ کے پیسوں سے اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لیے یہاں ڈسپینسری کھول دی۔ڈاکٹر راگھو کی ڈسپینسری کے پاس ہی لکشمن نے چھوٹے بیٹے بھاویش کو کیمیسٹ کی دکان کھول کر دی تھی۔بھاویش نے بارہویں کے بعد فارمیسی کا ڈپلومہ

کیا تھا۔ڈاکٹر نسخہ لکھ کر بھائی کی دوکان پر بھیجتا۔دونوں سکھ کی زندگی گزارتے۔

بھاویش صبح سویرے چپلون اپنی دوکان پر جاتا۔رات کو گھر لوٹتا۔دوستوں میں گپیں لڑاتا۔سگریٹ پھونکتا۔پورے گاؤں کا چکر لگاتا۔اس کی بیوی کھانا بناتی،گھر اور بچے سنبھالتی۔لکشمن اور اس کی بیوی پرشورام گاؤں میں کھیتی کی دیکھ بھال کرتے اور اس زندگی کا مزہ لیتے۔گاؤں میں ایسی عورتیں مل جاتی تھیں جو چھاچھ پانے کے لیے ان کے گھر کی بالائی سے مکھن نکال دیتی تھیں۔کھانے اور کپڑے کے بدلے گھر اور کھیت کا کام کردیتی تھیں۔وہ کبھی کبھی بڑے بیٹے کے پاس چپلون آتے تو گھی،لڈو،بڑیاں وغیرہ لاتے۔کچھ سال بہت خوشی اور اطمینان سے گزر گئے۔پھر لکشمن کو ذیابیطس کی بیماری ہوگئی۔ڈاکٹر بیٹے نے علاج کیا مگر بیماری بڑھنے سے بائیں ہاتھ میں گینگرین ہوگیا تھا۔بائیں ہاتھ کو کہنی کے اُوپر سے کاٹ دینا پڑا تھا۔آستین میں ان کا جھولتا ہاتھ دیکھ کر گاؤں کے لوگ پریشان ہوتے تھے اس لیے لکشمن نے ایک نقلی ہاتھ لگوالیا اور ہمیشہ پورے آستین کے کوٹ پہننے لگا۔

ڈاکٹر راگھو کا ایک بیٹا تھا جیون۔چار سال کی عمر میں اسے دماغ کی ٹی۔بی۔ Meningitis ہوگئی۔آٹھ سال کی عمر میں مر گیا۔ڈاکٹر راگھو کو اپنے چھوٹے بھائی بھاویش سے بڑی محبت تھی۔لکشمن نے اپنے آخری دنوں میں ڈاکٹر راگھو سے وعدہ لیا کہ وہ چھوٹے بھائی کا خیال رکھے گا۔

"کمی ہوئی تو مدد کروں گا۔" اس نے کہا تھا۔

ڈاکٹر راگھو کے ہاتھ میں بڑی شفا تھی۔بیماری کو وہ جھٹ سے پہچان لیتے تھے۔ضرورت پڑنے پر مریض کو فوراً ٹیکسی سے اسپتال پہنچنے کی صلاح دیتے۔کبھی کبھی اپنی گاڑی سے اس کے ساتھ بھی چلے جاتے۔

لکشمن کے انتقال کے بعد ان کی کھیتی اور جائیداد دونوں بھائیوں میں بٹ گئی۔ماں نے سونا اور چاندی دونوں میں برابر بانٹ دیا۔ڈاکٹر راگھو سے بھاویش دس سال چھوٹا تھا۔چھبیس سال کی عمر میں پیسہ آیا۔سیٹھ بن گیا۔بڑے بھائی کا دباؤ بھی نہ کے برابر رہ گیا۔جیسے چاہوں جیوں،کچھ بھی کروں،والا رویہ آگیا۔

اسپتال کے پاس ہی ایک بنگلہ بک رہا تھا۔ڈاکٹر راگھو نے اسے خرید لیا۔اب وہ چھوٹے بھائی کی دوکان سے کچھ دور ہوگیا تھا۔

بھاویش صبح پچاس سگریٹ لاتا،شام تک ختم ہوجاتیں۔مزاج کا نرم تھا۔

"کوئی مدد چاہیے تو کہنا۔" جس نے میٹھی بات کی،تعریف کی،خود کہتا،

"لڑکی کی شادی ہے۔دوسو روپیوں کی ضرورت ہے۔لوٹا دوں گا۔"

"سیٹھ بھینس خریدنی ہے۔تھوڑا مدد کرونا سیٹھ۔"

"ضرورت ہے لے لو۔جب بھی مرضی ہو لوٹا دینا۔"

بھاویش رتناگری ضلع تعلیمی بورڈ کا ممبر بنا۔پھر الیکشن میں کھڑا ہونے لگا۔کبھی جیتا کبھی ہارا۔ایک بار کاؤنسلر بنا۔دواؤں کی دوکان پر دھیان کم رہنے لگا۔سیاست کے چکر میں دو دو چار چار دن رتناگری جا کر رہتا۔نوکر دوائیں بیچتے اور پیسے جیب میں ڈال لیتے۔

"آج اتنا ہی بکری ہوا سیٹھ۔"

مریض چٹھی لاتے تو نوکر کہتے،"چار آٹھ دن بعد ملے گا۔" جبکہ دوکان میں مال بھرا رہتا۔کبھی کبھی سال بھر سے کوئی دوا ختم ہوئی ہوتی۔لیکن سیٹھ کو خبر تک نہ ہوتی۔

"دھیرے دھیرے دوکان پر گراہکوں کی کمی ہوتی چلی گئی ہے ، بھائی!" مال سے خالی خالی دوکان اور مریضوں کی کمی سے پریشان ہوکر بھاویش بڑے بھائی سے ملنے گیا۔

"میں ان کو تیرے پاس کیوں بھیجوں؟ تیرے پاس مال نہیں ملتا۔تیرے آدمی گراہک کو دوسری جگہ بھیجتے ہیں اور وہاں سے کمیشن کھاتے ہیں۔" بھائی بھڑک کر بولا۔بھاویش چپ چاپ گھر لوٹ آیا۔وہ بڑے بھائی کا ادب کرتا تھا اور پھر نوکروں پر کتنا بھروسا تھا اسے!

☆ہیرے کی انگوٹھی

"تیری ہیرے کی انگوٹھی دے دے۔" گھر پہنچتے ہی بھاویش سرسوتی کے پاس گیا اور بولا۔وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔اٹھ کھڑی ہوئی۔ماتھے کی سرخ بندی چہرے کی سرخی سے میل کھانے لگی۔آٹے کی لوئیاں انگلیوں کے پوروں سے جھڑنے لگیں۔اسے خبر نہیں ہوئی وہ تو شوہر کا منہ تک رہی تھی۔چند لمحوں میں اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔آٹے کے پیڑے بنائے۔پھلکے سینکے۔کھانے کی تھالیاں سجائیں اور پیڑھوں کے سامنے رکھ دیں۔

"ہیرے کی انگوٹھی دے دے۔" بھاویش نے دوبارہ بات شروع کی۔

"نہیں۔"

"نہیں دوں گی؟"

"نہیں دوگی؟"

"بالکل نہیں۔وہ میرا استری دھن ہے۔"

"نہیں دی تو خودکشی کرلوں گا۔"

"تمھارے بابا کا ہی ہے۔میرا کیا جاتا ہے!"

سرسوتی نے ہاتھ کا روٹی کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھ دیا۔گود میں بیٹھے پانچ اور دو سال کے بیٹوں راج دیوا اور کرن کو پاس کے پیڑھے پر بٹھایا اور یہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی،

"کھانے کی تھالی پر سے نہیں اٹھتے!"، بھاویش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

وہ ایک دم چپ تھی۔"آج بھی ہمیشہ کی طرح میں تجھ سے زیور مانگنے آگیا نا!" وہ شرمندہ تھا۔

"دس سال اس طرح نکل گئے۔تولے تولے سونا بھی چلا گیا۔بس یہ ایک ہیرے کی انگوٹھی رہ گئی ہے، بڑوں کی آخری نشانی۔اسے لے جاؤ۔اس کا جو کرنا ہو، سو کرو مگر میرے گھر میں کوئی مانگنے نہ آئے کہہ دینا ہے۔"

''باپ کی آخری چیز بیچنا نہیں چاہتا۔'' وہ جذباتی ہو گیا تھا۔''میں کچھ کرتا ہوں....تو ایسا کر....بیٹے کے ساتھ بھیا کے پاس یہ انگوٹھی بھیج دے کہ،''پانچ ہزار دے دو۔''، لکھ دے کہ،''پیسے جمع ہو گئے تو انگوٹھی واپس لے لوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' سرسوتی شانت تھی۔

گھر میں ایک پرانا ایماندار نوکر تھا۔سرسوتی نے اس سے کہا،''راج دیو کو ساتھ لے جا،اس کی تھیلی میں میری ہیرے کی انگوٹھی اور چٹھی رکھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو دینا۔''

''بہو کو دے دو۔'' ڈاکٹر راگھو نے چٹھی پڑھ کر پانچ ہزار روپے نوکر کے ہاتھ میں دے دیے،''پہلے میرے سامنے گن لو۔لو پہلے تاک (جھانچھ) پی لو۔''

''مال لینے بمبئی جا تا ہوں۔'' دروازے میں کھڑے نوکر سے پیسے لے کر بھاویش نے سرسوتی سے کہا۔

ممبئی کے گنجان علاقے ،گرگاؤں میں دواؤں کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں۔یہیں بھاویش کو ایک دوست ملا۔''اچھا ہوا یار تو یہیں مل گیا۔میں نے پانچ ہزار تجھ سے لیے تھے،یاد ہے یا نہیں؟ لے اب لوٹا رہا ہوں۔''

بھاویش کو کچھ کچھ یاد آیا،یہ شخص چپلون میں زمین کا سودا کرنے آیا تھا۔پیسے کم پڑ گئے تھے۔ممبئی جا کر لوٹانے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔پھر نہ لوٹا نہ کوئی چٹھی بھیجی۔

''لے انگوٹھی چھڑا لے۔'' بھاویش نے گھر لوٹ کر پانچ ہزار روپے سرسوتی کے ہاتھ میں رکھ دیے۔

سرسوتی کو اتنی خوشی ہوئی تھی کہ وہ یہ پوچھنا بھی بھول گئی کہ''یہ پیسے آئے کہاں سے؟'' سیدھے رسوئی میں گئی۔سوجی کا حلوہ بنایا۔بولی،''ہمارے اچھے دن آ گئے۔''

دوکان پھر سے چلنے لگی۔ڈاکٹر بھائی مریض بھیجنے لگے۔

''اب حالات سدھر گئے ہیں لیکن تم بھی محسوس کرتے ہو گے کہ دوکان میں تمھارا دھیان نہیں ہے۔'' ایک دن سرسوتی نے شوہر کا موڈ دیکھ کر کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''جلدی سامان لانے نہیں جاتے۔نوکروں پر دوکان چھوڑ کر دوستوں میں گپ شپ کرتے رہتے ہو۔'' وہ مسکرایا۔

''سچ کہا ہے بزرگوں نے۔عورت کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی،کچھ بھی کر لو۔'' بھاویش اس کی مسکراہٹ میں پگھل گیا۔

''یہ سچ نہیں ہے۔''، سرسوتی کا دل کھل گیا،''تم بھی جانتے ہو۔'' شوہر ہنسنے لگا۔

''اچھا! کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟'' بھاویش نے بیوی کے گلابی چہرے پر گر آئی لٹوں کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے ہٹایا۔

''آپ کی انگریزی اور حساب بہترین ہیں۔ٹیوشن کلاسوں کا فیشن چلا ہے۔بھائی صاحب سے بات کر لیجیے۔اس جھنجھٹ سے نکل جائیے۔''

''بھئی،تم کو جو کام کرنا ہو تم کرو۔'' بڑے بھائی نے جواب دے دیا اور بھاویش کو بھی لگا،صحیح ہے۔بھیا کا گھر بڑا ہے۔پیسے والے ہیں۔دل بڑا ہے لیکن اپنے پریوار کا خیال رکھنا میرا ہی فرض ہے۔دوکان بند کی۔پرشورام شیتر گاؤں کے گھر پر تالہ لگایا۔چپلون میں تین کمروں کا گھر چھبیس روپے کرائے پر لیا۔پیچھے کا کمرا خوابگاہ تھا۔درمیان میں باورچی خانہ تھا۔سامنے کے حصے میں کلاس چلتی۔آج جیسا ٹیوشن اور کلاسیس کا زمانہ نہیں تھا۔فیس بہت کم تھی۔پانچ روپے مہینہ۔بھاویش کے پڑھانے کا ڈھنگ دیکھ کر دھیرے دھیرے پچیس بچے جمع ہو گئے۔اگلے سال ایسی دو بیچ اور تیار ہو گئیں۔کلاسیں بہت چلتی تھیں۔بہت نام ہو گیا تھا۔بھاویش نے بہت محنت کی مگر دل میں کچھ تھا،جو کھٹکتا رہا۔ایک دن انھیں اچانک خون کی قے شروع ہوئی۔بھائی نے اپنے اسپتال میں ایڈمٹ کرا لیا۔دوست احباب پوچھنے آئے۔

''برین تھرامبوسس Brain Thrombosis ہو گیا۔'' ڈاکٹر راگھو نے کہا۔

''وہ کیا ہوتا ہے۔؟''

''اوکے۔'' گاؤں والوں کی سمجھ کو سمجھتے ہوئے ڈاکٹر راگھو نے ٹالا، ''دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔''

ڈاکٹر راگھو کے لیے اس بیماری کو ہر ایک کو سمجھانا مشکل ہو گیا تو اسے دل کا دورہ کہہ دیا۔اس پر بھی لوگوں کی تسلی نہیں ہوئی تو بولے۔''زہر کھا لیا ہے۔''

''زہر کھا لیا ہے!'' لوگوں نے کہنا شروع کر دیا۔

''نہیں نہیں۔'' کسی نے کہا''شراب پینے سے جگر خراب ہو گیا ہو گا!'' ڈاکٹر راگھو اس کا منہ دیکھنے لگے۔

بھاویش اسپتال سے گھر آ گیا تھا۔بڑے بیٹے راج دیو کے دسویں کے سہ ماہی امتحان چل رہے تھے۔بیماری کے چلتے کلاس میں پڑھانے کے لیے ایک نوجوان ٹیچر رکھا گیا تھا۔ٹیچر طلباء کے حساب کے پیپر ہاتھ میں لیے بھاویش سے کچھ دیر گفتگو کرتا رہا۔پچھلے کئی دنوں سے وہ رسوئی میں ایک کھاٹ پر پڑا رہتا تھا۔ٹیچر کے اٹھ کر جانے کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر بھاویش نیم وا آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔

''بابا! مجھے ایک حساب کا سوال....'' کچھ دیر بعد راج دیو ان کی پائینتی آ کر بیٹھ گیا۔

''بیٹا نیند آ رہی ہے۔تم باہر جاؤ۔تھوڑی دیر کھیل لو۔تازہ دم ہو جاؤ گے۔بعد میں دیکھیں گے۔''

شام کے پانچ بجے جب راج دیو کھیل کے میدان سے لوٹ کر گھر پہنچا تو دیکھا کچھ لوگ باہر کھڑے تھے۔اندر گیا۔

''دیو تیرے بابا نہیں رہے۔'' سرسوتی نے کہا۔اس وقت دو سال کا چھوٹا ویراس کی کمر پر ٹنگا ہوا تھا اور منجھلا کرن اس کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑ رہا تھا۔

بھاویش کو اسپتال سے گھر لا کر رات کے گیارہ بجے انتم سنسکار کے لیے لے جایا گیا۔ بڑے بیٹے کے علاوہ بچوں کو شمشان بھومی نہیں لے گئے تھے۔

اگلے دن ڈاکٹر راگھو بھاویش کے گھر آئے۔ دونوں چھوٹے بچے سہمے ہوئے ماں کو چپکے بیٹھے تھے۔ راج دیو پاس بیٹھا اپنے بڑے پاپا کی خشک اور سرخ آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''اب یہاں اکیلے نہیں رہنا ہے۔ تینوں میرے بنگلے میں ہی رہو گے۔ میں پڑھاؤں گا۔'' ڈاکٹر راگھو نے بچوں کو سینے سے لگالیا۔

سرسوتی اپنے بچوں کے ساتھ چھوٹے سے گھر سے بڑے بنگلے میں آ گئی۔ بنگلے کے نچلے حصے میں کھانا بنتا تھا۔ سونے کے کمرے اوپر تھے۔ تیرہ دن خاموشی سے گزر گئے۔

''بازار سے سبزی لے آؤ۔'' بھاویش کے تیرہویں کے بعد کاکی نے سرسوتی سے کہا،''اور وہ رہا گیہوں کا ڈبہ۔ صاف کر کے پسوالینا۔''

سرسوتی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''چکّی تو جانتی ہو کہاں ہے؟ تم ہی جاتی تھیں نا پسوانے اپنے گھر میں؟''

''نوکر ہے۔۔۔ مگر کچھ کام تو چاہیے نا تمھیں بھی! کھلاتی ہوں۔ بچوں کو پڑھاتی ہوں۔'' وہ جیٹھانی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جو بنی سنوری، لمبے سے سونے کی دو کٹوریوں والے منگل سوتر میں انگلیاں پھنسائے پھنسائے بول رہی تھیں۔

''تم نے شوہر کو زیور دیا۔ اس لیے یہ حال ہوا۔ احساس ہے؟'' سرسوتی چپ چاپ سنتی رہی۔ بچوں کو بھی آنکھوں کے اشارے سے چپ کراتی رہی۔

اگلے دن جیٹھانی نے اپنی بات صاف کی۔ اس بار ان کی آواز میں نرمی تھی۔

''سبزی لانا، گیہوں، چاول، موٹا اناج چکی سے آٹا پسوا کر لانا، بیسن، روے کے لڈو، چوڑا چکلی، شام کا ناشتہ تیار کرنا بھی تمھارا کام ہے۔ تمھارے بچے ہیں۔ شام کو ناشتے میں کھائیں گے۔ پھر ڈاکٹر کے مہمان بھی آتے رہتے ہیں۔'' جیٹھانی کی بات سن کر سرسوتی نے سر ہلایا اور اسے ہمیشہ نبھایا۔ پرشورام شیٹر سے خریداری کے لیے چپلون جانا پڑتا تھا۔

دال، بھاکری یعنی چاول کی روٹی، گیہوں کی چپاتی۔ جوار، باجرے کی روٹی یا پوری، دو قسم کی سبزیاں، اصلی گھی، چٹنی، پاپڑ اور کبھی کبھی ڈھوکلا بھی کھانے میں شامل ہوتا۔ پورا کھانا بنانے کے لیے، صاف صفائی کرنے کے لیے، کپڑے دھونے کے لیے صبح صبح کام والیاں آ جاتی تھیں۔ سلاد سرسوتی تیار کرتی۔ سب کو کھانا پروسنے، چائے، ناشتہ دینے، سامان کا خیال رکھنے کی ذمہ داری ہمیشہ اسی نے اٹھائی۔

جیٹھانی کی سہیلیاں کبھی کبھی رمی کھیلنے آتیں۔ ناشتہ وغیرہ کا بندوبست سرسوتی کرتیں۔

سرسوتی ساتویں پڑھی ہوئی تھی۔ اس کی مراٹھی بہت اچھی تھی۔ فرصت کے وقت مہابھارت، رامائن، گیانیشوری، داس بودھ جیسی پوتھیاں پڑھتی۔ اس کی تحریر بہت خوبصورت تھی۔ سرسوتی مالا کا جاپ کرتی۔ کبھی کبھار عورتوں کی بھجن منڈلی میں بھی جاتی۔ مندر بھی جایا کرتی۔ ورت رکھتی۔ ورت تو جیٹھانی بھی رکھتی تھی۔ کہتی،''جتنا کم کھاؤ گے اتنی لمبی عمر پاؤ گے۔'' جیٹھانی بھگوان کو زیادہ نہیں مانتی تھی۔ وہ پوجا پاٹ نہیں کرتی تھی۔ سرسوتی ہمیشہ نو واری ساڑی پہنتی۔ جیٹھانی تیوہاروں کے علاوہ ہمیشہ پانچ واری ساڑی پہنتی۔ عام طور پر وہ ناک میں ہیرے کے لونگ پہنتی۔ تیوہار میں موتی کی نتھ پہنتی۔ سرسوتی کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن، گلے میں چین اور کانوں میں بُندے ہمیشہ رہتے تھے۔ بھاویش کے بعد اس نے کانچ کی چوڑیاں پہننا چھوڑ دیا تھا۔ سب اٹھا کر رکھ دیا۔

سرسوتی بادام یا زعفران کا شربت بناتی یا چینی کا گرم میٹھا سوکھے میوے ڈالا ہوا دودھ مہمانوں کو پلاتی۔ ڈاکٹر راگھو بھتیجوں کے لیے ڈھیر سارے پٹاخے خرید لاتے۔ پوراپریوار دوستوں کے ساتھ انھیں جلاتے ہوئے دیوالی مناتا۔

شوہر کی وفات کے بعد سرسوتی نے پروگراموں میں جانا بہت کم کر دیا تھا۔ سالگرہ اور دوسرے تیوہاروں جیسے ہلدی، کم کم جن میں ماتھے پر ٹیکا لگایا جاتا ہے، میں نہیں جاتی تھی۔

کوکن میں ہولی کا تیوہار کم منایا جاتا ہے۔ گھر میں دیوالی اور چتر تھی ہی منائی جاتی تھی، چھوٹے بڑے تیوہاروں میں اور خاص طور پر ایکادشی، چترتھی تیوہاروں کے علاوہ سوموار کو بھی دونوں عورتیں ورت رکھتی تھیں۔

''ماں تم پندرہ دن کھاتی ہو۔ پندرہ دن بھوکی رہتی ہو۔'' لڑکے مذاق کرتے۔

ڈاکٹر راگھو کی بیوی بہت زندہ دل تھیں۔ چپلون میں کوئی ڈرامہ کمپنی آتی تو وہ ضرور دیکھنے جاتیں۔ دونوں میاں بیوی ہر سال ہندوستان کے کسی نہ کسی کونے میں گھومنے جاتے۔ ڈاکٹر کو کار سے گھومنا پسند تھا۔ ڈرائیور بھی ساتھ لے جاتے۔ چپلون کے آخری دنوں میں انھوں نے یوروپ کا ٹور کیا تھا۔ بچے انہیں بڑے پاپا کہتے اور ان کی بیوی کو کاکی۔

کاکی گھر والوں کے ساتھ کوینا ڈیم دیکھنے کا پروگرام بناتیں۔ پہاڑ میں ٹربائن دکھانے کے لیے اسکول والے بھی ٹرپ لے جاتے۔ یہ جگہ چپلون سے تیس کلو میٹر دور ہے۔

اُس سال راج دیو نے میٹرک پاس کر لیا۔ اس وقت میٹرک گیارہویں کی ہوتی تھی۔

''مارکس ٹھیک ہیں۔ پینسٹھ فی صد!'' نمبر دیکھ کر بڑے پاپا خوش ہوئے۔ سرسوتی سے بولے۔

''بیٹے کو کالج بھیجنا ہے۔'' انھوں نے راج دیو کا کندھا تھپتھپایا۔

''دیکھو بیٹا! چپلون میں کوئی کالج نہیں ہے۔ آگے کی پڑھائی کے لیے لوگ ممبئی یا پونا جاتے ہیں۔'' بڑے پاپا نے بھتیجے کو کس کر سینے سے لگا لیا، ''تمھیں پونا جانا ہوگا۔''

"جی بڑے پاپا!"

"پونا پہنچ کر اس پتے پر میرے دوست سے جا کر ملو۔" انھوں نے اس کے ہاتھ میں ایک وزٹنگ کارڈ دیا تھا، "فرگسن کالج میں تمھارا ایڈمشن ہو جائے گا۔"

ایک گدّا، کپڑے سے بندھی ہوئی ایک سائیکل اور ایک ٹرنک کے ساتھ راجدیو کو سٹی ٹرانسپورٹ کی بس میں بٹھا دیا گیا۔ اسٹینڈ کے باہر پانچ چھ آٹو رکشہ کھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ اِکّے بھی تھے۔ ان دنوں پونا میں رکشہ نئی نئی آئی ہوئی تھی۔ بس سے اتر کر راجدیو نے اِکّا لیا اور تلک روڈ آ گیا۔

اگلے دن بڑے پاپا کے وہ ڈاکٹر دوست انکل، راجدیو کو فرگسن کالج لے گئے۔ فرسٹ کلاس ہوتے ہوئے بھی نمبر زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے وہاں اسے ایڈمیشن نہیں مل پایا لیکن 'سر پرشورام بھاؤ کالج' میں مل گیا۔ یہ کالج ایس پی کالج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دو دن راجدیو ان کے گھر میں مہمان رہا۔ انکل بہت میٹھی باتیں کرتے تھے۔ انھوں نے کالج اور ہاسٹل کی سال بھر کی فیس جمع کرا دی اور راجدیو ہاسٹل چلا گیا۔ اب کالج کی زندگی شروع ہوگئی۔

"مجھے سائنس کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ آرٹس میں جانا چاہتا ہوں۔" مہینے بھر بعد راجدیو نے بڑے پاپا کو خط لکھا۔

آٹھ دن تک بڑے پاپا کے خط کے جواب کا انتظار کیا پھر بے چین ہو گیا۔ پی سی او جا کر فون لگایا۔ ان دنوں چپلون میں مشکل سے بیس پچیس فون ہوں گے۔

"بڑے پاپا مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں پونا آتا ہوں۔" وہ شاید اس کا خط پڑھ چکے تھے۔

"تمھیں گھر کی یاد آتی ہوگی۔" بڑے پاپا نے راجدیو کو سینے سے لگا لیا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "فیس بھری ہے۔ سائنس پڑھ لو۔ کلاس لگا دیتا ہوں۔"

راجدیو کالج کے پاس ہی تین جگہ ٹیوشن پر جانے لگا۔ حساب کے لیے، فزکس، کیمسٹری کے لیے اور انگلش سدھارنے کے لیے۔ کالج میں پریکٹیکل ہوتے۔ صبح جلدی جانا پڑتا۔ کالج میں پڑھانے کا طریقہ الگ تھا اور ٹیوشن کا اور۔ پہلے سال فیل ہوتے ہوتے بچا۔ انگریزی اچھی جانتا تھا۔ مگر وہ شہر کے ماڈرن بچوں کے سامنے اپنے آپ کو کم تر سمجھتا تھا۔ بڑے پاپا کے مل کر جانے کے بعد راجدیو کچھ سکون سے پڑھنے لگا تھا۔

امتحان کے بعد وہ چپلون چلا گیا۔

"اگلا سال انٹر سائنس کا ہے۔"

"فزکس کا پیپر سب سے اچھا کیا ہے۔" بڑے پاپا کے پوچھنے پر راج نے کہا،

"باقی پیپروں کے بارے میں..." وہ ذرا جھجکا پھر بولا، "نمبر کیسے آئیں گے پتا نہیں۔ لیکن فیل نہیں ہوؤں گا۔"

بڑے پاپا راج دیو کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چھٹیوں میں وہ اسے اپنے ساتھ اسپتال لے جاتے۔ اسپتال چلانے کے مختلف طریقے بتاتے۔

"اسٹاف سے نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ چھوٹی غلطی پر زیادہ ڈانٹو گے تو بڑی غلطی کریں گے۔"

"جی بڑے پاپا۔"

"تم بڑے اچھے ڈاکٹر بنو گے۔"

"جی بڑے پاپا! میں آپ جیسا ہی بننا چاہتا ہوں۔"

"اس اسپتال کو تم چلاؤ گے... دیکھنا۔" انھوں نے راجدیو کا ہاتھ تھام لیا اور آپریشن تھیٹر کی طرف لے گئے۔

اس دن راجدیو اسپتال کے مریضوں کو پوچھ رہا تھا۔

"کیسے ہو بھائی؟ کل ڈسچارج ہو جائے گا۔ ٹھیک سے کھانا پینا۔ تھوڑا گھومنا پھرنا بھی۔"

"ڈاکٹر صاحب نے گھر بلایا ہے۔" تبھی وارڈ بوائے آیا اور بولا۔

راجدیو بڑے پاپا کے کمرے میں گیا۔ کاکی بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"بیٹھو" وہ بولے۔

"تم نے کہا تھا فزکس کا پیپر سب سے اچھا لکھا ہے!... تمھیں تو فزکس میں تیس مارکس ملے ہیں۔ باقی سبجیکٹس میں نام کو پاس ہو گئے ہو۔"

انھوں نے پڑھنے والے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا۔ وہ سہم گیا۔

ان کے ہاتھ میں اس کا رزلٹ تھا۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ میں دوبارہ جانچ کے لیے عرضی دوں گا۔ بس تھوڑے پیسے بھرنے ہوں گے۔" راج دیو نے ان کے ہاتھ سے رزلٹ لے کر کہا۔

"یونیورسٹی نے جھوٹ لکھا ہے کیا؟ تجھے جان بوجھ کر فیل کرے گی!! پچھلے سال بھی خراب کیا تھا۔ تجھے نہیں پڑھاؤں گا۔ منجھلے کو پڑھاؤں گا۔ وہ اچھی طرح پڑھتا ہے۔ اسے اسکالرشپ کے پیسے بھی ملتے ہیں۔"

بڑے پاپا بغیر رکے بھڑکتے رہے۔ "اِس کو پڑھاؤں گا نہیں۔"

انھوں نے راجدیو سے نظریں ہٹائیں۔ وہ جیسے اپنے آپ سے بول رہے تھے۔

"جو کرنا ہے کر۔ تو اپنا سوچ لے۔" وہ پلٹ کر بولے تھے۔ ان کی آواز میں غصہ نہیں تھا، دکھ تھا۔

کاکی اتنی دیر چپ بیٹھی تھیں۔ اچانک اپنی جگہ سے اٹھیں۔ پھر شیلف سے سو روپے کا نوٹ لا کر راجدیو کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اور بولیں، "بھاگ جا۔"

وہ ان کا چہرا دیکھنے لگا۔

"سو روپے دے رہی ہوں۔ پونا میں دوست ہیں۔ تیری پہچان ہے۔" ان کی آواز میں غصہ تھا، "پندرہ دن بعد آ کر بول کہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ ویلڈر، پینٹر بن یا کارپینٹری کر، کچھ بھی کر۔ کم سے کم ٹیکنیکل ایجوکیشن تو لے

لے۔ روزی روٹی تو چلے گی ۔‘‘، ان کی گردن ذراسی اکڑ گئی ،’’پورے خاندان میں، میں ہی اکیلی تھی ۔ مائیکے میں، سسرال میں ۔شادی کے بعد بی اے کیا...گھر بارسنبھالتے ہوئے۔‘‘

’’واڈیا کالج جا۔‘‘ بڑے پاپا فکر مند تھے، بیوی کی بات کاٹ کر بولے’’اِدھراُدھر کہیں بھی جاؤ...کورس ڈھونڈنے...‘‘ وہ ذرا رکے۔’’کوئی مقصد تو ہونا چاہیے پڑھائی کا۔

پڑھادیا۔ پڑھ لیا بس ہوا۔‘‘

’’میں نے بی اے سنسکرت جیسے سبجیکٹ میں...‘‘ کا کی پھر شروع ہو گئی تھیں۔

راجدیو وہاں سے اٹھ گیا۔ دروازے سے باہر آتے ہی سرسوتی نے بیٹے کا ہاتھ تھام لیا اور جلدی جلدی اپنے کمرے میں لے گئی اور بولی،

’’بیٹا سن!‘‘ ماں نے اس کی آنکھوں، چہرے اور بالوں پر اپنے کھر درے ہاتھوں کو پھیرا، ’’نیلی آنکھیں، گورا رنگ، بھوری مونچھیں، درمیانہ قد، موٹی موٹی بھویں‘‘ انھوں نے راجدیو کے کندھوں کو دبایا، ’’آئینہ دیکھ۔قسم سے آدھے آستین کے ہلکے رنگوں والے شرٹ اور گہرے رنگ کی پتلون میں میرا بیٹا راجدیو مردانہ خوبصورتی کا نمونہ لگتا ہے۔ ہے نا!‘‘ انھوں نے اپنی الماری کا دروازہ کھول کر بیٹے کو اس کے قد آدم آئینے میں بھرلیا۔

’’یہ تو قدرت نے تجھے دیا ہے۔ ہے نا! تیرے بابا اور میرے ذریعے۔ ہے نا!‘‘

راجدیو چپ تھا۔ ماں کیا بول رہی ہیں! شاید اس پریشانی کے ماحول سے اسے صدمہ ہو گیا ہے۔

’’تجھے بھی کچھ کرنا ہے۔ ہمارے لیے۔‘‘

وہ بے بسی سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

’’سن بیٹا، تو کیسے بھی کر کے بی.اے جتنا تو پڑھ ہی لے۔‘‘ اس نے راج دیو کے دونوں کندھوں پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا، ’’کا کی سے ایک کلاس زیادہ تو پڑھنا ہی ہوگا تجھے۔‘‘

’’سرسوتی...ی...ی..‘‘ کا کی کی دہاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ماں رسوئی میں چلی گئیں۔

راج دیو کرسی پر بیٹھ گیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘ (۲۰۰۸ء) اور ’جس دن سے‘ (دسمبر ۲۰۱۵ء) کی تخلیق کار صادقہ نواب سحر ادب کی کئی صنف میں دخل رکھتی ہیں۔ شاعری، ڈرامہ، مضمون نگاری، بچوں کے لیے نظمیں، ساتھ ہی ناول نگاری کے فن میں بھی آپ کا نام جانا جاتا ہے۔ تخلیق کار کا زینہ وقت طے کرتا ہے اور ہم عصر لوگ صرف اپنی رائے، اپنے نظریے کے ساتھ تخلیق کار کے نظریے کو اپنی تحریر میں پیش کر سکتے ہیں، ’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘ ان کا پہلا ناول ہے، جو پچھلے چند برسوں کے دوران موضوع بحث رہا۔ جب کوئی تخلیق منظر عام پر آتی ہے تو اچھے اور برے کی بحث چھڑ جاتی ہے اور پھر ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، مگر ۲۵-۲۰ برسوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ فلاں تخلیق کار کو وقت نے کس فنی پائیدان پر کھڑا کیا ہے۔ ادب کی تخلیق اور پھر اس کے ردّعمل میں تخلیق کار کے سامنے صبر، انتظار، امتحان کے کئی پڑاؤ آتے ہیں۔ آخر میں ہوتا اتنا ہے کہ کچھ گم ہو جاتے ہیں اور کچھ گہری نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ بہرصورت اس سے ہر قلم کار کو گزرنا ہوتا ہے۔ بات صادقہ نواب سحر کے ناول سے شروع ہوئی تھی متاشا، ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار ناول کا ایک نمایاں نسائی کردار ہے، جس کے اردگرد کہانی گھومتی ہے۔ متاشا کو پوری زندگی اپنے لڑکی ہونے کا قرض ادا کرنا پڑا۔ رشتے جدا جدا مگر ہر رشتے میں دی جانے والی اذیتیں یکساں۔ یہ صرف ایک متاشا کی کہانی نہیں ہے، ہر گاؤں، ہر شہر، ہر ملک کی داستان ہے کیونکہ لڑکی یا عورت کو لے کر تانیثیت کی آواز چاہے جتنی بلند کر لی جائے، مرد کا خود کا نظریہ جب تک نہیں بدلے گا، متاشا جیسی لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں گی، مرتی رہیں گی۔ ہمارے معاشرے کے نظام کا یہی المیہ ہے اور اسے ناول کے فکشن میں ڈھالنے میں صادقہ نواب سحر کافی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں، کچھ لغزشوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو متاشا کے کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ لٹھ مار جیسی لڑکی نہیں ہے، وہ اپنے خلاف ہو رہی زیادتیوں کو محسوس کرتی ہے، اس کا دل دکھتا ہے مگر اظہار کی کمزوری اسے اکیسویں صدی کی لڑکیوں کے برابر کھڑے ہونے سے روکتی ہے۔ اسے ہم ناول نگار کے قلم کی کمزوری نہیں مانتے بلکہ حالات اور کردار کی ساخت کا تقاضا انھیں ایسا دکھانے پر مجبور کرتا ہے۔ اسے ہم کہانی کی مانگ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ عام طور پر ان حالات میں پلی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

شائستہ فاخری

(الہ آباد)

ڈرامہ

چڑیا کا بچّہ گیا کہاں!

صادقہ نواب سحر

کردار: زینب: چوتھی جماعت کی ایک نو سال کی بچی

موسیٰ: زینب کا پانچ سالہ بھائی جو کے.جی.کلاس میں پڑھتا ہے۔

چڑیا کا بچہ: صرف اشاروں اور مکالموں کے ذریعے اس کے ہونے کا احساس دلایا جائے گا۔

(ایک بڑے سے کمرے کا منظر، پردہ اٹھتے ہی زینب اور موسیٰ اسٹیج کے اگلے حصے کے درمیان کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دائیں جانب پڑھائی کی میز اور دو کرسیاں نظر آ رہی ہے۔ میز پر کچھ کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ ایک لیپ ٹاپ بھی نظر آ رہا ہے۔ بچوں کے پیچھے کچھ فاصلے پر اسٹیج کے بائیں جانب ایک پردہ لٹکا ہے)

زینب: (بائیں جانب دیکھتے ہوئے، جیسے کھڑکی سے باہر جھانک رہی ہو) تینوں طرف پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہمارا یہ چھوٹا سا شہر کتنا خوبصورت ہے۔ ہے نا بھیا! ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی ہے۔ روزہ رکھنے کا احساس بھی نہیں ہو رہا ہے۔

موسیٰ: ہوں، وہ تو ہے آپا! آج میں نے بھی تو روزہ رکھا ہے!

زینب: تم تو ابھی پانچ سال کے ہی ہو۔ آدھا روزہ ہی رکھو گے۔ روزہ رکھنے کی پریکٹس کر رہے ہو نا! مجھے تو روزہ رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آؤ چلو پڑھنے بیٹھتے ہیں۔ امتحان ہونے والے ہیں۔

موسیٰ: روزے میں پڑھائی! یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔

زینب: (منہ بناتے ہوئے) یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا! ابھی کھیلنے کو کہوں تو فوراً تیار ہو جاؤ گے۔

موسیٰ: کھیلنا تو پڑتا ہے نا آپا! کھیلنے میں اتنا مزہ جو آتا ہے!

زینب: میں تو نہیں کھیلوں گی۔ مجھے لیپ ٹاپ پر پروجیکٹ بنانا ہے۔ ٹیچر نے کہا ہے۔ کہاں ہے میرا لیپ ٹاپ؟

موسیٰ: وہ رہا پڑھائی کی میز پر۔ (میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اُدھر۔

زینب: اوہ! لو میں چلی پروجیکٹ تیار کرنے۔ آؤ تم بھی اسے دھیان سے دیکھو۔ جب تم چوتھی کلاس میں آؤ گے نا! تو تمھیں بھی پروجیکٹ تیار کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ (دونوں پڑھائی کی میز کی طرف بڑھتے ہیں۔)

موسیٰ: ارے! (چھت کی طرف ہاتھ بڑھا کر اشارہ کرتا ہے۔) دیکھو دیکھو آپا وہ کیا اُڑا!!! بھوت بھوت!! (آنکھیں خوف سے پھیل جاتی ہیں)

زینب: ارے!! کیا کہتے ہو!

موسیٰ: آپ کے بیٹھتے ہی کوئی بھوت لیپ ٹاپ کے پاس سے اُڑا۔

زینب: تمھارے دماغ میں تو ہمیشہ بھوت پریت ہی بھرا رہتا ہے۔ پگلے بھوت ووت کچھ نہیں ہوتا بھائی!

موسیٰ: اچھا آپی! پھر وہ کیا تھا؟

زینب: ارے بدھو، وہ دیکھو! (اوپر کی طرف اشارا کرتی ہے۔ دونوں سر اٹھا کر چھت کو دیکھتے ہیں) فالس سیلنگ کے گیپ (کھانچے) میں سے کیا نکلا ہے!

موسیٰ: وہ کیا ہے؟

زینب: دیکھا! کیسے اس نے اپنے کُھلے ہوئے پنجوں سے اسکرٹنگ کی دیوار کو تھام رکھا ہے۔ اور کیسے چھت کی فالس سیلنگ کی اسکرٹنگ پر بیٹھا اس کی پٹیوں سے اپنی چونچ رگڑ رہا ہے۔ موسیٰ! دکھائی دیا؟

موسیٰ: ارے ہاں، وہ دیکھو چڑیا کا ننھا منا بچہ، بھورا بھورا، کتنا پیارا ہے۔ اس کے پر پھولے ہوئے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے آپا۔

زینب: وہ بہت گھبرایا ہوا ہے۔ ہال کے سارے پنکھے بند کر دو موسیٰ۔ ورنہ وہ کسی پنکھے سے ٹکرا کر خود کو زخمی کر لے گا۔

(موسیٰ سارے پنکھوں کے بٹن بند کرتا ہے اور پردوں کے پیچھے سے جھاڑو لے آتا ہے)

ارے! تم یہ جھاڑو کیوں اٹھا لائے؟

موسیٰ: (جھاڑو اٹھا کر ہوا میں لہراتے ہوئے) جھاڑو کی مدد سے اس کو باہر نکلنے کا راستہ دکھاؤں گا۔ (کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) دیکھ رہی ہو نا، جھاڑو کو قریب آتا دیکھ کر وہ ہال کی بڑی کھڑکی کی طرف اڑ گیا۔ مگر... مگر باہر نکلنے کی بجائے وہ گھر میں لوٹ آیا ہے۔ اب وہ ہال میں ادھر ادھر اڑنے لگا ہے آپا! (ادھر ادھر نظر گھماتا ہے)

زینب: (کچن کی طرف دیکھتے ہوئے) چڑیا کا بچہ کچن کی طرف بڑھا ہے بھیا۔ (آگے بڑھ کر ہال کی ساری کھڑکیاں کھول دیتی ہے) ارے! یہ بڑی کھڑکی پر لگی ٹیوب لائٹ پر جا بیٹھا ہے۔

موسیٰ: دیکھا آپا، یہ ادھر ادھر اڑنے لگا۔ جاتا نہیں۔ ارے! یہ اچانک کہاں غایب ہو گیا!

(دونوں سارے گھر میں ادھر ادھر ڈھونڈتے ہیں)

زینب: وہ دیکھو پردے کے پیچھے!

موسیٰ: کون سا پردہ آپا؟

زینب: یہ جو ہال کے دوسرے حصے سے کھانے کی جگہ کو الگ کرتا ہے۔

موسیٰ: یوں کہیں نا کہ کھانے کی ٹیبل کے پاس والا پردہ۔ (پردہ ہٹا کر جھانک کر دیکھتے ہوئے) آپا، چڑیا کا بچہ ٹیبل کے نیچے زمین پر ٹھٹھرا ہوا بیٹھا ہے۔ آپا، اس کے پیر میں تو چوٹ لگی ہے۔ (دونوں ٹیبل کے قریب یعنی اسٹیج کے پاس پردے کے قریب بیٹھ کر پردے کے پیچھے سے جھانکتے ہیں۔ ان کا چہرا اسٹیج کی طرف ہے۔)

زینب: ہاں موسیٰ صحیح کہا تم نے۔ اس کے پیر میں چوٹ لگی ہوئی ہو گی! شاید اسی لیے وہ اپنے گروہ سے بچھڑا ہوگا۔

موسیٰ: آپا پلیز کٹوری میں پانی لے آؤ۔ چڑیا کے بچے کو پیاس لگی ہو گی۔ میں اس کو باہر نکالتا ہوں۔ (چڑیا کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

زینب: نہیں نہیں! اس کو ہاتھ مت لگانا۔ اس کے زخم ہے۔ درد ہوگا۔

موسیٰ: (حیرانی سے) اچھا!! مگر میں تو اس کو مرہم لگانا چاہتا تھا۔

زینب: (دوڑ کر کٹوری میں پانی لے آتی ہے) لو پانی کی کٹوری پردے کے پیچھے رکھ دیتی ہوں۔ چلو اب اس کو کھانے کو کچھ دیتے ہیں۔

موسیٰ: یہ چاول کھائے گا نا!

زینب: ہاں، کیوں نہیں۔

موسیٰ: کچے چاول؟

زینب: ہاں کچے ہی۔ وہ پکا کر تھوڑے ہی کھاتا ہوگا!

موسیٰ: میں چاول کیسے لاؤں! میرا ہاتھ چاول کے ڈبے تک نہیں جاتا!

زینب: اچھا میں چاول لے کر آتی ہوں۔ (اسٹیج کے پچھلی جانب دوڑ کر جاتی ہے اور چاول کی کٹوری لے کر لوٹتی ہے، جسے وہ ٹیبل کے پاس بیٹھے موسیٰ کے ہاتھ میں دیتی ہے)

موسیٰ: (مٹھی بھر چاول کٹوری سے اٹھا کر پھینکنے کے انداز میں) یہ لو ننھی چڑیا!

زینب: ارے بھیا! دانے مت پھینکنا۔ تم کٹوری سرکا کر ہٹ جاؤ۔ وہ خود ہی باہر نکل کر کھالے گی۔

موسیٰ: نہیں آپا، کٹوری رکھوں گا تو وہ سمجھے گی، میں اس کو پکڑ لوں گا۔ وہ ڈر جائے گی۔ (چڑیا کی طرف مٹھی بھر چاول پھینک دیتا ہے) ارے! چڑیا تو اڑ گئی! (اوپر دیکھتا ہے)

زینب: ارے! وہ تو کھڑکی سے باہر نکل گئی!! منع کیا تھا نا!... آخر چاول کے دانے اس پر پھینک ہی دیے نا!!

موسیٰ: مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ بھاگ جائے گا! (رونے لگتا ہے) اوں... اوں... اوں!

زینب: چلا گیا تو روتے کیوں ہو؟ جب وہ ہمارے گھر میں آیا تھا تب تو تم اسے جھاڑو سے باہر جانے کا راستہ دکھا رہے تھے؟

موسیٰ: ہاں تب میں ڈر گیا تھا۔ کہیں وہ پنکھے کی زد میں آجاتا تو!

زینب: پھر اب اس کے چلے جانے پر دکھی کیوں ہوتے ہو؟

موسیٰ: اب میں اس کو پالنا چاہتا تھا۔ (اداسی سے) چڑیا کا بچہ کیوں اڑ گیا آپا! اس کو کیا تکلیف تھی! وہ کیوں نہیں رکا؟

زینب: چڑیا کا بچہ شاید اپنے خاندان سے بچھڑ گیا ہے۔ ہم کو بھی اپنی فیملی؟؟؟ کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے نا!

موسیٰ: ہاں آپی۔ مگر ہم نے پانی رکھا تھا۔ دانہ بھی ڈالا تھا۔ اس نے کھایا کیوں نہیں؟

زینب: پتہ نہیں۔ اُس کو اپنے ماں باپ اور ساتھیوں کی یاد آ رہی ہوگی۔ جی نہیں چاہتا ہوگا۔ کتنا چھوٹا ہے نا! (فکر سے) کہاں جائے گا؟

موسیٰ: ہاں آپا! (ہاں میں سر ہلاتا ہے) بہت چھوٹا ہے۔ ننھا منا سا بے بی چڑیا۔

زینب: ہاں بھیا۔

موسیٰ: اس کے گھر والے اسے ملیں گے یا نہیں! (بہت پریشانی سے) آپا، اسے کوئی چیل یا کوا تو نہیں کھالے گا؟ اس میں تو خود کو بچانے کی طاقت بھی نہیں ہوگی۔ پھر کیسے اُڑ گیا!!

زینب: تمہارے چاول پھینکنے کے طریقے سے وہ ڈر گیا ہو شاید! یا ہو سکتا ہے کہ اسے چوٹ لگی ہو... اور وہ گھبرا گیا ہو!

موسیٰ: اتنے چھوٹے چھوٹے چاول کے دانوں سے؟

زینب: چڑیا کا بچہ بھی تو چھوٹا ہے۔ ویسے پھینکنے سے چوٹ لگتی ہے بھائی!

موسیٰ: صحیح کہہ رہی ہو آپا!

زینب: اور بھیا پھینک کر تو کھانے کی چیز نہیں دی جاتی نا!

موسیٰ: جی... آپا..... ساری!

زینب: ساری چڑیاں اچھی لگتی ہیں مگر چڑیا کا یہ بچہ تو بہت خاص تھا۔

موسیٰ: یعنی!

زینب: دیکھو نا۔ وہ کمزور تھا مگر اس کے ارادے مضبوط تھے۔ دیکھا نہیں، ننھی سی جان ہو کر بھی اس نے پوری طاقت لگائی اور...

موسیٰ: ...وہ اڑ گیا۔ ہے نا!

زینب: ہاں۔ ہم بھی پورا زور لگائیں تو...

موسیٰ: (خوشی سے اپنے دونوں بازوؤں کو پرندوں کے پروں کی طرح پھیلا کر) تو ہم بھی اڑ جائیں گے؟

زینب: نہیں پگلے، ہم کیسے اڑ سکتے ہیں! ہمارے پر کہاں ہیں؟

موسیٰ: پھر ہم پوری طاقت لگائیں گے تو کیا ہوگا آپی؟

زینب: ایسے... (اپنی جگہ پر کھڑی رہ کر معنی خیز انداز میں دائیں ہاتھ کی انگلیاں نچاتی ہے۔ اس کے ساتھ موسیٰ بھی اپنی جگہ پر کھڑا رہ کر گردن گول گھما کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں نچاتے ہوئے زینب کی آنکھوں اور انگلیوں کا پیچھا کرتا ہے۔ زینب کی نظریں کتابوں کی الماری پر ٹِک جاتی ہیں)

موسیٰ: (چونکتا ہے) آپا!! (ناراض ہوتے ہوئے) تم تو ہر بات میں پڑھائی کو لاتی ہو!

زینب: ہم اسی کے لیے تو اسکول جاتے ہیں۔

موسیٰ: مگر آپا!!! اِس وقت تو ہمارے کھیلوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔

زینب: ہاں، اِس وقت تو ہمارے کھیلوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ تو!!

موسیٰ: تو آپا، ہم پورا زور لگائیں گے تو پہلا نمبر لائیں گے۔

زینب: بالکل، پڑھائی ہو یا کھیل، کوئی بھی کام ہو، پورا زور لگائیں گے تو پہلا نمبر لائیں گے۔

موسیٰ: جی... جی... جی ہاں ں ں! پورا زور لگائیں گے تو پہلا نمبر لائیں گے!!

زینب: پورا زور لگائیں گے تو پہلا نمبر لائیں گے۔

(دونوں تالیاں بجاتے ہیں۔)

''آئینِ سخاوت''

الہام کی رم جھم، کہیں بخشش کی گھٹا ہے
یہ دل کا نگر ہے کہ مدینے کی فضا ہے

سانسوں میں مہکتی ہیں مناجات کی کلیاں
کلیوں کے کٹوروں میں تیرا نام لکھا ہے

گلیوں میں اترتی ہیں ملائک کی قطاریں
احساس کی بستی میں عجب جشن بپا ہے

ہے "قریہ ادراک" منور تیرے دم سے
ہر ساعتِ خوش بخت جہاں نغمہ سرا ہے

اب کون حدِ حُسنِ طلب سوچ سکے گا
کونین کی وسعت تو تہہ دستِ دعا ہے

ہے تیری کسک میں بھی دھمک حشر کے دن کی
اور یوں کہ میرا قریہء جاں گونج اٹھا ہے

آیات کے جھرمٹ میں ترے نام کی مسند
لفظوں کی انگوٹھی میں نگینہ سا جڑا ہے

اک بار تیرا نقش قدم چوم لیا تھا
سو بار فلک شکر کے سجدے میں جھکا ہے

''یٰسین'' ترے اسم گرامی کا ضمیمہ
ہے "ن" تیری مدح، "قلم" تیری ثناء ہے

"والّیل" ترے گیسوئے رحمت کا تراشہ
''والعصر'' تیری نیم نگاہی کی ادا ہے

"زم زم" تیرے آئینِ سخاوت کی گواہی
''کوثر'' ترا سرنامہء دستورِ عطا ہے

سورج کو ابھرنے نہیں دیتا ترا ''حبشی''
بے ذر کو "ابوذر" تری بخشش نے کیا ہے

اترے گا کہاں تک کوئی آیات کی تہہ میں
"قرآں" تری خاطر ابھی مصروفِ ثناء ہے

اب اور بیاں کیا ہو کسی سے تری مدحت
یہ کم تو نہیں ہے کہ تو محبوب خدا ہے

محشر میں ثناء خوان ترے یوں تو بہت ہیں
صد شکر میرا نام تجھے یاد رہا ہے

اے گنبدِ خضراء کے مکیں! میری مدد کر
یا پھر یہ بتا کون میرا تیرے سواء ہے

بخشش تیرے ابرو کی طرف دیکھ رہی ہے
"محسن" تیرے دربار میں چپ چاپ کھڑا ہے

''پردہ''

طاہرہ اقبال
(فیصل آباد)

مکئی کے کھیت میں سے اُس نے چھلی توڑی، جیسے انگوٹھے اور اُنگلی کی پور کو جوڑ کر چٹکی بجائی ہو۔ ادھ کچری چھلی کے گلابی چہرے والا بوٹا کمر لچکا کر سر سراپا۔ خانو دو بیگھ بھرے برسیم کے جامنی پھولوں پر سے تیرتا ہُوا مکئی کے اس کھیت میں اُترا۔ چھلی توڑتی ریشو کے جنڈوں پر ہاتھ پڑا، تو جیسے بھٹے کے پردے میں سے جھانکتے سنہرے ریشم نے پوروں کو لپیٹ لیا، خانو منڈیر سے پھسل بہتے کھال میں دھکا کھا گیا۔

''ری تو ریشو نائن ہی ہے نا، جس کے جنڈے جنڈ کی جڑوں کی طرح بٹے ہوئے ہوتے تھے اور چہرہ رہو کے پیپے کی طرح گرالوں سے بھرا ہوتا تھا۔''

''ریشو نہیں ریشماں کہو۔''

اُس نے دودھی چھلی کا گودا چبا کر خانو کی گردن پر پھوگ اُچھالا، خانو نے پھوگ اُنگلیوں پر مل کر پوریں چاٹیں اور اچھی اچھی چھلیاں توڑ توڑ اُس کے گلابی آنچل میں بھرنے لگا اور دودھی ٹُکے چبانے لگا۔

''اری تیرے بالوں میں کن ریشم اُنگلیوں نے کنگھا پھیرا، تیرے گالوں پر کس پھول کے زردانے جھڑ گئے، تیرے قد پر کب سنی کے بوٹے نے لہرا کو انگڑائی کھولی اری تُو ریشو نائن سے ریشماں کب ہو گئی؟''

ریشو ریشماں ہو گئی۔ ریشماں جوان ہو گئی۔

یہ خبر ہر نکڑ کونے میں یوں لگی، جیسے میاں خیرے کے میلے میں موت کے کنویں میں کوہ کاف کی حسینہ ایک پہیئے والا سائیکل چلاتی ہو اور بنا ٹکٹ والا تنبو توڑ رش، اُس ہٹی پر پڑنے لگا، جس کے سامنے سے گُزر کر وہ روز صبح لسّی لینے نمبرداروں کے گھر جاتی تھی۔ ذرا سی کُجی کا بوجھ سر پر رکھے، کبھی کولہے پہ ٹکائے کچی گلیوں کے ٹیڑھے میڑھے موڑ کاٹتی، تو تماش بینوں کو لگتا جیسے موت کے کنویں میں چکرانے والا سائیکل اُن کے سینوں کے نشیب و فراز پر سرپٹ دوڑنے لگا ہے۔ اُس وقت گاؤں کے مردوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہتا کہ وہ ہٹی پہ بجتے فلمی گانوں کے تال پر سیٹیاں اور چٹکیاں بجائیں اور مونچھوں پہ ٹپکتی رال کو چوس کر گالیاں چبا چبا تھوکیں۔

''لُچی، بدمعاش، لفنگی۔''

وہ بازو کو کمان کی شکل میں خم دے کر سَر پر دھری کُجی کی گردن میں ہاتھ ڈالتی، تو اوڑھنی کا پلّو کھنچ کر بائیں کندھے سے لٹک جاتا اور قمیض کا چاک یوں اُوپر اُٹھتا کہ شلوار کے نیفے کے اُوپر کولہے کا اُبھار مصالحہ دار بوٹی سی مردوں کے منہ میں چلا جاتا، وہ سی سی اُنگلیاں کاٹتے، زبان پر پڑے کالے پیلے چھالے چاٹتے،

''کنجری، گشتی، بدمعاش'' تب گاؤں کی عورتیں کانوں کو ہاتھ لگا زبان چھوتیں۔۔۔

''ہائے ہائے نی ساری کی ساری ننگی۔''

تب وہ کولہے سے بوٹی بھر عریاں اتنی ہی ننگی معلوم ہوتی جتنی پنجابی فلموں کی گدرائی ہوئی ہیروئن اور اتنی ہی لُچپد کھتی جتنی باری میں سے جھانکتی کوٹھے والی، جوان بیٹوں کی ماؤں کو اُس کی بدمعاشی، اُس کی چھوٹی ذات نیچ فطرت کا خاصہ معلوم ہوتی، جوان شوہروں کی بیویوں کو اُس کا گورا رنگ اُنھی کے شوہروں کی لائی ہوئی کریموں کا چمکارا دِکھائی دیتا اور اُس کی عمر اُس کے حُسن کے لوازمات کو مختلف مردوں کے ناموں سے تعبیر کرتے ہوئے نفرت بھرے ہَوکے بھرتیں۔

''اچھو منیاری والے کی نکی بنیان'' جس میں وہ کس کس کر ساری کی ساری آپے سے باہر اُمڈ آتی کہ اُسے واپس خود اپنے ہی بدن میں دھکیلنا جیسے اُس کے اپنے بس میں نہ رہا ہو تبھی تو نمبردارنی اُس کی کجی میں لسّی ڈالتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتی۔

''ارے بچے جوان ہو گئے پر جسم اپنی ہی کھال کے پردے میں چھپا رہا، اری تو تو اپنے ہی بدن سے دو گٹھ (بالشت) باہر نکل کر چلتی ہے۔''

''نمبردارنی جی! ٹوڈا کھر جائے تو کھوکھری میں تھوڑی سماپا تا ہے۔''

وہ ہنستی تو لگتا ماس میں بھرا آتشیں لاوا سا، باہر اُمڈ کر بہہ نکلا ہے۔

اُس کے گالوں کی سرخی پھیری والے اُکو کے مالٹوں اور سیبوں میں سے نکلتی تھی، جنھیں سبھی لڑکیوں نے خود اپنی آنکھوں سے اُس کے سینے پہ تنی بُکل میں ڈالتے ہوئے اکو کو کئی بار دیکھا تھا۔

اُس کی چال مورنی کی نہیں اُس چپلی کی محتاج تھی، جو گلو آرائیں میاں خیرے کے میلے سے بڑی مہنگی خرید کر لایا تھا اور جوں جوں وہ پرانی ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی قیمت کا تخمینہ بھی بڑھتا جا رہا تھا، تو گلو کی بیوی اُسے واپس لانے کو روز صبح شام سر باندھ کر گالیوں کا لٹھ اُٹھا کر اُس سے لڑنے جاتی، جواباً وہ ہنس ہنس سنی کے پھولوں جڑی لخروں سا بدن لہراتی اور زرد زرد پنکھڑیاں بکھیرتی چلی جاتی۔ گلو کی بیوی لڑلڑ پسینو پسین لوٹتی تو جیسے بے لچک لٹھ سی کڑک کر کے جا جا ٹوٹ چکی ہوتی۔

بالآخر جوان شوہروں کی بیویوں، جوان بیٹوں کی ماؤں اور اُس کی ہم عمر لڑکیوں نے مل کر یہ فتویٰ دیا کہ لُچی رَن اس لیے خوبصورت دِکھتی ہے کہ وہ رنگ رنگ کا کھاتی ہنڈاتی اور وَن وَن کا مرد ورتتی ہے، بوڑھے مردوں کی بیویاں نسبتاً زیادہ خطرے کا شکار تھیں، کہ نہ رنگ رنگ کا کھانا اُنھیں پچتا، نہ ہنڈانا سجتا، اور نہ ہی مرد برتنے کی سکت بچی تھی، جب کہ وہ کناروں اُمڈتی ڈھلانوں چڑھتی سیلابی ندی اور بوڑھے مردوں کے جسم و جاں تو ویسے بھی نشیب میں دھرے ہوتے ہیں، ذرا سی چھل سے بھی پایاب اور پھر جب بادل کا پیٹ پھٹنے کو آئے تو وہ دریا، سمندر، تھل، بیلے کچھ تمیز تھوڑی رکھتا ہے، بس برس بڑتا ہے کہ اُس کا بوجھ اُس کے وجود میں سما نہیں پا رہا ہوتا، ریشو کے اندر بھرا سب کچھ اُس کی ہڈیوں کے پنجرے، گوشت کی دبازت اور کھال کے استر سے کہیں زیادہ منہ زور تھا۔ پھٹتی، ادھڑتی، مسکتی، برستی بہتی چلی جاتی۔ اسی لیے تو جب وہ نمبرداروں کے گھر سے لسی لینے جاتی تو نمبردارنی کو رولا سا پڑ جاتا۔ نمبردارنی کے بالوں کی لٹیں چادر سے نکل کر بانس

کے جھاڑو کی طرح بکھر جاتیں، ماتھے پہ بچھی لکیریں اور ٹھوڑی کا ڈھلکا ہوا ماس گچھا مچھا ہو جاتا۔ نوکرانی کو ڈانٹتے ہوئے حلق میں سے جو آواز نکلتی وہ زنانہ ہوتے ہوئے بھی ہیجڑا سی معلوم ہوتی۔

''نی جلدی ورتا نی لسی۔ نری آلسی، لسی ورتا رہی ہے کہ ہائے گلا رہی ہے۔ تو ہٹ پرے۔ میں آپ نبیڑوں۔''

ون کا دُھواں نکلتی خود چولہے سے اُٹھتی تو گھٹنے کا کڑا کا نوکرانی کو پڑھنے والے دھپے میں کھڑک کی آواز دیتا، کمان بنی کھڑی ریشو کے کولہے پر چڑھی کجی کے منہ میں ہاتھ ڈال کھینچتی جیسے ہاتھ اُس کی کھال پر پڑا ہوا اور ادھیڑتا چلا گیا ہو۔

''پلا (کپڑا) کرنی آگے، کیوں اکڑا کے رکھتی ہے۔ ڈھیلا چھوڑا نہیں۔۔۔ یہ دیکھ۔۔۔'' نمبردارنی چھلکیں مارتے سینے پر سے چادر ہٹاتی۔

''یہ دیکھ آج تک کبھی نہ پہنی۔ کوئی شرم حیا بھی ہوتا ہے زنانی کا۔۔۔ کنجریاں کرتی ہیں ایسے چالے۔۔۔ یہ پہنیں تو گاڑ کے نہ رکھ دُوں انھیں اڑوڑی میں۔۔۔'' وہ نوکرانیوں کی سمت اشارہ کرتی۔ لسی کجی کے منہ سے چھلک جاتی، نمبردارنی کا حلق غوطا جاتا جیسے اندر کہیں کوئی منہ کے بل ڈوب گیا ہو۔ وہ بکل کھول کر دوبارہ کستی تو نمبردارنی کو لگتا۔ اُس کے جسم کا بے شرم اکڑاؤ اُس کے اپنے جسم کے ڈھلکاؤ پر ہنسی کے چھینٹے اُڑا رہا ہے اور برآمدے میں بیٹھے ہوئے نمبردار کے پراٹھا مکھن کے ذائقے میں اچاری چس بھر گیا ہے، جس کی سسکار وہ کانوں سنتی، لسی کی کجی بھر کر، یوں بڑھاتی جیسے پیر سے جوتا نکال کر پٹخا ہو، جو ہوا میں اڑنے لگا ہو، اور پتہ نہیں کون کون زد میں ہو، وہ لُچی بھی ذرا سی کجی کو یوں جھٹکا مار کر سر تک لے جاتی کہ دائیں بائیں وکھیوں (پسلیوں) سے قمیض اُوپر تک چڑھ جاتی، جیسے یہ پاؤ بھر کجی نہ ہو کوئی منوں وزنی پنڈ ہو، جسے اُٹھانے کو کسی اور ہاتھ کا سہارا درکار ہو۔ تبھی تو اُس روز نمبردار کا اکلوتا بیٹا جبار اُسے مشکل میں دیکھ کر بے اختیار مدد کو بڑھا، اور کجی کے گلے میں ہاتھ ڈال اُس کے سَر دَھر دیا۔ وہ کجی کی بے وزنی پر ہنسی جس نے جبار کا سارا زور کھینچ لیا تھا اور وہ نڈھال ہو کر ہانپنے لگا تھا۔ ہنسی کا بَل جب مروڑے کھا کھا کر کمر تک آیا تو بڑے نمبردار کو دومونہی نے ڈس لیا، جو ہر سال اسی موسم میں اُسے ڈسنے کو نجانے کتنا لمبا فاصلہ طے کرتی تھی اور جب تک ڈس نہ لیتی تھی۔ نمبردار کا بدن ڈنک کی وِس کے لیے ٹوٹتا رہتا تھا۔ نمبردار کے حلق میں پھنسنے والی مکھن چُپڑی برکی، اُس نے کھنگورا مار کر نگلی، تو وہ دروازے سے باہر لپکی، جیسے خود لسی کی کجی میں لبالب بھر گئی ہو۔ چھلکتی، اُمڈتی کبھی سر پر کبھی کولہے پر۔۔۔ جس جس گلی سے گزرتی، کچھ اُگلتی، تھوکتی، پھینکتی چلی جاتی۔ بھورے چننے والے اُس کے پیروں کی مٹی پھرولتے رہ جاتے، وہ بدمعاش بھی ایسی فسادی کہ بھونکنے، بھنبھورنے کو کئی نہ کوئی ہڈی ماس پھینک ہی جاتی، کبھی چیرویں آنکھ کی آب سے کچھ ڈھلک جاتا، کبھی بھیگے بھیگے لبوں کی تری سے کچھ ٹپک جاتا، کبھی کھال میں خود کو سموئے رکھنے کی کوشش میں کچھ اُبھر، اُمڈ آتا اور جب وہ گزر چکتی تو سارے ہونٹ چاٹتے ہوئے لکڑی بنے نرگٹوں میں خشک تھوک نگلتے۔

''نری کنجری، لُچی، بدمعاش، غنڈی۔'' جیسے وہ بنا کچھ کہے سنے سب دُکان داروں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتی گزر گئی ہو اور اس کا جھولا گزر جانے کے بعد اُنھیں اپنے قلاش ہو جانے کا احساس ہوا ہو۔ زبردست سے رُندھ جانے کے بعد زیردست کے اندر بھرا ہُسڑ گالیوں کی شکل میں باہر آتا ہے۔

یہ اطلاع آنے میں اگرچہ منطقی طور پر دیر ہوئی، لیکن جب خبر لگی تو چٹخارے کی طرح ہر زبان نے مزے لے لے کر چبائی۔ جوان شوہروں کی بیویاں اور جوان بیٹوں کی ماؤں نے اپنے اپنے مردوں کے چہروں کی بُھر بُھری مٹی میں رمبی، درانتی چلا کوئی گرا پڑا اسٹی دانہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

کئی تو کھیڑے پڑ گئیں اور قسمیں اُٹھوانے تک آئیں اور ہڈیاں سنکوا کر روئیں۔

''مرد کی ذات بڑی بے اعتباری شے اڑیو نہ بیٹا اعتباری، نہ شوہر، نہ سسر۔۔۔'' اور پھر گم پھوڑے پر قیاس کے چوبھے لگانے لگیں، جیسے ہر ایک کو یقین تھا کہ یہ دوسری کی ہی سوتیلی اولاد پوتا پوتی ہے۔ جو اس ناجائز کوکھ میں پل رہی ہے۔ تب بیویوں کے سسر اور بیٹوں کے باپ بھی ڈھیری پھرولتے ہوئے معلوم ہوتے۔ گاؤں میں کسی کی چوری ہونے کی صورت میں وہ مٹی کی ڈھیری بنا کر سب کو باری باری اُس میں ہاتھ ڈالنے کی دعوت دیتا ہے۔ تب موقع سے فائدہ اٹھا کر اصل چور مدعا ڈھیری میں چھوڑ جاتا ہے۔ چوری کا مال تو پکڑا جاتا ہے لیکن اصل چور سامنے نہیں آپاتا، گویا یہ چوری تھوڑی تھوڑی کر کے سبھی میں تقسیم ہو گئی ہو اور کفارے کے طور پر قبول کر لی گئی ہو۔ یہ چوری بھی سارے گاؤں کے مردوں میں ذرا ذرا تقسیم ہو گئی تھی اور اصل چور سامنے نہ آ رہا تھا۔ تبھی تو نمبردارنی نے چھونی (ڈھکنا) کی اوٹ میں سیر بھر مکھن کا پیڑا اُچھال اُچھال لسی لینے والیوں کی نظروں سے اُسے چھپایا۔ لسی کے آخری قطرے نچوڑے۔

''اڑیو! اپنے اپنے خصموں کے توپے اُدھیڑو۔ چور تو اُنھی میں سے کوئی ہے نا بے غیر تو ہے کہ نہیں۔۔۔''

مگر یہاں کوئی اقرار نہ کرتا تو اِنکار بھی تو نہ کرتا تھا، جیسے اقرار جرم ہے تو انکار ذلت، جیسے اس جرم کا اعزاز کسی اور کے نام کرنے والے پر خود نامردی کا طعنہ آ جاتا ہو۔ تب ہر عورت اندھیرے سویرے مُلاّ کے پاس مٹھی بند کر کے گئی اور ڈھیری میں ہاتھ ڈال کر کھول آئی۔

''مُلاّ جی! کتاب پھرول کر بتاؤ، اصل چور کون ہے۔ قسم لگے آپ کو اس پاک کتاب کی چور کا نام بتا دو مُلاّ جی! ورنہ بستی پر قہر ٹوٹے گا، نہروں میں بندیاں ہو جائیں گی۔ فصل کو تیلا کھا جائے گا۔۔۔''

تب مُلاّ درود شریف کا وِرد مکمل کر کے گریباں کے اندر پھونکتا، جیسے اپنے گرد حفاظتی قلعہ کھینچ رہا ہو۔

''بی بیو! پچھ پرتیت عورت ذات سے ہوتی ہے، کیونکہ راز کی محرم وہی ہے۔ اسی لیے تو حشر دیہاڑے ہر ایک کو ماں کے حوالے سے پکارا جائے گا۔ اس میں بڑی حکمت ہے۔ پردے کی حکمت۔ اس لیے بیبیو چشم پوشی کرو، مُتشبہات کے لیے شرع میں یہی حکم آیا ہے یا پھر اُسی سے جا کر سچ اُگلواؤ۔۔۔''

لیکن جب نمبردارنی کا پیغام بھی یہی موصول ہوا کہ مُلّا جی کتاب نکال کر اصل چور کا نام سامنے لایا جائے۔ کیونکہ یہ شرع کا مسئلہ ہے تب گڑ اور گیہوں کی بوریاں مولوی کے گھر جاتے ہوئے عام دیکھی گئیں اور یہ بھی سنا گیا کہ نمبردارنے ریشماں کے باپ دِتّو نائی کو بُلا کر حکم دیا کہ اوّل تو کمیوں کی بیٹیاں پیدا ہوتے ہی مرجائیں تو بہت اچھا اور اگر بدقسمتی سے جوان بھی ہو جائیں تو ان کی اُجڑی ہوئی لٹوں میں پہلا کنگھا پھرنے اور گرالیں لبڑے منہ کو پہلی بار دھوتے ہی ساس کے بیلن میں ان کا گالا جھونک دینا چاہیے کہ ان کا دُھلا ہوا چہرہ اور سنورے ہوئے بال بستی کا فساد ہیں، کیونکہ مردوں کے جسم و جاں صاف چہرے اور سنورے ہوئے بالوں کی بھٹی میں بھس کی طرح جل اُٹھتے ہیں اور بھس غریب تو پھر آگ کے لانبے کے رحم وکرم پر ہی ہوتا ہے نا۔

تب سنا نمبردار دِتّو نائی کے پیروں میں بیٹھ گیا اور اُس کا جوتا اُٹھا کر سر پر رکھا۔ خالی کھیسہ سامنے اُلٹ دیا، بولا: ''مائی باپ! میں بھی یہی چاہتا ہوں، مگر جب غریب کے پاس بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کو رنگ نہ ہو تو پھر جس کا جی چاہے اُس کے چہرے پر لال کالا تھوک تار ہے۔'' تب سنا نمبردار نے بند مٹھی اُس کی جیب میں کھولتے ہوئے کہا۔

''دِتّو نائی! جتنی دیر میں یہ بند مٹھی تیری جیب میں کھلی ہے۔ اتنی دیر میں گناہ کا چھپ جانا بہتر ہوتا ہے۔ گناہ کی نمائش بستی پر عذاب نازل کر دیتی ہے اور گناہ کا جلد سے جلد چھپ جانا ہی اُس کا کفارہ ہوتا ہے۔ ایسی عورت جو توری کی بیل کی طرح بڑھتی اور ہر شے سے لپٹی چلی جائے اور بھرے گھڑے کی طرح چھلک چھلک پڑتی ہو۔ بزرگوں نے یہی فرمایا ہے کہ اُسے فوراً نکاح میں دے دو۔'' اگلے روز گاؤں کی ہٹی، گاؤں کی گلیوں کی طرح ویران تھی اور گلیوں کی مٹی کی طرح فلمی گانوں کا گلا بیٹھ گیا تھا کیونکہ مردوں کو بھولے بسرے کام یاد آ رہے تھے، جو پچھلے ہنگامی و ہیجانی دور میں تعطّل کا شکار رہے تھے۔

''کل رات سے ریشماں گاؤں میں موجود نہ تھی۔'' عورتیں سکون کا گہرا سانس کھینچ کر آلوں کی دُھول میں لتھڑے ادھورے چنگیر اور رومال اُٹھا اُٹھا ہٹی کی چھاؤں میں آ بیٹھیں، جیسے آوارہ کتی کے سامنے کلیجے ڈال کر بے فکر ہو گئی ہوں، کہ اب چوکے کی راکھی کی مصیبت ختم ہوئی، لیکن شام پڑتے پڑتے چنگیریں اور رومال پھر اُدھورے چھوٹ گئے۔ مردوں کے بھولے بسرے کام بھی مکمل نہ ہو سکے، گاؤں کی ہٹی، گاؤں کی گلیوں کی طرح پھر بھر گئی، جس میں فلمی گانوں کی بجائے چہ میگوئیوں کا تال گلیوں کی سوئی ہوئی مٹی کو اُڑانے لگا۔ خبر کانوں کان طویل سفر طے کر گئی۔

ریشماں کسی نائی موچی سے نکاح کرنے گئی تھی بلکہ چھوٹا نمبردار اُسے بھگا کر لے گیا تھا۔ اس خبر کی تصدیق اُس ٹیکسی ڈرائیور نے بھی کر دی، جس نے جبار کو ریلوے اسٹیشن تک چھوڑا تھا کہ اُس کے ساتھ سیاہ برقعے میں لپٹی ایک لمبے قد والی عورت تھی جس کی نقاب میں سے روشنی سی جھلکتی تھی۔

ہٹی پر بیٹھے مرد بڑی دیر مکھیوں لپی دیواروں پہ نظریں جمائے سگریٹ کے دھوئیں سے اُنھیں مزید لیبڑتے رہے، جیسے ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے دوسرے کی پہل کے تذبذب میں ہوں۔

آخر اچھو منیاری والے نے پہلا اخروٹ کھتی کی سمت لڑھکایا۔

''پہلے میرے پاس آئی تھی۔ کہنے لگی قسم رب سوہنے دی یہ تیرا ہے۔ چل مجھے ساتھ لے چل، ورنہ مولوی کو جا کر بتا دوں گی، مولوی دوسرے مولویوں کو بتائے گا، دوسرے مولوی سرکار کو بتائیں گے اور سرکار تجھے مٹی میں گاڑ کر پتھر مار مار۔۔۔ مکا دے گی۔''

سارے مرد دل کر ہنسے، جیسے اُن کی ہنسی کے چھینٹے گزر چکے سانپ کی لکیر پر برس رہے ہوں۔ اب اکو نے کھتی کے منہ پر پڑے اخروٹ پر چوٹ ماری۔

''مجھے بھی یہی کہا، مجھے بھی تو۔۔۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اری تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ میرا ہے۔ مولوی تین گواہ مانگے گا اور تیری تو اپنی گواہی آدھی ہے۔''

تب سارے مردوں نے اِک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارے اور اپنا اپنا بیان دینے کو یکبارگی منہ کھولے، خانو جٹ کی دبنگ آواز نے باقی آوازوں کو دبا لیا اور گڑ کی بوری پہ لپٹی مکھیوں میں، کابلی بھڑ گھس کر بھنبھنانے لگا۔

''جب میرے پاس قرآن پاک سر پر اٹھا کر لائی کہ قسم پیر دستگیر کی بس تو ہی تو تھا تو میں نے کہا۔ تو معشوق ہے اور معشوق بیوی بن جائے تو زندگی اُداس ہو جاتی ہے۔''

تب مردوں کے حلق کے کنویں میں غٹر غٹر ہنسی کے بوکے اُلٹے۔

''یہی قرآن سر پر رکھے رکھے نمبرداروں کی حویلی کا رستہ پکڑ اور جبار کے پاس جا کر یہی قسم کھا اور اُسے کہہ کہ اپنی نسل بچا لے، ورنہ کسی موچی نائی کے نام لگ کر پلے گی اور کمی کمین کہلائے گی۔ مردوں کے حلق میں کھڑ کھڑاتے ہوئے قہقہے یکبارگی باہر اُلٹے۔ تو ہٹی کی دیواروں پر لپی اُدھ مری سی مکھیاں ذرا ذرا رینگیں جیسے اپنے زندہ ہونے کا احساس خود کو کروا رہی ہوں اور پھر اپنی ہی گندگی میں منہ مارنے لگیں اور اُن میں گھسا ہوا بھیڑ اُلٹا ہو کر چکرانے لگا۔ گلو کو ہنستے ہنستے اُچھو آ گیا۔

''مَیں نے بھی۔۔۔ مَیں بھی کبھی تو۔۔۔ یہی مشورہ دیا۔ کہا اِک بندہ پنڈ میں ایسا ہے کہ جس کا نام اگر تو لے گی تو تیرے سے کوئی گواہ نہ مانگے گا۔۔۔ اور جبار جسے باپ نے گھر میں ماسٹر رکھ کر پڑھوایا کہ سکول میں لڑکے اُسے کہیں خراب نہ کر دیں، نوکرانیوں کی صحبت میں رکھ پالا کہ نوکروں کی بیٹھک میں کہیں بگڑ نہ جائے وہ غریب پھول کے زردانوں میں پوریں ڈبو کر ہی سمجھا کہ شہد کی مکھی وہی ہے اور گوڈے گوڈے دھنسے ہوئے صاف بچ نکلے۔''

ہٹی کے حجم کی نسبت کہیں بڑے قہقہے ہٹی کے کچے بدن کو پھاڑ کر گولوں کی طرح باہر نکلے، اور اندھیرے سایوں کو روندتے ساتھ والے باڑے کی اَمس میں اُترے، تو مویشی کھونٹوں کے گرد چکرانے لگے۔ چاچے حکم داد نے ٹھنڈے چلم کا سوٹا گھڑ گھڑایا۔

''تمیز سے بھئی تمیز سے۔ اب وہ ریشماں نہیں رہی۔ نمبردارنی ہے اور بڑے لوگوں کی بہو بیٹیوں کا نام ہم چھوٹے لوگوں کی زبانوں پر آئے تو زبان پر چھالا

پڑ جاتا ہے۔ ریشو کی کہانی مک گئی۔ نمبردارنی کا قصہ شروع ہوا، بڑے لوگوں کا ذکر بھی زبان دانتوں تلے دبا کر سنتے ہیں، ہنکارا بھی بھرو تو سوچ سمجھ کر بھرو، جس کے برابر آسکو نہ آگے بڑھ سکو اُس کے پیچھے پیچھے آنکھ منہ بند کر کے چلا کرتے ہیں بھئی۔۔۔''

سارے مرد زبانیں دانتوں تلے دبا کر اپنے اپنے گھروں کو چلے، پیروں سے اُٹھتی سوئی ہوئی دھول دھکا کھا کر ذرا سا آگے جا کر منہ کے بل گرتی تو اندھیرا بھری گلیوں میں اڑوڑی کے ڈھیروں پر گند پھرولتے کتوں کے غول بھونکنے لگتے۔

باڑوں میں بھری تاریکی میں مویشیوں کے مہیب سایوں میں سوئے راکھے ہنکارتے، کھانستے اور حقے گھڑ گھڑاتے تو کماد کی کٹی ہوئی پوریوں کی باسی مہک کڑوے تمباکو میں گھل مل جاتی تھی۔ تبھی مسجد کے لاؤڈ سپیکر کی آواز نے سوئی ہوئی فضا کو ہڑ بڑا کر جگا دیا، جہاں انتہائی افسوس کے ساتھ اعلان کیا جا رہا تھا کہ نمبردار صاحب قضائے الٰہی سے فوت ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے ہر گھر سے نکلتا ماتمی جلوس حویلی کو جانے والی گلیوں میں بھر گیا، جیسے پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے، سفید چادریں اور چار خانے صافے اوڑھ کر۔۔۔ جب مردوں کا بھرواں ریلا میرو میراثی کی جھگی کے سامنے سے گزرا، تو وہ دو ہتھڑ مارتے ہوئے مجمع کے سینے میں آن کھبا، تب تک کیکروں کی ٹیشیوں سے اُترتا چاند گلی میں بھرے چہروں کو پہچان دے گیا تھا۔

''ہائے ہائے نمبردار صاحب مر گئے۔۔۔ جنت ملے تے بھانویں دوزخ دونوں تھاں سرداریاں قائم رہن، ڈاہڈے پیے بندے تھے۔۔۔ پر مر گئے۔۔۔ اپنی اعلیٰ نسل میں نیچ رلا تو قبول کر ہی لیتے پر ہائے ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ مرنا ہی تھا۔۔۔ مرتے نہ تو کیا کرتے آنے والے کو۔۔۔ ہائے ہائے آنے والے کو۔۔۔''

میراثی نے پوری قوت سے سینہ دھڑ دھڑ کوٹا۔ ''ہائے آنے والے کو بیٹا کہتے کہ پوتا۔۔۔ ہائے پوتا کہ بیٹا۔۔۔ جنت ملے کہ دوزخ، اللہ بہشتی کی سرداریاں قائم رکھے۔ اس گناہگار نے خود۔۔۔ ہائے خود۔۔۔ چھوٹی نمبردارنی اور بڑے نمبردار کی بیٹھک کا پہرہ کئی بار دیا۔ ہائے خود۔۔۔ دوزخ ملے کہ جنت سدا سرداریاں قائم رہیں ھائے مر گئے۔''

ماتمی جلوس نے دانتوں تلے زبان دبا دبا ہنسی کاٹی۔ عورتوں نے تاریک فضاؤں میں بازو لہرا لہرا بین ڈالے۔ ''ہائے نی آج سارا جگ رانڈ ہو گیا'' اور اِک دوجی کے چٹکیاں لیں اور خانو کی دبنگ آواز نے درختوں سے چمگادڑوں کو اُڑا دیا اور پرندے قبل از وقت بولنے اور پھڑ پھڑانے لگے۔

''کلمہ شہادت لا الٰہ الا اللہ'' سارا گاؤں قدموں کی چاپ، سرگوشیوں اور آوازوں سے چھلکنے لگا۔ بڑی نمبردارنی پہلی غشی کے بعد ابھی ہوش میں آئی ہی تھی کہ مجمع میں شور اُٹھا۔

''چھوٹا نمبردار واپس آ گیا''

مجمع خبر کی شدت کے تیز بہاؤ، میں بے اختیار باہر کی سمت بہا، کئی بچے اور کمزور عورتیں پیروں تلے کچلے گئے۔ جبار کے پیچھے سیاہ بُرقع میں لپٹی ریشماں نے دو ہتھڑ مار مار صحن کے بیچوں بیچ بین شروع کیے۔ تو حویلی کے کہنہ ستون لرز گئے اور دھریک پر سے چڑیاں اور لالیاں اُڑ گئیں۔ مجمع دائرہ بنا کر یوں ساکت ہو گیا جیسے موت کے کنویں کی کمزور دیواروں پر کوہ قاف کی حسینہ ایک پہیہ والا سائیکل چلاتی ہو۔

بڑی نمبردارنی چلائی تو جیسے موت کے کنویں کی نازک دیواروں کے اندر کی خوفناک گھڑ گھڑاہٹ باہر اُمڈی ہو۔

''حرام خورو! کوئی تو میرے منہ میں بھی پانی کی بوند ٹپکا دے۔'' اور پھر پیاسی ہی دانت بھینچ کر بے ہوش ہو گئی۔ تب چھوٹی نمبردارنی نے سارے انتظامات یوں سنبھال لیے جیسے مُدتوں سے اس گھر کے اندر اور باہر کی ہر ہر تفصیل سے آگاہ ہو۔ اُس کی زبان سے صادر ہوتے احکامات محترم و مدبر تھے، جیسے بڑی نمبردارنی کے، جو اس وقت بے ہوش پڑی تھی۔ نوکرانیاں بجا آوری میں پسینو پسین ہو رہی تھیں، جیسے وہ سدا سے ایسی ہی حکمرانی کی عادی رہی ہو اور اُس کی بجا آوری کی، جیسے نمبردارنی کا نام نہ ملا ہوا اعتبار اور احترام کے سارے سلسلے بھی دُور تک جڑ گئے ہوں۔

''میت کی چارپائی چھاؤں میں کرو۔ اُوپر پنکھا چلا دو، بیلی ہوئی روئی اطراف میں رکھو، کلمے شریف والی چادر اُوپر ڈالو، خوشبو چھڑکو نوکرانیاں زبان دانتوں تلے دبا بھاگی پھرتیں تھیں، جیسے اندر کا تذبذب اور باہر کی حیرت قدموں کی رفتار میں بھر گئی ہو۔

تبھی باہر سے آواز آئی۔ ''پردہ، جنازہ اُٹھانے کو مرد اندر آتے ہیں۔''

بے ہوش پڑی نمبردارنی کو نوکرانیوں نے وہیں چادر ڈال کر ڈھک دیا۔ البتہ وہ یہ فیصلہ نہ کر پائیں کہ چھوٹی نمبردارنی کو مطلع کیا جائے یا نہ۔۔۔ جب مردوں کی ایک ٹولی اندر داخل ہوئی تو سامنے چھوٹی نمبردارنی میت کے سرہانے کھڑی گلاب کی پتیاں میت پر بکھرتے ہوئے بین کرتی تھی۔۔۔ ابا جی میرے سوہنے ابا جی اپنے پوتے کی صورت تو دیکھ مرتے اپنی اکلوتی بہو کا تھوڑا سا انتظار تو کیا ہوتا، ہائے میرے پیارے ابا جی۔ مرد یوں اوندھے منہ واپس پلٹے جیسے جوتوں سمیت مسجد میں پیر رکھ دیا ہو، ایک دوسرے سے ٹکراتے دروازوں کی چوکھاٹوں سے بجتے کچھا کچھا ہو باہر گرے۔ البتہ دِتّو نائی نے صحن میں رُک کر ہانک لگائی۔

''چھوٹی نمبردارنی جی! پردہ۔۔۔''

ریشو نے چادر منہ سر پر لپیٹ کر پاس کھڑی نوکرانی کے دھپ مارا۔

''اری زنان خانے میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی انھیں۔۔۔ اری پوچھ ان سے ۔۔۔ پوچھتی ہے کہ مَیں کہوں چھوٹے نمبردار صاحب سے۔۔۔ وہ خود پوچھیں ذرا سنوار کر۔۔۔''

نوکرانی زبان دانتوں تلے سے نکال کر بدبدائی۔

''لیکن یہ تو دِتّو نائی صیب ہیں جی۔''

ریشو نے گھما کر دوسرا دھپ مارا۔

''اری کم بخت کوئی بھی ہو تجھے پتہ نہیں، اس حویلی کا پردہ پکا ہے۔''

نوکرانیاں اپنے جرم پر سہمی کھڑی تھیں اور مرد چہروں پر صافے لپیٹے زبان دانتوں تلے دبائے ہو نکلتے تھے۔

''فلاورآئی لینڈ سے واپسی''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

مجھے یہ ایک جگہ پسند آئی ہے ٹوبر موری (Tober Mori) میں فلاور آئی لینڈ (Flower Island) کے نام سے۔ٹورانٹو سے چار گھنٹے کی ڈرائیو ہے تم بھی دیکھ لو اگر تمہیں بھی پسند آجائے تو ہم اپنی اینیورسری وہیں منائیں گے۔میں نے زین کی طرف کمپیوٹر بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ابھی دو مہینے پہلے ہی تم لوگوں نے اپنی شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی ہے اب اتنی جلدی اینیورسری کہاں سے آ گئی؟'' شازیہ بیگم جو اپنی نواسی کو کھانا کھلا رہی تھیں بول پڑیں۔

''ماں! وہ ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ یہ جب زین نے مجھے پروپوز کیا تھا اور یہ تو ہم اس طرح مناتے ہیں جیسے ہم دونوں نے کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کرلیا یا پھر کسی تفریحی مقام پر تھوڑا وقت گزار لیا۔'' میں نے ہنستے ہوئے پیار سے امّی سے کہا۔

بہت وقت ہے بھئی لوگوں کے پاس۔شادیاں آٹھ آٹھ، دس دس دن تک چلتی ہیں اور اب شادی کی سالگرہ بھی ایک نہیں دو دو، تین تین۔۔۔ شازیہ بیگم نے ہلکا سا تنقیدی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا اور اپنی نواسی کا ہاتھ پکڑ کر اسے سلانے لے گئیں۔جگہ تو اچھی لگ رہی ہے، اگر تمہیں پسند ہے تو سنیچر کی بکنگ کروا لو اور ٹوبر موری میں کروز اسٹیشن کے نزدیک ہی کوئی اچھا ہوٹل بھی دیکھ لو۔رات ہوٹل میں گزار کر ہم دوسرے دن آرام سے گھر آئیں گے۔'' زین نے مجھے کمپیوٹر واپس کرتے ہوئے کہا۔

سنیچر کی صبح سویرے میں، زین اور بچے ٹوبر موری کے لیے نکلے۔دس بجے ہم فلاور آئی لینڈ کے آفس پہنچ گئے۔زین نے آفس کے اندر جا کر ٹکٹ لیے، ہم لوگ باہر گاڑی میں بیٹھے رہے۔رش نہیں تھا، زین جلد ہی آ گئے۔گاڑی پارک کی اور بس کے انتظار میں لائن میں لگ گئے۔تھوڑی ہی دیر میں بس آ گئی اور اس نے ہمیں فلاور آئی لینڈ کے اسٹیشن پر پہنچا دیا۔وہاں پہلے سے ہی لوگ موجود تھے سب لوگ بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔چہروں پر سکون و اطمینان تحریر تھا۔زیادہ تر فیملی گروپس دو، تین یا چار لوگوں پر مشتمل تھے۔چند ایک تنہا مرد اور عورتیں بھی تھیں اپنے کتّے، بلّی اور طوطے کے ساتھ۔البتہ ایک فیملی ایسی تھی جس میں آٹھ لوگ تھے یہ مقامی کینیڈین تھے۔ان میں دو بڑی عمر کے، دو جوان مرد عورت، دو لڑکیاں اور ان کے علاوہ ایک تقریباً نو، دس سال کا لڑکا اور چھ، سات برس کی بچی۔ یہ سب خوب ''انجوائے'' کر رہے تھے۔ہنس بول رہے تھے۔بچے بھی شور مچا رہے تھے۔جوان جوڑے کی خاتون نے بہت اچھی ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔خاص طور پر گلے کا نیکلس بہت خوبصورت تھا اور قیمتی بھی دکھائی دے رہا تھا۔

کروز ساحل پہ لگ چکا تھا۔ایک خاتون کمرے سے باہر آئیں اور سب کو لائن اَپ ہونے کے لیے کہا اور پھر ایک چھوٹی سی اسٹیمپ جوان کے ہاتھ میں تھی اس سے سب لوگوں کے ہاتھوں کے پیچھے کی طرف مہر ثبت کرتی چلی گئیں۔یعنی اب کروز میں جا سکتے ہیں۔

سب لوگ ایک ایک فیملی کی صورت میں زینے سے نیچے اتر رہے تھے اور کروز پر بیٹھتے جا رہے تھے۔وہاں پر موجود ایک گائیڈ سب کی مدد کر رہا تھا۔جب ایک فیملی کروز کے اندر چلی جاتی تو لائن تھوڑی آگے بڑھتی۔میں سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔میں نے نظر اٹھا کر دیکھا جھیل صاف نظر آ رہی تھی۔تاحد نظر پانی ہی پانی اور اس پانی پر نیلگوں ڈوبتی، ابھرتی ریشمی لہریں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتی ہوئی۔۔۔ہلکی ہلکی گنگناہٹ۔۔۔میں قدرت کے اس حسین نظارے کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی ''یہ دنیا کتنی حسین ہے۔''

''تحریم! چلو۔۔۔'' زین نے مجھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔زین کی آواز سے میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔میں نے حانیہ کو گود میں اٹھایا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔میرے آگے، زین حسن کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے اتر رہے تھے۔

جب سارے لوگ کروز پر بیٹھ گئے تو کروز کا دروازہ بند کر دیا گیا۔یہ کروز ایک ہی منزل والا تھا اس کی دیواریں بھی بہت زیادہ اونچی نہیں تھیں۔کروز کا فرش درمیان میں شیشے کا بنا ہوا تھا۔آٹھ افراد والی فیملی بالکل ہمارے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔اس خاتون کا نیکلس روشنی میں اور زیادہ چمک رہا تھا اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔

میرا نام اسٹیفن ہے۔اسٹیفن نے مائیک کو اپنے منہ کے نزدیک لاتے ہوئے کہا۔یہ وہی گائیڈ تھا جو کروز میں چڑھنے میں سب کی مدد کر رہا تھا۔سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔''میں آپ لوگوں کو اس آئی لینڈ کے بارے میں جہاں ہم جا رہے ہیں اور اس جھیل کی بارے میں جس پر اس وقت ہمارا کروز ہے آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔

یہ جھیل جس پر ہمارا کروز چل رہا ہے یہ ایک بہت ہی صاف شفاف جھیل ہے۔اس میں کوئی جانور، کوئی پودے وغیرہ کچھ بھی نہیں ہیں۔سوائے چند ایک چھوٹی چھوٹی خوبصورت مچھلیوں کے۔یہ ننھی منی رنگ برنگی مچھلیاں جھیل کی خوبصورتی ہیں۔

جھیل میں بھی اور آئی لینڈ پر بھی کسی قسم کا کوئی بھی کوڑا کرکٹ نہیں پھینکنا ہے۔کسی قسم کی کوئی گندگی نہیں کرنا ہے۔صفائی کا بہت خیال رکھنا ہے۔جھیل اور آئی لینڈ دونوں کی۔۔۔'' اسٹیفن نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر مخاطب ہوا۔

''اب میں آپ کو فرش پر جو شیشہ لگا ہوا ہے اس میں کچھ دکھاؤں گا۔

آپ دیکھئے! ان شیشوں میں سے جھیل کی تہہ صاف نظر آرہی ہے اور بہت نزدیک بھی جبکہ یہ نیچے بہت گہرائی میں ہے۔''

سب لوگ باری باری شیشے میں سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور حیران ہورہے تھے۔''جھیل کی تہہ صاف نظر آرہی تھی اور بہت نزدیک بھی۔''

سب لوگ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے ۔کروز نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا اور پھر پانی کی اونچی نیچی لہروں کے ساتھ رواں دواں اپنی منزل کی جانب گامزن۔۔۔کبھی کبھی ہوا کے کسی جھونکے کے ساتھ پانی کی بوندیں سب کو گیلا کردیتیں، بچے بہت خوش ہوتے، تالیاں بجاتے، چیختے، ہنستے اور شور مچاتے، دوسرے لوگ بھی محظوظ ہوتے۔

تھوڑی دیر کے بعد کروز کی رفتار دھیمی ہوگئی۔''اسٹیفن نے ہمیں سمندر کی تہہ میں کروز میں نصب شدہ شیشے سے ایک جہاز دکھایا جو ۱۹۳۴ء میں ڈوبا تھا۔ وہ جہاز آج بھی سمندر کی تہہ میں اسی طرح موجود تھا۔'' راستے میں چھوٹے چھوٹے جزیرے آتے گئے، اسٹیفن سب کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتا گیا۔ ایک جزیرے پر بہت بڑا ہوٹل تھا اسٹیفن نے بتایا لوگ وہاں پر آکر رہتے بھی ہیں۔ کچھ اپنی کشتیوں میں آتے ہیں اور کچھ کروز سے۔ اس نے سب سے آخر میں فلاور آئی لینڈ (Flower Island) کے متعلق بتایا کہ اس کا نام فلاور آئی لینڈ اس لیے ہے کہ جزیرے میں سامنے ایک چٹان ہے جو بالکل پھول کی مانند نظر آتی ہے۔ پچاس منٹ میں ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ کروز نے گھما کر چاروں طرف سے آئی لینڈ کے باہر کی طرف سے سیر کرادی پھر ساحل سے لگ گیا۔

لوگ اترنے لگے، کچھ لوگ ساحل کی طرف گئے، کچھ اندر آئی لینڈ کی سیر کے لیے گئے، کچھ لوگ سامنے ریستوران میں جاتے نظر آئے۔ ہم لوگ بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے سامنے لکھا ہوا دیکھا پکنک پوائنٹ ''Picnic Point''

''زین چل کر دیکھتے ہیں۔ یہ پکنک پوائنٹ کیسا ہے؟ میں نے زین سے کہا۔

''یہ ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا۔ دو طرف سے کھلا اوپر چھت، نیچے پکا سیمنٹ کا فرش اور اندر بڑی بڑی بنچیں میز کے ساتھ۔''

وہاں پر زیادہ افراد والا خاندان پہلے سے موجود تھا۔ ہم لوگوں نے ہائے ہیلو کیا۔ بزرگ جوڑا بیٹھا ہوا تھا، لڑکیاں بیگ کھول کر کچھ چیزیں نکال رہی تھیں۔ بڑی عمر کی خاتون نے بتایا میری بیٹی میرّی کی آج سالگرہ ہے ہم لوگ یہاں منانے والے ہیں ابھی وہ اس کا شوہر مارک اور دونوں بچے نیچے پانی کی طرف گئے ہیں۔

میں نے سینڈوچز نکالے، بچوں کو دیئے، بچے بہت بھوکے ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کو بھی پیش کیے۔ لڑکیوں نے ''تھینکس'' کہہ کر منع کردیا بزرگ خاتون نے ایک سینڈوچ لیا۔ آدھا خود کھایا آدھا اپنے شوہر کو دیا۔ ہم لوگوں نے ناشتہ کے بعد سارا سامان ایک کونے میں رکھا۔ ایک بیگ ساتھ لیا جس میں پانی اور کھانے پینے کی بچوں کی چیزیں تھیں۔

''ہم سب سے پہلے فلاور روک (Flower Rock) کی طرف چلتے ہیں پھر وہیں سے اندر آئی لینڈ میں چلے جائیں گے۔'' زین نے کہا۔

وہاں خاصا ہجوم تھا۔ ہم لوگ ایسی جگہ کھڑے ہوگئے جہاں سے وہ چٹان صاف نظر آرہی تھی۔ پتھر کا پھول پن حیران کن اور دلکش تھا جس کو ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد انسان بھول نہیں سکتا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑا سا پھول رکھا ہوا ہے۔ اسٹیفن نے بتایا تھا ''یہ چٹان پھول کی صورت میں شروع سے ایسی ہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔''

اچانک چیخ و پکار اور شور کی آوازیں دُور سے آتی ہوئی سنائی دیں۔ کچھ لوگ اس طرف دوڑ کر جارہے تھے۔ یہ آوازیں وہیں سے آرہی تھیں جہاں سے ہم آئے تھے۔

''چلیں! دیکھتے ہیں کیا ہوا ہے؟'' زین نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں تمہارا کیا خیال ہے۔

میں نے سر ہلا کر زین کی تائید کی۔

جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا پکنک پوائنٹس پر لوگ جمع تھے۔ میرّی بُری طرح رو رہی تھی اور باقی سارے افراد دونوں بزرگ، لڑکیاں اور بچے حیران بھی تھے اور غمزدہ بھی۔۔۔معلوم ہوا کہ میرّی کا شوہر پانی میں گر گیا ہے۔ وہ سب پانی سے کھیل رہے تھے ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے اچانک ان کی بیٹی ایمی پانی کی طرف دوڑنے لگی۔ مارک اس کو بچانے کے لیے دوڑا، بچی کو بچا کر میرّی کی طرف دھکیلا مگر خود اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ فوراً ہی دو آدمی جن کو تیرنا آتا تھا مارک کو بچانے کے لیے پانی میں کود ے لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ پولیس، ایمرجنسی اور کروز کے عملے کے لوگ گھر والوں کو تسلی دے رہے تھے ''فکر نہ کریں ایک کروز اور دو کشتیاں تلاش میں نکل چکی ہیں۔ پانی بالکل صاف ہے وہ بہت جلد مل جائے گا۔ ہم لوگ ان سے رابطے میں ہیں۔''

حسن پانی میں جانے کی ضد کررہا تھا۔ میں خوفزدہ تھی، میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا میں نے حسن کو منع کیا۔

''تھوڑی دیر کے لیے چلتے ہیں۔ آگے نہیں جائیں گے صرف پاؤں گیلے کریں گے۔ اس طرح بچوں کی خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔'' زین نے کہا۔

بچے پانی سے کھیل رہے تھے، زین بھی ان کے ساتھ تھے میں تھوڑا پیچھے کھڑی ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک میرے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے پاؤں کے پاس چھوٹے چھوٹے پتھروں پر سے بہتے ہوئے پانی کے اندر دیکھا کوئی چیز چمک رہی تھی۔ میں نے اسے جھک کر ڈرتے ڈرتے اٹھایا۔

''ارے! یہ تو وہی نیکلس ہے جو میرّی پہنے ہوئے تھی''

میں نے نیکلس ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ زین کے نزدیک جا کر اس کو بتایا۔

''ابھی اس کو پرس میں رکھ لو۔ پولیس وغیرہ موجود ہے، معلوم ہوا اس پر انکوائری شروع ہوگئی۔ اگر میری کو دینے کا موقع نہیں ملا تو ہم اسے فلاور آئی لینڈ کے آفس میں جمع کروادیں گے۔'' زین نے کہا۔

ہم لوگ پکنک اسپاٹ پر پہنچے تو وہ لوگ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک آفیسر نے بتایا ''مارک مل گیا ہے۔ زندہ بھی ہے مگر زخمی اور بے ہوش ہے۔ لہروں نے اسے ایک آئی لینڈ پر پھر پھینک دیا تھا۔ اسے ٹوبرموری ہسپتال پہنچادیا ہے۔ ان لوگوں کو بھی وہیں لے جارہے ہیں۔''

''اب میری کو نیکلس دے دو۔'' زین نے مجھے آہستہ سے کہا۔

''میری! یہ شاید تمہارا نیکلس ہے، مجھے نیچے پانی میں ملا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ! یہ کب گر گیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا'' میری نے اپنے گلے کو ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

میری نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگالیا اور بہت شکریہ ادا کیا۔ میری نے بتایا مارک نے آج ہی یہ نیکلس اسے تحفے میں دیا ہے۔ کروز کے عملے نے اعلان کیا کروز واپس روانہ ہورہا ہے، جو لوگ واپس جانا چاہیں، آجائیں۔

میں نے وقت دیکھا چار بج رہے تھے۔

''ہم بھی اسی کروز سے واپس چلتے ہیں دل بڑا اداس ہوگیا ہے۔'' میں نے زین سے کہا۔

''ٹھیک ہے! میرا بھی رکنے کا موڈ نہیں ہو رہا ہے۔ پھر کبھی آئیں گے۔'' زین نے کہہ کر سامان وغیرہ اٹھانے لگے۔

کروز پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے پورا کروز بھر گیا تھا۔ دوسرے لوگ بھی شاید اس واقعے سے متاثر ہوئے تھے۔ کروز میں تمام لوگ خاموش بیٹھے تھے۔ پچاس منٹ کے اس سفر میں کسی نے کوئی بات نہیں کی۔

کروز اسٹیشن پر اتر کر لوگ ایک ایک کر کے بس میں سوار ہو رہے تھے۔ اس سانحے سے متعلق لوگوں کو پولیس کی گاڑی میں بٹھایا جارہا تھا، ٹوبرموری ہسپتال لے جانے کے لیے۔ اچانک پولیس کی ایک اور گاڑی آکر رکی اس میں سے ایک آفیسر باہر آیا۔

''میڈم میری!'' اس نے آواز لگائی۔

میں نے اور زین نے میری کو اس افسر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ جب میری اس افسر کے سامنے پہنچی، اس افسر نے اپنی ہیٹ اتاری اور میری سے انتہائی ادب سے کچھ کہا۔ میری زمین پر بیٹھ گئی یا شاید گر پڑی۔ اس کی چیخ نے ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ہم لوگ ہوٹل جانے کے بجائے سیدھے گھر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر بھی ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ رات ہوچکی تھی، بچے بھی تھکے ہوئے تھے۔ ان کو کھلا پلا کر ان کے کمروں میں پیک کر دیا۔ ماں کو شب بخیر کہنے گئی تو دیکھا وہ گہری نیند میں خراٹے لے رہی ہیں۔

میں اپنے بیڈروم کی جانب چلی لیکن میرے قدم میرے جسم کو گھر کے ایک گوشے میں لے گئے جہاں ایک آرام کرسی پڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی میز پر ایک چھوٹا سا لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں آرام کرسی کے آغوش میں گر گئی۔

''یہ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ مجھے اس وقت سونا چاہیے، یہ وقت یہاں بیٹھنے کا نہیں ہے۔'' میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر کچھ بدل گیا ہے۔ میں اب پہلے جیسی تحریم نہیں رہی، بڑی ہوگئی ہوں۔۔۔ اپنی عمر سے بھی زیادہ بڑی۔۔۔''

"Young Scientist"

A nine-year-old Pakistani girl breaking the record of Indian professor became the fastest and youngest in the world to arrange the chemical elements of the periodic table in the shortest possible time.

Natalia Najam, the Lahore-based science enthusiast, achieved the Guinness World Records title after arranging all elements of the periodic chart in just 2 minutes and 42 seconds on July 18, 2020, according to Gulf News.

She broke the previous record by 7 seconds.

After setting the record, the young girl screamed with joy as the judges gave her a resounding thumbs up.

Najam accomplished the feat by breaking the record previously held by Indian economics professor Meenakshi Agarwal who completed the same task in 2 minutes and 49 seconds.

The young Pakistani girl hopes that her achievement will inspire children around the world to continue taking strides in science and pursue careers in science, technology, engineering and math (STEM).

Many Pakistanis on social media hailed her achievement calling her "Pakistan's young scientist" and an inspiration for young children especially girls to take up science subjects.

Her father Hasan Najam says his daughter has not received formal schooling and has been educated at home, local media reported.

جوگن

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

جب زندگی کے بہت سارے دن بیت چکے ہوتے ہیں اور ماہ و سال کی تیز آندھیاں عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ خشک پتوں کی طرح اڑا کر لیجاتی ہیں تو یادوں کی شمعیں جلانے کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ وہ راہ جس پر میں چل کر یہاں تک آچکا ہوں طویل ہے اور آنے والا راستہ مختصر۔ سامنے دیکھنے کو کچھ نہیں پر مڑ کے دیکھنے پر ایک طویل راہ گذر نظر آتی ہے اور زندگی میں آنے والے موڑ اور تشنہ آرزوؤں کے منظر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ شام ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے میں اپنے پائیں باغ میں لگے ناشپاتی کے درخت کے سامنے ایک لمبی کرسی ڈال کر نیم دراز ہو جاتا ہوں اور خیالوں میں کھو جاتا ہوں۔ کبھی یہ درخت سر سبز تھا اور موسم بہار میں اس پر عنابی شگوفے کھلتے تھے۔ اسکی ٹنڈ منڈ شاخیں اِن پھولوں سے لد جاتی تھیں۔ جب میں صبح اٹھتا تھا اور چہل قدمی کے لئے اپنے پائیں باغ میں جاتا تھا تو بہت سے پھول زمین پر بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تمنائیں جوان تھیں، آرزوئیں عروج پر تھیں اور امید کی دھنک پوری رنگینی سے آسمان حیات پر جلوہ گر تھی۔ اب شاید میری طرح یہ درخت بھی بوڑھا ہو چکا ہے۔ موسم بہار سے پہلے پتے تو جھڑتے ہیں مگر بہار میں بھی شاخوں پر شگوفے نہیں پھوٹتے۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا وقت اتنی تیزی سے گذر سکتا ہے مگر پھر میری گرتی ہوئی نظر، کمزور اور چٹختی ہوئی ہڈیاں اور دل کی بے ترتیب دھڑکن یہ یاد دہانی کراتی ہے کہ میں زندگی کے اس دور میں ہوں جہاں اب زندگی کا سورج غروب ہوا چاہتا ہے۔

تنہائی کا ایک زہر ہے جو میں نے پیا اور آج بھی پی رہا ہوں۔ یہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی خیال تو آتا ہی ہے۔ دل کے کسی گوشے سے کچھ سوال تو اٹھتے ہی ہیں۔ بہت سے چہرے یادوں کے جھروکوں سے نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ یوں تو اسکی یاد کبھی بھی دل سے محو نہیں ہوئی مگر آج کچھ کتابیں تلاش کرتے ایک بہت پرانی کتاب سے موگرے کا ایک سوکھا پھول میرے پیروں میں آگرا۔ بس پھر یوں لگا کہ گذرے ماہ و سال ایک بار پھر میرے سامنے آکھڑے ہوں۔ میرا بچپن اس کے ساتھ گذرا تھا، محلے میں ہم عمر کئی بچے تھے لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ مگر یہ وہ وقت تھا جب ابھی یہ احساس نہیں جاگا تھا کہ زندگی کے طویل سفر میں کسی کا ساتھ ضروری ہوتا ہے، وقت کی دھوپ سے بچنے کے لئے کسی آنچل کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ بس گرما کی طویل دوپہروں میں ایک ساتھ بیٹھ کر بے تکی باتیں کرتے اور جانے انجانے قصے کہتے اور چاندنی راتوں میں ریت کے ٹیلوں پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے، گرتے اور قہقہے لگاتے وقت کٹ جاتا تھا لگتا تھا وقت ہمیشہ ایسا ہی رہے گا، زندگی کتنی سادہ تھی اور ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ مگر قدرت کا اپنا بھی ایک تقاضہ ہے اسکا اپنا بھی ایک اصول ہے بس نہ جانے کب مجھ میں بھی یہ احساس جاگا، ایک ایسا احساس، جسکا اسوقت کوئی نام نہ تھا کہ مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔

میرے ابا ایک چھوٹے سے شہر میں ریلوے کی معمولی ملازمت کرتے تھے۔ ہم ریلوے ہی کی طرف سے دئے گئے ایک معمولی سے گھر میں رہتے تھے۔ اسکے ابا بڑے افسر تھے، انکا بنگلہ شاندار تھا جسکے چہار طرف املتاس اور کچنار کے اونچے اونچے درخت تھے جن پر موسم بہار میں پیلے اور اودے پھلوں کی ڈالیاں سی لٹک جاتی تھیں۔ گیٹ میں گھستے ہی سرخ اینٹوں کی روش تھی جسکے دونوں طرف ترشے ہوئے پودوں کی سبز باڑھ تھی۔ گھر کے صدر دروازے کے دونوں جانب موگرے کے پودوں کے گملے رکھے تھے جو موسم گرما کی شاموں میں مہکتے پھولوں سے لد جاتے تھے۔ مگر یہ وہ دور تھا جب محبتیں اور مروتیں مادّی چیزوں سے زیادہ اہم ہوتی تھیں اور بچوں کے لئے ساتھ ملنے اور کھیلنے میں کوئی تفریق و پابندی نہیں تھی۔ جب گرمیوں کے جھلستے دنوں کی شام ڈھلتی اور پھر ایک خنک اور مہکتی رات فضا کو اپنی آغوش میں لی لیتی تو محلے کے بچے کھیلنے نکل آتے۔ بس اسکی موجودگی ہی میرے معصوم ذہن کے لئے ایک انجانی مسرت کا پیغام ہوتی۔ میں آنکھ مچولی کے کھیل میں کوشش کر کے صرف اسے ہی پکڑنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی ہم سب کسی بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر دیر تک بے معنی باتیں کرتے۔ مجھے باتوں کا شوق تھا اور میں نہ جانے کیسی کیسی اوٹ پٹانگ اور من گڑھت باتیں کر کے تمام بچوں کی توجہ اپنی طرف کر لیتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے وقت میں وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تکے جاتی۔ مجھے لگتا کہ بس اب یہاں صرف وہ اور میں ہی رہ گئے ہیں۔ میرا دل چاہتا کہ یہ وقت یہیں ٹھہر جائے اور ہم یوں ہی ایک دوسرے میں کھوئے رہیں یہاں تک کہ دنیا کا اختتام ہو جائے۔

مگر مشہور ہے کہ ریلوے کالونیوں کی دوستیاں اور ساتھ تو ہمیشہ ناپائیدار ہوتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی اسٹیشن کی انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا ساتھ، کہ جانے کب کس کی گاڑی آجائے اور وہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے۔ شاید میں چھٹی جماعت ہی میں تھا جب میری والدہ نے بتایا کہ اسکے والد کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ جلد یہاں سے ایک بڑے شہر چلے جائینگے۔ اسکی ماں میری اماں کی بڑی دوست تھیں اس لئے میری اماں کو بھی انکے جانے کا قلق تھا مگر میرے تو اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔ بس ایک معصوم سا احساس تھا کہ کوئی چیز کھو جانے والی ہے، اب راتوں کو ریت کے ٹیلوں پر دوڑنے، آنکھ مچولی کھیلنے اور بجلی کے زرد قمقمے کے نیچے بیٹھ کر اوٹ پٹانگ باتیں کرنا بے مزہ ہو جائیگا۔ اسکے کنبے کے جانے سے پہلے ایک شام ہم سب اسکے یہاں گئے۔ جب اس کی امی پاندان کھول کر اماں سے باتوں میں محو ہوئیں تو ہم دونوں حسب معمول اسکے باغیچے میں نکل

آئے۔سبزلان کے درمیان لگے ایک چھوٹے سے تالاب میں کنول کے سفید اور عنابی پھول پانی کی سطح پر شام کی مہکتی فضا میں ہلکورے لے رہے تھے۔ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کبھی میرے ابا کا تبادلہ بھی اسی شہر میں ہوسکتا ہے جہاں وہ لوگ جارہے تھے۔میں چھوٹا تھا مجھے ان باتوں کی تو کوئی خاص خبر نہ تھی مگر مجھے کچھ ایسا احساس تھا کہ شاید ایسا ممکن نہ ہو کیونکہ میرے ابا کی ملازمت ایسی نہ تھی کہ انکا تبادلہ کسی بڑے شہر میں ہوتا۔وہ نئے شہر،نئی جگہ کے لئے بہت پرجوش تھی۔اسے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ اب نئے ساتھی ملیں گے اور نیا اسکول ہوگا۔اسے اس شہر سے،یہاں کے لوگوں سے بچھڑنے کا جیسے کوئی غم نہ تھا۔میری اماں کے بلانے پر جب ہم گھر میں واپس داخل ہونے لگے تو اس نے دروازے کے پاس لگے گملے سے موگرے کا ایک پھول توڑ کر مجھے دیا۔میں نے ہنس کر کہا کیا یہ تمہاری نشانی ہے۔وہ کہنے لگی تم ہی تو کہتے تھے کہ تمہیں موگرے کے پھول اچھے لگتے ہیں۔ہم واپس گھر آگئے۔میں نے وہ پھول بڑی چاہت سے اپنی کتاب میں رکھ دیا۔دوسرے دن جب میں اسکول سے واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا اسکا کنبہ شہر چھوڑ کر جاچکا ہے۔

بس پھر کئی سال مجھے اسکی کوئی خبر نہیں ملی، میں اپنے اسکول اور پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔بڑھتی عمر کے ساتھ اب مجھ میں احساس ذمہ داری بھی جاگنے لگا تھا۔مجھے معلوم تھا کہ زندگی کی دوڑ میں ترقی کی ضرورت ہے اور مجھے اپنے اور اپنے گھرانے کا سماجی پس منظر بدلنے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہوگی۔مگر پھر بھی دل کے کسی کونے میں رکھا محبت کا وہ دیا جو اس نے جلایا تھا اب بھی روشن تھا۔سردیوں کی طویل راتوں میں جب پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں سے تھکن کی وجہ سے پانی بہنے لگتا اور میں کتاب کو کچھ دیر کے لئے رکھ کر آنکھیں بند کرلیتا تو جیسے اسکا سراپا میرے تصور میں جاگ اٹھتا۔مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور اب وہ کیسی لگتی ہوگی۔مگر مجھے اسکا یقین تھا کہ گر زندگی نے مجھے اس تعلیمی مشقت اور ترقی کے لئے میری دیانت دارانہ محنت کا کوئی صلہ دیا تو اس میں وہ بھی شامل ہوگی۔بس یوں سمجھئے کہ جیسے رات کی تاریکی میں ایک دشوار راہ گذر پر چلنے والے درماندہ مسافر کو کہیں دور جلنے والے چراغ کی روشنی ہمت دیتی ہے اسی طرح اسکا تصور بھی زندگی کے ان مشکل لمحات میں میری ہمت بندھائے رکھتا تھا۔

پھر کئی سال بعد جب میں میٹرک میں تھا تو میرا کنبہ اس شہر گیا جہاں کبھی اسکے والد کا تبادلہ ہوا تھا۔اس دفعہ میری اماں کو اسکی والدہ سے ملنے کی ہڑک ہوئی اور انہوں نے وہاں انکے متعلق سنجیدگی سے معلوم کیا تو انکا پتہ معلوم ہو گیا۔وہ ایک سہ پہر مجھے لے کر انکے گھر نکل کھڑی ہوئیں۔گھر ملنے میں دشواری نہیں ہوئی اور ہمارا پرجوش استقبال ہوا۔۔میں تو اماں کی دسراہٹ کے لئے انکے ساتھ ہو گیا تھا ورنہ اپنے طور پر تو میرا کوئی وجود ہی نہ تھا۔اس کے بھائی بلیغ سے میری تھوڑی بہت دوستی تھی اور وہ میرا ہم عمر بھی تھا۔وہ بھی اب میٹرک میں تھا وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنی کتابیں دکھانے جب اپنے کمرے میں لیکر گیا تو وہ الماری کا پٹ کھولے کچھ نکال رہی تھی۔میں نے اسے دیکھا!ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی نہ ہو،اسکے بال گھٹاؤں کو نہ شرماتے ہوں،اسکی آنکھیں بادامی نہ ہوں یا اسکے ہونٹ غنچہ ناشگفتہ کی یاد نہ دلاتے ہوں مگر میرے نوخیز جوان ہوتے ذہن میں وہ لمحہ ایک ایسا نقش کندہ کر گیا ہے جو مٹائے نہیں مٹتا،مجھے اس لمحے وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی لگی۔میرے دل کی دھڑکن کچھ دیر کے لئے بے قاعدہ ہوگئی اور میں اسے نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں سکا۔مگر اسکی نگاہوں میں مجھے ایک ایسی اجنبیت لگی جیسے اس نے مجھے پہچانا بھی نہ ہو۔اور اگر پہچانا بھی ہو تو اسے اسکی کوئی پروا نہ ہو۔میں اپنی فطری جھجک کی بنا پر اس سے کوئی بات بھی نہیں کرسکا مگر اس رات مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آئی،میں ویسے بھی عمر کے اس دور میں تھا جب جذبات میں حدت تھی اور ذہن خواہ مخواہ خواب بننے لگتا ہے،میں بھی نہ جانے اپنے اور اسکے بارے میں کیسے کیسے خواب بنتا رہا۔بس جاگتی آنکھوں کے خواب!!

پھر گاہے گاہے ہمارے کنبے ایک دوسرے سے ملتے رہے مگر مجھے کبھی اسکی آنکھوں میں چاہت تو بڑی بات ہے اپنائیت کی بھی کوئی جھلک نہ دکھائی دی۔پھر بھی میرے دل میں اسکی چاہت کی جو چنگاری سلگی تھی وہ ایسے ہی سلگتی رہی جیسے پہلے تھی بالکہ اس میں اب کچھ شدت سی آگئی تھی۔گذرتے سالوں کے ساتھ اسکے والد ترقی کرتے ہوئے ایک بہت بڑے افسر بن چکے تھے انہوں نے ریٹائر ہونے کے بعد شہر کے ایک جدید اور متمول علاقے میں شاندار کوٹھی بنوائی تھی جس میں داخل ہونے کے لئے سنگ مرمر کی نیم دائرے میں بنی چوڑی چوڑی سیڑھیوں پر چڑھنا ہوتا تھا،انکے دونوں جانب پام کے درخت تھے اور لان کے بیچ ایک فوارے سے پانی اچھل اچھل کر غنائی آوازیں پیدا کرتا تھا۔انکے گھر کے ہر گوشے سے ریاست ٹپکتی تھی۔اب کبھی انکے یہاں جانا بھی ہوتا تھا تو اگرچہ میری اماں ان سے نہایت خود اعتمادی اور بے تکلفی سے ملتی تھیں مگر مجھ میں اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔مجھے اسکا احساس تھا کہ وہ اتنے بڑے گھر کی اکلوتی بیٹی ہے۔بس میں اسے دور سے تکا کرتا تھا اب اسکے حسن پر بہار آچکی تھی اور اس کی دلکشی میں مزید چار چاند لگ گئے تھے۔مجھے معلوم تھا کہ وہ میری دسترس سے باہر ہے مگر پھر بھی میری پاگل آنکھیں جاگتے ہوئے اپنی اور اسکی زندگی کے خواب بنا کرتی تھیں۔

ادھر میں اپنی تعلیم اور مستقبل کے معاملے میں اب بھی بہت سنجیدہ تھا اور مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اپنی زندگی کے ہر خواب کو پورا کرنے کے لئے مجھے ترقی کے زینے طے کرنے ہیں۔مجھے دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی ترقی کر نی ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ میری خواہشات میری حیثیت سے آگے بڑھ جائیں۔میں چاہتا تھا کہ جب میں کسی چیز کی طلب کروں تو دنیا یہ کہے کہ یہ اسکا اہل اور حقدار ہے۔یوں تو نہ جانے کیسی کیسی خواہشات تھیں مگر اب بھی انکا مرکز صرف اسی کی ذات تھی۔

میں ابھی کالج میں آیا ہی تھا کہ ہمارے حلقہ احباب میں ایک غلغلہ

ساچ گیا۔سنا گیا کہ وہ اپنے کزن سے شادی کرنا چاہتی ہے۔مجھے کیا سب کو شدید حیرت تھی۔ایک تو یہ کہ وہ خود ابھی نسبتا کم عمر تھی۔ابھی اس نے سترہویں سال ہی میں قدم رکھا تھا پھر اس کے ابا کا جو مرتبہ تھا، وہ جس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور سب سے بڑھ کر وہ جتنی حسین تھی اس کے لئے تو لوگوں کا خیال تھا کہ عرش سے پیغام آئینگے۔اسکے یہ کزن اس سے نو سال بڑے تھے اور نہایت معمولی ملازمت کرتے تھے۔پھر یہ ماضی میں بھی کچھ لڑکیوں سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے اور رد کئے جا چکے تھے۔غرض کچھ جوڑ ہی نہیں تھا۔ماں باپ نے بہت سمجھایا، دھمکیاں دیں، ایک تاریک اور افلاس زدہ مستقبل سے خوفزدہ کیا مگر اس کی ایک ہی ضد تھی کہ شادی کرونگی تو صرف انہیں سے۔نہ معلوم کیسا جادو تھا جس نے اسکے گرد حصار قائم کر دیا تھا۔خاندان کے ایسے گھرانوں نے جن کے لڑکے نہایت خوبرو تھے اور شاندار نوکریاں کر رہے تھے اس کے لئے رشتے دئے مگر اسکے لبوں پر صرف اور صرف نہ تھی۔جب ماں باپ نے تھوڑی سختی کی تو اس نے ماں سے کہہ دیا کہ اگر اس سے شادی نہیں ہوئی تو چوڑیاں پیس کر کھا لونگی۔آخر کار اسکی ضد کے آگے کسی کی ایک نہ چلی اور ایک دن وہ دلہن بن کر پیا کے گھر سدھاری۔

مجھے تو اسکا احساس ہو ہی گیا تھا کہ میں اس تمام معاملے میں کسی شمار ہی میں نہیں ہوں۔دراصل یہ سماجی حقیقت میری سمجھ میں آگئی تھی کہ لڑکیاں شادی کے لئے جلد تیار ہو جاتی ہیں اور لڑکوں کو ایک مستحکم سماجی اور مالی حیثیت اختیار کرنے میں سالوں لگ جاتے ہیں اس لئے بچپن کی محبتیں کبھی بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتیں، پھر بھی جیسے میرے اندر ایک چیز ٹوٹ گئی تھی جیسے وہ خواب جو میں نے بنے تھے اب چکنا چور ہو گئے تھے۔ظاہری طور پر میں اسکو بھول گیا تھا اور میں نے اپنی توجہ صرف اپنی زندگی، اپنی تعلیم پر مرکوز کر دی تھی مگر اسکی یاد کی چنگاری اب بھی سلگ رہی تھی۔

پھر سنا کہ وہ بھی زندگی کے جھمیلوں میں گھر گئی بچے ہو گئے اور اسے بھی اس بات کی فرصت ہی نہ ملی کہ وہ پرانے لوگوں سے تعلق رکھے۔وہ تو اپنے گھر والوں سے بھی نہیں مل پاتی تھی۔

وہ مالی طور پر تنگدست تھی اور اسکی خودداری اس بات کو قبول نہیں کرتی تھی کہ وہ کسی کی حتیٰ کہ اپنے ماں باپ کی بھی مدد قبول کرے۔سالوں بعد جب میں اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک غیر ملکی فرم میں اعلی عہدے پر تعنات تھا وہ مجھے ایک شادی میں ملی۔شاید اپنے پرانے بری کے جوڑے میں تھی بالوں میں جوہی کی کلیاں اور چہرے پر غازہ بھی تھا مگر غربت اور تنگ دستی کی خزاں اسکے چہرے پر سایہ فگن تھی۔میں نے پوچھا ''کیسی ہو'' ''ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا'' اچھی ہوں''۔اس رات میں دیر تک سوچتا رہا شاید اپنے کئے پر پچھتاتی تو ہوگی۔

وہ پھر کئی سال نظر نہیں آئی، میرے حالات اس اثناء میں تیزی سے بدلے تھے۔میں نے انجیئرنگ کی ذاتی کمپنی کھول لی تھی جس کی شاخیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔لوگ میری خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے کہ میں جس چیز کو ہاتھ لگاتا ہوں وہ سونا بن جاتی ہے۔میری اماں نے بہت کوشش کی کہ میں شادی کر لوں مگر مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ جانے والے دل کو پتھر کر گئے ہیں۔اب شاید وہ کسی کے لئے نہ دھڑک سکے۔اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتا تھا بلکہ اپنی تنہائی مجھے پیاری لگنے لگی تھی۔

پھر معلوم ہوا کہ وہ سخت مشکل حالات میں ہے۔اسکے شوہر کو کوئی بیماری لگ گئی تھی، آمدنی مزید کم ہو گئی تھی تین بچوں کے ساتھ گذارا مشکل تھا۔اسکے والد بھی انتقال کر چکے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنا اثاثہ ایسی تجارتوں میں لگایا جن میں وہ پیسہ ڈوب گیا بوڑھی ماں بھی اپنے بیٹے ملیح کے ساتھ تھی۔یہ سن کر میں اسکے یہاں گیا۔ایک چھوٹا سا گھر تھا جسکے آنگن کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔دیواروں کا روغن اپنی چمک دمک کھو چکا تھا۔اسکے شوہر نے مجھے بتایا کہ اسے ہر دو ماہ بعد معالجے کے لئے ہسپتال جانا ہوتا ہے۔اس کے باوجود مجھے اس گھر میں پیار کی خوشبو محسوس ہوئی۔اسکی آنکھوں میں مجھے اپنے شوہر کے لئے ایک گہرا پیار نظر آیا۔میں نے مدد کی پیشکش کی جو اس نے شکریہ کے ساتھ ٹھکرا دی۔

کچھ ماہ بعد خبر ملی کہ انکا گھر ہاؤس بلڈنگ کے قرضے کی عدم ادائیگی کی وجہ سے ضبط ہونے والا ہے۔ادھر میری والدہ مزید بوڑھی اور کمزور ہو گئی تھیں اور مجھے بار بار غیر ملکی دوروں پر جانا ہوتا تھا۔ہمارا اتنا بڑا گھر خالی پڑا تھا اور مجھے انکی دسراہٹ کی بھی ضرورت تھی۔میں ایک بار پھر اسکے یہاں گیا۔میں نے اس سے کہا اس دفعہ میں تماری مدد کرنے نہیں بلکہ ضرورت مند بن کر آیا ہوں مجھے اپنی والدہ کے لئے تمہاری ضرورت ہے۔تم اپنے پورے کنبے کے ساتھ ہمارے یہاں چلی آؤ۔اس سے ہم دونوں کی مدد ہو جائیگی۔بہت مشکل سے وہ راضی ہو گئی یہ اسکی اپنی ضرورت بھی تھی۔میں نے کوشش تو کی تھی کہ جب اسکے شوہر کا ڈاکٹروں سے اپائینٹمنٹ ہو تو ہماری کار میں انہیں دکھانے لیجا سکتی ہے مگر اسکی خودداری اسکی اجازت نہیں دیتی تھی۔وہ اپنے دوسرے کاموں کے لئے بھی بسوں میں دھکے کھاتی تھی مگر کبھی زندگی سے شکوہ نہیں کرتی تھی۔

میں دیکھتا تھا کہ دن بھر کام کرتی ہے، گھر میں اپنے حصے کی صفائی، اپنے کنبے کا کھانا، برتن دھونا حتیٰ کہ بچوں اور شوہر کے کپڑے دھونا۔ شام تک نڈھال ہو جاتی تھی۔ہاتھوں پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور چالیس سال کی عمر میں پچپن کی لگتی تھی۔میرے اصرار کے باوجود وہ ہمارے گھر کے نوکروں سے کسی قسم کا کام لینے پر تیار نہیں تھی۔میں اسکی یہ حالت دیکھ کر جلتا تھا مگر پھر یہ بھی سوچتا تھا کہ وہ خود اسکی ذمہ دار ہے اور اس لمحہ کا خمیازہ ادا کر رہی ہے جب اسنے اپنی شادی کا جذباتی مگر غلط فیصلہ کیا تھا۔مجھے یقین تھا کہ اب وہ اس پر خوب پچھتاتی ہوگی۔میرے دل میں ایک جلن تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ کبھی اسکا اعتراف خود کرے۔

باقی صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ کیجیے

شاعر نے اپنی فولڈنگ کرسی کو اپنے باغیچے کے پسندیدہ گنج میں ہری بھری گھاس پر جما کر رکھا اور اس کے پاس ایک چھوٹی سی تپائی پر اپنی ڈائری، قلم اور چشمے کو سنبھال کر رکھتے ہوئے آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر ایک طائرانہ نظر کنج میں ایستادہ پیڑوں، پودوں اور بیلوں پر ڈالی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا لیکن مشرقی افق کے گوشوں پر سرمئی اور نارنگی رنگ گلے مل رہے تھے۔ نسیم سحری کے زندگی بخش جھونکے ذہن کو نئی تازگیاں اور فعتیں عطا کر رہے تھے۔ شاعر کے اندر ایک خوش آئند کرب کروٹیں لینے لگا۔ کرب وہ جو کسی بھی تخلیق کے وجود میں آنے سے پہلے تخلیق کار کے درون میں پیدا ہوتا ہے اور خوش آئند اس لیے کہ وہ کسی نئی تخلیق کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ شاعر کو امید تھی کہ آج وہ اپنی کچھ ادھوری نظمیں پوری کر کے اپنے شعری مجموعے کو تکمیل کے مرحلے سے گزار دے گا۔

اس نے بغور کنج کا جائزہ لیا۔ بہار اپنے شباب پر تھی۔ املتاس اور گل مہر کے درخت زرد اور سرخ لباس میں سجے دھیرے دھیرے جھوم رہے تھے۔ چمیلی اور رات کی رانی کی بیلیں رات کی خوشبوؤں سے سرشار مدہوشی کے عالم میں اپنے سارے پھول فرشِ راہ کر چکی تھیں۔ گلاب کے تختے سرخ، گلابی اور زرد پھولوں سے سجے جنت نگاہ بنے اپنے ہی حسن کی رعنائیوں سے مخمور، غرور سے سر اٹھائے کھڑے نسیم سحری کے جھونکوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ زمین سے آسمان تک حسن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ شاعر کو لگا یہ درخت، یہ پودے، یہ پھول آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ چمیلی اور رات کی رانی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سرگوشیاں کر رہی تھیں "ہمارا پورا وجود حسن سے تعبیر ہے۔ ہم راتوں کو مہکاتے ہیں صبحوں کو سحر انگیز بناتے ہیں۔ ہمارے منڈوے تلے کتنے بدن پیار کی آگ میں جل کر امر ہو جاتے ہیں، ہماری خوشبوؤں سے سہاگنوں کی قبریں مہکتی ہیں۔ ہمارے پھولوں کی کھلی سے دلہنوں کی زلفیں مہکتی ہیں۔" جوہی نے ٹکڑا لگایا "ہمارے پھولوں سے نوعروس کی سیجیں سجائی جاتی ہیں اور کنواریوں کے ادھورے خواب اپنی تعبیر ڈھونڈھتے ہیں ہم نے دوشیزاؤں کو اپنے محبوب کی باہوں میں کلی سے پھول بنتے دیکھا ہے۔"

گلاب جوان سہیلیوں کی خودستائشی سرگوشیاں سن رہا تھا، ہنس پڑا۔ "کس بات کا مان ہے تم لوگوں کو! رات کو کھلتی ہو صبح کو زمیں بوس ہو جاتی ہو۔ سورج کی ایک گرم نگاہ تو برداشت ہوتی نہیں تم لوگوں سے۔ سیجوں کی زینت بن کر بھی صرف چند گھنٹوں کا حسن رہتا ہے۔ نوعروس کی محبتیں دیکھ کر رشک وحسد سے سیاہ پڑ جاتی ہو۔ سورج تم سے تمہارا رنگ، روپ، خوشبو سب چرا لیتا ہے۔ مجھے دیکھو کتنے دنوں تک شاخوں کا سر بلند رکھتا ہوں۔ دیکھنے والی نظروں کو سیراب کرتا ہوں۔ لوگ توڑ بھی لیتے ہیں تو گلدانوں کو کئی دنوں تک سجائے رکھتا ہوں۔ سہرے میں پرویا جاتا ہوں اور عروس کے چہرے کو مہکاتا ہوں، مالاؤں میں پرویا جاتا ہوں تو پہننے والے کی عزت و توقیر بڑھاتا ہوں۔ کوٹ اور شیروانی کے کالر میں سج کر لوگوں کے دلوں میں سما جاتا ہوں۔ سرخ رنگ میں محبت کا قاصد ہوں، زرد رنگ میں دوستیوں کو پروان چڑھاتا ہوں اور سفید رنگ میں امن و آشتی کا پیغامبر بن جاتا ہوں۔ درگاہوں پر چڑھایا جاتا ہوں اور معتبر ہو جاتا ہوں۔ زمین پر اگر ایک پتی بھی گرے تو لوگ اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے ہیں مجھے رسوا نہیں ہونے دیتے۔"

املتاس اور گل مہر جو اتنی دیر سے بچوں کی تعلیاں سن رہے تھے۔ مسکرا کر بولے، اتنا غرور اچھا نہیں، تمہارا حسن، تمہاری خوشبو، تمہارے لیے وبال جان ہے۔ تمہارا استحصال کیا جاتا ہے۔ تمہیں شاخ سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ تمہاری آزادی اور خود مختاری کو پامال کر کے تمہاری تجارت کی جاتی ہے۔ تم اپنی مرضی سے نہ جی سکتے ہو نہ مر سکتے ہو۔

گلاب نے طنز کیا۔ "آپ تو بات ہی نہ کیجئے۔ آپ کے پھولوں کی تو کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔ انہیں قدموں تلے روندھا جاتا ہے۔ نہ گھروں میں سجائے جا سکتے ہیں۔ نہ سہروں اور مالاؤں کی زینت بن سکتے ہیں۔

املتاس مسکرایا۔ تم ہمارے ظرف کو کہاں پہنچ سکتے ہو۔ ہمارے دم سے دنیا میں بہار آتی ہے، ہم صرف چمن کی زینت ہی نہیں بنتے۔ میں اور میرا بھائی گل مہر، ہم شاہراہوں کو بھی سجاتے ہیں۔ ہمارے گل پوش سائے دور سے مسافروں کو کھینچ لاتے ہیں۔ تو ہم ان کی مہمان نوازی میں ان کے لیے پھولوں کا فرش بچھا دیتے ہیں۔ سرد گرم سہتے ہیں لیکن اف نہیں۔ سخت گرمی اور طوفان میں تم بچوں کو سورج کی قہر سامانیوں اور تند و تیز ہوا کے تھپیڑوں سے بچاتے ہیں تا کہ تم مسکرا سکو۔ ہماری کوئی دیکھ بھال نہیں کرتا پھر بھی ہم شکوہ نہیں کرتے۔ ظرف ہونا چاہیے۔ مہندی کے جھاڑ کو دیکھو۔ ہر نازک ہتھیلی کو سجاتا ہے، دوشیزاؤں کو سہاگن بناتا ہے۔ بزرگوں کی زلفوں میں رنگ بھر کر انہیں تا دیر جوانی کا احساس دلاتا ہے لیکن تمہاری طرح شیخیاں نہیں بگھارتا۔"

اچانک شاعر کی نظر مہندی کے بوٹوں کی طرف گئی تو وہ یہ دیکھ کر سہم گیا کہ انہیں امربیل نے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ سوکھتے جا رہے تھے اور امربیل تر و تازہ ہوتی جا رہی تھی۔ شاعر کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے کسی عفریت کی طرح قہقہہ لگایا۔

"دیکھا تم نے اپنی لاپروائی اور بے حسی کا نتیجہ، تم لوگ صرف حسن کی رعنائیوں میں الجھے رہو اور میں تمہارا چمن تباہ و تاراج کر دوں گی۔ جن پودوں کی خوبصورتی پر تمہیں ناز ہے، میں ان کا خون پی کر زندگی اور جوانی حاصل کروں گی

اورایک دن اس چمن پر میرا راج ہوگا۔"

شاعر آنے والے وقت کا تصور کرکے کانپ گیا۔اس نے تہیہ کرلیا کہ آج مالی سے کہہ کر اس منحوس امربیل کو اکھڑوا دے گا ورنہ یہ کسی آسیب کی طرح سارے چمن کو اجاڑے دے گی، اور مالی کی بھی خبر لے گا کہ وہ کس بات کے لیے اپنی جیبیں بھر رہا ہے۔اگر وہ ایک دشمن کو قدم جمانے سے نہیں روک سکتا۔

لیکن شاعر بھول گیا۔ادھوری نظمیں پوری ہوگئی تھیں اور اس کی نظموں کی کتاب مکمل ہوچکی تھی۔اس کی اشاعت وتشہیر کرنے اور لوگوں سے داد وتحسین بٹورنے کے لیے وہ شہروں شہروں، ملکوں ملکوں گھومتا رہا اور جب واپس آیا تو امربیل پورے چمن کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔املتاس، گل مہر اور نیم کے بوڑھے درخت اتنے مضبوط اور بلند تھے کہ وہ محفوظ اور سلامت رہے لیکن گلاب، چمبیلی، جوہی، نرگس اور حسنِ حنا کی تباہی پر اشک فشاں تھے۔

شاعر اپنی لاپروائی پر شرمندہ سمجھ چکا تھا کہ اپنے گلستاں کو غیروں اور خودغرضوں کے حوالے کرکے مطمئن ہوجانا اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔اپنی غلطی پر شرمندہ شاعر کمر باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا اس یقین کامل اور پختہ ارادے کے ساتھ کہ امربیل کو اس چمن سے اکھاڑ پھینکنا ہے اور گلشن کے اجڑے ہوئے حسن کو واپس لانا ہے۔ ہمت، حوصلہ اور ارادہ ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔بڑے سے بڑے دشمن کو ہرایا جاسکتا ہے۔تباہی ہمیشہ ناسمجھیوں اور غفلتوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور اصلاح کے لیے اتحاد ضروری ہے۔اپنے پڑوسیوں کی مدد سے اپنی ساری حسیات کو متحد کرکے اور اپنے چمن کو بچانے کا عزم لے کر شاعر سرگرم عمل ہوگیا۔چمبیلی کے جھاڑ سے امربیل کو الگ کرتے ہوئے وہ زیرلب بڑبڑایا۔میرے بچو تم سب سے اس چمن کی زینت ہے۔اپنی اپنی لن ترانیاں چھوڑ کر ایک ہوجاؤ۔پھر کوئی امربیل تمہیں نقصان نہیں پہنچاسکتی۔

بقیہ : جوگن

ایک دن وہ اپنے شوہر کو دکھانے شہر گئی شام تک واپسی ہونی تھی۔شہر میں ٹریفک بہت خراب ہوتا تھا۔بسوں میں لوگ باہر تک لٹکے ہوتے تھے پھر ہمارے گھر سے بس اسٹاپ بھی بہت دور تھا۔واپسی میں اسے اتنی دیر ہوگئی کہ ہم پریشان ہوگئے۔جب آئی تو چہرہ تھکان سے پیلا پڑا ہوا تھا۔پیدل چلنے کی وجہ سے ٹانگوں میں اینٹھن ہورہی تھی اور ہونٹ پیاس سے خشک تھے۔کھانا کھانے کے بعد ہم چھت پر دری بچھا کر بیٹھ گئے۔رات خنک تھی اور جانفزا ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔دور سے کسی ریڈیو کی آواز آرہی تھی کوئی ایک بہت ہی پیاری غزل

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ دل جانتا ہے
رنج بھی اتنے اٹھائے ہیں کہ دل جانتا ہے

گا رہا تھا نہ جانے کیوں مجھے ہمت ہوگئی کہ وہ سوال اس سے پوچھوں جو میرے دل میں سالوں سے دبا تھا۔میں نے کہا "سچ بتاؤ اتنی مشکل زندگی گذارنے پر، اتنی آزمائشوں کا مقابلہ کرنے پر کبھی اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہوا" اس نے اپنی وہی کالی کالی اور غلافی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا جنہوں نے کبھی میرا اقرار لوٹ لیا تھا، کہنے لگی "اگر میں کئی دفعہ مر کر جیوں، کئی جنم لوں تو بھی میں یہی کہونگی کہ میں تو انکی دیوداسی ہوں، میری تو یہی خواہش ہوگی کہ میں ایک جوگن بنی اپنے جوڑے میں کنول اور گیندے کے پھول ٹانکے انکے سامنے بیٹھی رہوں اور انکی پوجا کے گیت گاتی رہوں، یہاں تک کہ میں ریت کا ڈھیر ہو جاؤں' میں نے دیکھا اس ملگجے اندھیرے میں بھی اسکے چہرے پر ایک ملکوتی دمک تھی جو صرف سچے پیار کے حصول ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

بقیہ : اَنا کی صلیب

ایک روز اپنے سفری سامان کو ٹٹولتے ہوئے مجھے اپنی کلاس فیلو ڈاکٹر نسرین کا فون نمبر ملا جوان دنوں امریکہ ہی میں تھی۔دوران گفتگو اس نے پرانے کلاس فیلوز کے نام گنوانے شروع کیے جوان دنوں امریکہ میں تھے۔مہروز کا نام آتے ہی میرا دل بھڑک اٹھا۔۔۔نسرین اس کی کامیابیوں، خوش اخلاقیوں اور ماضی پرستی کے قصے سناتی رہی اور مجھے اپنا ماضی یاد آ گیا۔۔۔کس بے دردی سے میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔پرکس طرح خود کو الزام دوں، میں نے یہ سب اس کی کامیابیوں کے لیے کیا تھا۔میں چاہتی تھی وہ دنیا کا سب سے کامیاب انسان بنے اور وہ بن گیا۔مجھے ڈر تھا میرا ساتھ اس کی فطری صلاحیتوں کو گہنا دے گا۔پھر کچی عمر کا وہ خوف کہ وہ مرد بن کر وہ مجھے حاصل کر کے اپنا دوسرا روپ نہ دکھا دے اور ۔۔۔ اور۔۔۔شاید ہم دونوں ہی اپنی اناء کے اسیر تھے۔۔۔کیسے ایک دوسرے سے ہار مانتے! میرے آنسو بہتے رہے ۔جی چاہا نسرین سے پوچھوں۔۔۔کیا اب بھی وہ اتنا ہی پاگل ہے۔

یوں امریکہ کی بوجھل، مشینی زندگی سے اکتا کر میں جلد ہی لوٹ آئی۔بارش رک چکی ہے۔۔۔ ہر چیز نکھر آئی ہے۔۔۔ پر دل پر چھائے ماضی کے سائے اور گہرے ہوگئے ہیں۔میرا ماضی شاید میری احمقانہ سوچوں کی بناء پر اکثر کچوکے لگاتا رہتا ہے۔۔۔ایسے بھیگے موسم میں بھی جل رہی ہوں۔۔۔اور جلتے ہی رہنا ہے۔۔۔حتیٰ کہ۔۔۔!

پیارے مہروز

(ماضی کے کچھ زخم اگر بُرے ہوں جائیں تو معذرت! یہ تحریر کہیں بھی چھپوانے کے لیے ہے۔بس فضول سی کوشش ہے)

'' شمع کی آبرو ''

ساغر صدیقی

(۱۹۲۸ـ۱۹۷۴)

(۱۹۵۸ء جگر مرادآبادی کی صدارت میں لائل پور (فیصل آباد) کاٹن مل کے ملک گیر طرحی مشاعرے میں زیرِ غزل نظر سن کر جگر صاحب نے اپنی غزل تلف کرتے ہوئے کلام سنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ حاصلِ مشاعرہ غزل ہو چکی۔)

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں*

جی میں آتا ہے الٹ دیں ان کے چہرے سے نقاب
حوصلہ کرتے ہیں لیکن حوصلہ ہوتا نہیں

شمع جس کی آبرو پر جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

اب تو مدت سے رہ و رسمِ نظارہ بند ہے
اب تو ان کا طور پر بھی سامنا ہوتا نہیں

ہر شناور کو نہیں ملتا تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں

ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہائے یہ بیگانگی اپنی نہیں مجھ کو خبر
ہائے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

*بارہا دیکھا ہے ساغرؔ رہ گزارِ عشق میں
کارواں کے ساتھ اکثر رہنما ہوتا نہیں

○

عبداللہ جاوید

(کینیڈا)

مسافرت نہیں گٹھری سنبھالتے پھرنا
سفر جو ہوگا وہ اسباب کے بنا ہوگا

زمیں میں بند کیا جائے گا بدن لیکن
بدن میں قید جو تھا، قید سے رہا ہوگا

مری شناخت کہیں اور بن رہی ہوگی
مرا بدن کہیں مٹی میں مل رہا ہوگا

مرے وجود کو تیری رضا سے مطلب ہے
مرا وجود یہی بھیک مانگتا ہوگا

سفر میں نت نئی آسانیوں سے کیا مطلب
قدم قدم کسی مشکل کا سامنا ہوگا

ملے گا کوئی تو ایسا مقام رستے میں
میں سربسجدہ، مرے سامنے خدا ہوگا

جو ہاتھ اٹھائے کھڑا ہے کسی دعا کے بغیر
گدا یہ تیرا ''تجھے'' تجھ سے مانگتا ہوگا

یہاں تو چار طرف برف کا سمندر ہے
اس ایک صبح کے سورج سے کام کیا ہوگا

تو بندگی میں تو نا کام رہ گیا جاویدؔ
فقیر بننے میں شاید ترا بھلا ہوگا

○

محمود شام
(کراچی)

ہم نہیں ہیں تو انجمن بھی نہیں
شہر کو جرأت سخن بھی نہیں

اک خزانی چمن پہ چھائی ہے
گل نہیں ہے تو گل بدن بھی نہیں

شب کٹی کروٹیں بدلتے پر
اپنے بستر پر اک شکن بھی نہیں

موسم آئے عجب و چھوڑے کے
اب ملاقات دفعتاً بھی نہیں

بات رہتی ہے فون سے ۔ اس سا
کوئی باذوق ہم سخن بھی نہیں

ادھ کھلی کھڑکیاں بھی کم کم ہیں
اب گلی میں وہ بانکپن بھی نہیں

حرمت حرف کا ہے پاس کہاں
اہتمام فروغ فن بھی نہیں

زر کی خواہش میں دوڑتی نسلیں
کوئی وقفہ کوئی تھکن بھی نہیں

تھے تو بے رنگ پر مٹھاس تو تھی
اب تو لہجوں میں اپنا پن بھی نہیں

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ)

میں نے کب اپنی وفاؤں کا صلہ مانگا تھا؟
اک تبسم ہی تھا بحرِ خدا مانگا تھا!

کیا خبر تھی مری نیندیں ہی اُڑ جائیں گی
میں نے کھوئے ہوئے خوابوں کا پتا مانگا تھا!

دستِ گُل چیں نے بھی گلشن سے وہی پھول چُنا
میں نے جس گُل کے لیے دستِ صبا مانگا تھا!

شدّتِ غم میں دعا کی تھی تجھے بھولنے کی
اب بھرے زخم، تو نادم ہوں یہ کیا مانگا تھا!

بس اسی بات پہ برہم ہے زمانہ مجھ سے
اپنے بدخواہوں کا بھی میں نے بھلا مانگا تھا!

اک گزارش بھی نہ ہو پائی قبول اس کے حضور
غالبًا میں نے ہی کچھ حد سے سَوا مانگا تھا!

چُوڑیاں ٹوٹیں تو زخموں سے لہو رنگ ہوئی
جس ہتھیلی نے ذرا رنگِ حنا مانگا تھا

تُو نے ہر غم سے نوازا ہے، ترا خاص کرم
مجھ کو تو یہ بھی نہیں یاد کہ کیا مانگا تھا

آفتیں سہنے کا یارا بھی تو دیتا، یارب!
اور تو کچھ بھی نہیں اس کے سِوا مانگا تھا

یہ الگ بات، ملا کربِ مسلسل، ورنہ
ہم نے جو مانگا بہ صد صدق و صفا مانگا تھا

ذہن پر چاند! پھر اک برق سی لہرانے لگی
دل نے ماضی کے نہاں خانوں سے کیا مانگا تھا؟

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

کوئی اپنی بقا کی صورت ہے؟
یا یہ لمحہ فنا کی صورت ہے

یہ جو بگڑی فضا کی صورت ہے
شاید اِک ارتقا کی صورت ہے!

آہ بھی اِک دعا کی صورت ہے
حرف بھی التجا کی صورت ہے

ایک بیم و رجا کی صورت ہے
ہر نفَس اِک سزا کی صورت ہے

یہ جو ہرسُو وبا کی صورت ہے
کیا یہی انتہا کی صورت ہے

سانس لینا بھی اِک عذاب ہوا
زہر آب و ہَوا کی صورت ہے

وائرس ہے یزید کی صورت
ہر نفَس کربلا کی صورت ہے

ملک الموت سا دکھائی دیا
کیسی یہ ناخدا کی صورت ہے؟

کسی سیارے میں چلے جائیں
کیا کوئی انخلا کی صورت ہے؟

○

شاہد صدیقی
(کینیڈا)

روح میں کیوں سماء گئے ہو تم
میری ہستی پہ چھا گئے ہو تم

شرم ساری ہی اب مقدر ہے
آئینہ یوں دکھا گئے ہو تم

اور کچھ اب نظر نہیں آتا
ہر نظارے پہ چھا گئے ہو تم

من کے مندر میں اک مورت ہے
سخت کافر بنا گئے ہو تم

دل کی حالت سدھر نہیں پائی
جب سے خوابوں میں آ گئے ہو تم

اب ہے شاہدؔ اور اس کی مدہوشی
نقش حیرت بنا گئے ہو تم

○

مشتاق اعظمی

(اسنول،ایسٹ بنگال)

جو گلے کا ہار تھا، اب پاؤں کی زنجیر ہے
کیا سہانا خواب تھا، کیا دل شکن تعبیر ہے

ہر گھڑی جلوہ نما ہے تو ہی آنکھوں میں مری
جس طرف ڈالوں نظر ہر جا تری تصویر ہے

اُس کی محفل میں تو سب ہیں مرکز لطف وکرم
ہاں مگر اک با وفا ہی لائق تعزیر ہے

عمر بھر جس نے سکوں نا آشنا رکھا مجھے
آج بھی دل میں مرے وہ حسرت تعمیر ہے

سر پہ کیوں اندیشوں کی تلوار ہے لٹکی ہوئی
کیا دعائے صبح گاہی کی یہی تاثیر ہے

وہ لگے آنکھیں چرانے جن سے کچھ اُمید تھی
خودغرض دنیا میں ہم جیسوں کی یہ تقدیر ہے

کیوں ہے مشتاق اعظمی کو ناز اپنے آپ پر
لگتا ہے بزمِ غزل میں اس کی بھی توقیر ہے

اشرف جاوید

(لاہور)

اک بام پر کھڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی
لیکن تھکے پڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی

کس مصلحت نے دونوں کو خاموش کر دیا!
کس حاشیے جڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی؟

اِس بار صرف پتے گرائے نہیں خزاں نے
پھل پھول بھی جھڑے ہیں، ہَوابھی، چراغ بھی

نکلیں گے کیا طلسمِ زمانہ کے پھیر سے
دلدل میں آ گڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی

پہلے غنیمِ شہر کو رستہ دیا گیا
اب غمزدہ بڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی

کھلتا نہیں کہ کس کا گرفتار کون ہے!
اعصاب کے کڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی

شب کے خلاف لڑنا،اکیلے، محال تھا
مل جُل کے، پھرلڑے ہیں ہَوابھی، چراغ بھی

کیا بات مشترک ہے ہَوا میں، چراغ میں!
کس بات پراڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی

کب تک چلے گا باہمی رشتہ مفاد کا!
دو مختلف دھڑے ہیں ہَوا بھی، چراغ بھی

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

زندگی کے کچھ مناظر پھر سے یاد آنے لگے
مُڑ کے دیکھا آشیانے سارے ویرانے لگے

کیا حسیں وہ دَور تھا جب چاہتیں تھیں بام پر
خواب کی مانند اب تو سارے افسانے لگے

ہر طرف ہی پھول تھے گلشن تھا مانندِ بہار
ہنستے بستے لوگ وہ، یادوں میں در آنے لگے

خوبصورت دور تھا وہ، کیا حسیں تھے روز و شب
پیار کے وہ سب مناظر، سامنے آنے لگے

بوجھ تھا نہ سر پہ کوئی، فکر فردا بھی نہ تھی
وہ حسین دن رفتہ رفتہ پھر نظر آنے لگے

کاش تھم جاتے وہ دن یونہی مگر
رفتہ رفتہ لوگ وہ، منظر سے ہٹ جانے لگے

گو بدل سکتے نہیں یاں، سارے فطرت کے اصول
کامیابی اُس کی ہے، جو خود بدل جانے لگے

جان جاؤ گر حقیقت، اس جہاں کی اے ریاضؔ
زندگی اپنی بدل دو، جب سمجھ آنے لگے

○

نبیل احمد نبیل
(لاہور)

رنج و آلام کا کچھ ردِ عمل ہو جائے
کُچھ زیادہ نہ سہی ایک غزل ہو جائے

یہ کہانی جو چلی آتی ہے برسوں سے یہاں
اِس کہانی میں کوئی رد و بدل ہو جائے

زندگی اپنی روانی پہ پلٹ سکتی ہے
مسئلہ رزق کا اِک بار جو حل ہو جائے

صحنِ ویران میں اِک بار پڑے تیرا قدم
یہ مری کٹیا یہی تاج محل ہو جائے

مجھ سے کھو جائے اگر تیرا تصور جاناں
دشت ہو جائے وفا، زندگی تھل ہو جائے

بعض اوقات دکھائی نہیں دیتا کُچھ بھی
بعض اوقات مری فکر بھی شَل ہو جائے

میرے ہاتھوں پہ اُتر آئے ستارہ میرا
میرا دامن مری تقدیر کا پھل ہو جائے

مدّتوں بعد مراسم میں بحالی ہوئی ہے
پھر نہ اے دوست کوئی تازہ خلل ہو جائے

آج کی ڈور جو آ جائے مرے بس میں نبیلؔ
میری منشا کے مطابق مرا کل ہو جائے

○

"**پنجاب چک**"صوبہ سندھ کی تحصیل بدین کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے؛وہاں پاکستان کے صوبہ پنجاب کے پنجابیوں کی آبادی ہے۔یہ گاؤں اپنے زمانے سے بہت پیچھے ہے۔گاؤں ایک پرائمری سکول کا مالک بھی ہے جس میں صرف ایک استاد ہے؛سکول ہفتے میں ایک بار استاد کا منہ دیکھتا ہے۔ایسے عالم میں کیا پڑھائی ہوتی ہوگی۔تعلیم کی روشنی سےجن گھروں کے درودیوار منور ہیں انھیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہے،اس لیے ان کے بچے کھوسکی کے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں۔اس گاؤں سے شکایت اُٹھ کر کبھی محکمۂ تعلیم کے دروازے تک نہیں گئی۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہاں علم اجنبی ہے؛ بلکہ استاد کو وڈیرے کی چھتری میسر تھی؛اور سب جانتے ہیں کہ وڈیرے کے آدمیوں کے خلاف اٹھنے والی آواز کا تعاقب موت کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔شام کے بعد اس گاؤں کے راستےچپ کو ترسنے ہیں۔شام کی آمد اپنے ساتھ ڈاکوراج لے کر آتی ہے۔مقامی وڈیروں کی پشت پناہی ان ڈاکوؤں کی اصل طاقت ہے؛اس لیے پولیس انھیں نہیں پکڑتی۔اس گاؤں کی شام ہزاروں مسافروں کو لٹتے دیکھ چکی ہے۔یہاں رپورٹ درج ہونے کا خطرہ مول نہیں لیتی؛وہ اس لیے کہ الٹا لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔گاؤں کے سینے میں ایک گدلا جوہڑ ہے جس کا پتھروں کی چاردیواری نے محاصرہ کررکھا ہے۔گاؤں کے لوگ اوران کے جانور اسی جوہڑ کا پانی پیتے ہیں۔گاؤں کے وسط میں ایک کھمبا ایک بلب سینے پہ سجائے کھڑا ہے۔گاؤں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب اور شمال کی دو بہت اچھی سڑکیں ہیں کیونکہ تھر کے وڈیروں کی آمدورفت اسی سڑک سے ہوتی ہے،لیکن سڑک کو گاؤں آنے کی اجازت نہیں۔بارش کے بعد یہاں لوگ پانی سے کئی کئی دن نبرد آزما رہتے ہیں۔یہاں کا مزدور یہاں بہت سستا ہے۔یہ مزدور پنجابی نہیں ہیں، بلکہ سندھ ہی کے علاقے کی کسی نچلی ذات سے تعلق رکھتے ہیں،زیادہ تر مزدور ہندو ہیں۔یہ لوگ قبیلوں کی شکل میں جھونپڑیوں کی آغوش میں رہتے ہیں۔زمین دار لوگ اِن مزدوروں کا پورا سال خرید لیتے ہیں۔طریق کار یہ ہے کہ قبیلے کے "بڑے" کو یک مشت سال بھر کے پیسے دے دیے جاتے ہیں۔اس سودے کے بعد اس قبیلے کے تمام چھوٹے بڑے،مرد وزن سال بھر کے لیے زمین دار کے گھر،اس کے کھیتوں،اور باڑوں میں کام کرتے ہیں۔اس صورتِ حال میں نوجوان لڑکیوں اور کم سن بچوں کے وجود کیسے ٹوٹتے اور بکھرتے ہیں،وہ بیان کرنا بہت اذیت ناک ہے۔

اسی گاؤں کے ایک معمولی جھونپڑی کا پانچ معذور بچوں اور ان کے والدین کے سر پر دست شفقت تھا۔گھر کے سربراہ کا اصل نام تو پتا نہیں کیا تھا لیکن گاؤں والے اسے اس کے کالے رنگ کی وجہ سیکالو کہتے تھے۔ان بچوں کے والدین کا کہنا تھا کہ بچے ابتدا میں صحت مند ہوتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ معذوری انھیں جکڑ لیتی ہے۔ایک ٹی۔وی چینل کے نمائندے کو ان لوگوں کی اذیت ناک زندگی کی ڈاکیومنٹری اس علاقے میں لے آئی۔یہاں اس نے اس قابلِ رحم خاندان کی بھی وڈیو بنائی۔

"بابا جی!کبھی کسی ڈاکٹر،ہسپتال بھی بچوں کو لے کر گئے؟نمائندے نے والدسیسوال کیا۔

"نہیں صاحب جی!کس کے پاس جائیں۔نہ وقت ہے نہ پیسا۔بس اللہ کی مرضی ہے"۔

"اگر ان کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"اگر ان کا علاج ہو جائے تو ہم ساری زندگی آپ کو آپ کے بچوں کو دعائیں دیں گے"۔

یہ پروگرام ٹی۔وی چینل پر دکھایا گیا۔لاکھوں لوگوں نے اس پروگرام کو دیکھا۔اہلِ دل نے فون کیے کہ ان کے لیے فنڈ اکٹھا کیا جائے۔اس چینل نے معروف ڈاکٹروں کا ایک پینل اپنے پروگرام میں بلایا اور اس بیماری کے بارے میں بات چیت ہوئی۔

"یہ بیماری قابلِ علاج ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس کا کوئی علاج نہیں۔اگر کسی طریقے سے انھیں امریکہ یا انگلینڈ بھیج دیا جائے تو یہ سارے بچے تندرست ہو سکتے ہیں"۔تمام ڈاکٹروں کی ایک رائے تھی۔

"میں اپنی چینل انتظامیہ سے مشورہ کرتا ہوں اور پھر کسی دن ان معذور بچوں کے لیے"فنڈ ریزنگ"پروگرام کا اہتمام کرتے ہیں۔اجازت دیجیے۔اللہ حافظ"۔پروگرام اختتام پذیر ہو چکا تھا۔

"فنڈ ریزنگ"پروگرام اجازت کا مرحلہ طے کر چکا تھا۔گاؤں کے درودیوار نے دوبارہ اسی نمائندے کو دیکھا۔اس کے پاس ایک خوش خبری تھی کہ ان کے بچوں کے علاج کے لیے رقم کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

"بابا جی!مبارک ہو۔رقم کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔بہت جلد آپ کے بچے صحت یاب ہو کر آپ کا ہاتھ بٹائیں گے"۔

"دعائیں صاحب جی۔ہمارے پاس صرف دعائیں ہیں!"۔ بوڑھے نے ہاتھ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگلے ہفتے آپ ان بچوں کو لے کر آجائیں"۔

"کہاں صاحب جی"؟

"ٹی۔وی چینل پہ۔وہاں ہم ان بچوں کی امداد کے لیے ایک

پروگرام کررہے ہیں"۔

"لیکن مجھے تواس جگہ کا نہیں پتا"۔

"آپ جب شہر آ جائیں تو میرے اس نمبر پر کال کریں۔ ہماری گاڑی آپ کو لینے آجائے گی"۔

"لیکن میرے پاس تو موبائل نہیں ہے اور نہ ہی مجھے چلانا آتا ہے"۔

"ہوں ں ں ں ں ں ں۔ چلیں ایسا کرتے ہیں، ہم اپنا آدمی اور گاڑی بھیج دیں گے۔ آپ کو یہاں سے اٹھالیں گے۔ لیکن واپسی کا انتظام آپ کا اپنا ہوگا۔"

"بیٹا! ساری باتیں ٹھیک ہیں لیکن آپ پہلے ہمارے قبیلے کے سردار ہیرے سے بات کرلیں۔ اگر وہ اجازت دے تو پھر مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے؛ لیکن ہمارا دستور یہی ہے کہ ہمارے فیصلے ہمارا سردار کرتا ہے"۔

اسی اثنا میں قبیلے کا سردار ہیرا، بھاگتا بھاگتا خود ہی وہاں آموجود ہوا۔ اس سے نمائندے نے بات کی تو اس کے ہاتھ عجز کے انداز میں جڑتے چلے گئے۔ اس کی یہ بے ساختگی بتا رہی تھی کہ ان مجبور ہاتھوں کو جڑنے کی عادت ہے۔

"صاحب جی! ہم لوگ وڈیرے کے ملازم ہیں۔ سال بھر کے پیسے لے چکے ہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر تو ایسا ناممکن ہے۔ مین ان بچوں اور اس کے والدین کو بغیر اجازت کے بھیج بھی دوں تو ٹھیک ہوکر بھی یہ ایسے معذور کردیے جائیں گے کہ پھر یہ کبھی ٹھیک نہیں ہوسکیں گے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ پہلے وڈیرہ سائیں سے بات کرلیں"۔

کچھ دیر بعد ٹی۔ وی چینل کی پوری ٹیم وڈیرے کے ڈیرے پر موجود تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں والا وڈیرہ، جس کے سامنے کئی لوگ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خوف زدہ سی متانت ہر چہرے پر تحریر تھی۔ یہ لوگ آس پاس کے علاقوں کے نمائندے، کونسلر وغیرہ تھے۔ آرام دہ کرسی پر وڈیرے کا وجود پڑا ہوا تھا، وڈیرہ انھیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ اگر چہ ڈیرے پر پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے لیکن ایسی کوئی بدنظمی پیدا نہیں ہوئی جس سے چینل کے نمائندے اکثر عوامی اجتماعات میں دوچار ہوتےہیں۔ جو ہاتھ جوڑے کھڑے تھے، وہیں کھڑے رہے اور جو بیٹھے ہوئے تھے، وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ کیمروں کو دیکھ کر کام کرنے والے بچوں کی آنکھیں چمکی ضرور تھیں لیکن اس چمک کو زائل ہونے بھی دیر نہیں لگی؛ وہ دوبارہ کسی روبوٹ کی طرح اپنا کام کرنے لگے۔

"کون ہو بھئی۔ یہاں کیا کررہیہو، کس لیے آئے ہو۔" اس نے بگڑتے ہوئے کہا۔

"ہمارا تعلق ٹی وی چینل سے ہے"۔ نمائندے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"بسم اللہ، بسم اللہ۔ آپ تو ہمارے مہمان ہوئے نا۔ اوئے شیریا! جا جلدی جا، چائے پانی کا بندوبست کر"۔ ٹی وی چینل کا نام سنتے ہی وڈیرے کے تیور بدل گئے۔

"کیسے آنا ہوا۔ آپ کے آنے کا پتا ہوتا تو میں اپنے بندے اور گاڑی بھیج دیتا۔ پتا نہیں آپ کو یہاں تک پہنچتے پہنچتے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی"۔

"بہت شکریہ جناب عالی۔ ہمارے ساتھ آپ کا یہ آدمی تھا اس لیے ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی"۔

"آپ کس لیے آئے ہیں؟ میرا مطلب ہے میرے لائق کوئی خدمت؟"

"اس شخص کے بیٹے کسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ان کا علاج امریکہ یا انگلینڈ میں ہوسکتا ہے لیکن علاج مہنگا ہے۔ اس غریب آدمی کے پاس اتنے وسائل نہیں؛ ہمارے چینل نے ان کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ میں انھیں لینے آیا ہوں، اس کے لیےآپ کی اجازت کی ضرورت ہے"۔

"سو بسم اللہ جناب! میری اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے پتا ہوتا اس کے گھر میں بیماری ہے تو میں خود ان کا علاج کراتا۔ اس غریب کے بچے ٹھیک ہوجائیں تو مجھ سے زیادہ کس کو خوشی ہوگی۔ کیوں بھئی ہیرے؟" وڈیرہ قبیلے کے سردار سے مخاطب تھا۔

"جی سرکار۔ جی سرکار۔ بے شک، بے شک؛ لیکن آپ کی اجازت کے بغیر کیسے جاسکتا ہے۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں"۔ ہیرے نے تھرتھر کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

چینل کی ٹیم نیو ڈیرے کے اصرار پر صرف چائے پی اور مقررہ دن تیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوگئے۔"

"ہیرے تو یہاں ٹھہر جا۔ کچھ پیسے لیتا جا، اس بے چارے کو دے دینا، شہر میں اس کے کام آئیں گے۔ میرے آدمی چھوڑ آئیں گے"۔ وڈیرے نے انھیں گاڑی پر بیٹھنے سے پہلے روک دیا۔

ٹی۔ وی چینل کی گاڑی اوجھل ہوتے ہیں وڈیرہ ہیرے پر برس پڑا:

"اوئے ہیرے! اب تیری پہنچ اتنی ہوگئی کہ ٹی۔ وی چینل کی گاڑیاں ہمارے دروازے پر آنے لگیں۔ ٹی۔ وی والے کیمرے لے کر ہماری گلیوں میں دوڑتے پھرتے ہیں اور تم نے ہمیں خبر ہی نہیں کی۔"

"نہیں سرکار نہیں! میں نے انھیں نہیں بلایا۔ یہ لوگ کسی اور کام کے لیے یہاں آئے تھے۔ بچے دیکھے تو ترس کھا کر علاج کا کہنے لگے۔ آپ ناراض ہیں تو یہ نہیں جائے گا۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں"۔

"اوئے بڈھے! وہاں جا کر کوئی فضول بات منہ سے نہ نکالنا۔ ان ٹی۔ وی والوں کو بک بک کی عادت ہوتی ہے؛ ہمارا پوچھیں تو پتا ہے کیا کہنا ہے؟" وڈیرے نے براہِ راست کالو کو ڈانٹتے ہوئے سوال کیا۔

"سرکار آپ کا نمک کھاتا ہے، نمک حرامی تھوڑی کرے گا۔ آپ کی مہربانیوں کی بات کرے گا"۔ کالو کی بجائے ہیرےنے جواب دیا

"بالکل۔ اسے بھی اچھی طرح سمجھا دینا۔ اب جاؤ"۔

ڈانٹ ڈپٹ اور بے عزتی سے لتھڑے دونوں ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ان کا گوٹھ یا علاقہ یہاں سے دور تھا لیکن وہ پیدل ہی چل پڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وڈیروں کی گاڑیاں مزدوروں اور مجبوروں کے کم زور وجود نہیں اٹھایا کرتیں۔راستے میں ہیرے کا غصہ کالو کو اذیت پہنچاتا رہا۔

مقررہ دن چینل کی گاڑی کالو کے خاندان کو لے گئی۔اگر چہ اس دن کے لیے بچوں کو خاص طور پر نہلا یا دھلایا گیا تھا لیکن پھر بھی غذا کی کمی قلت اور غربت صاف نظر آ رہی تھی۔

بچے اور ان کے والدین سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔کئی کیمروں کی آنکھیں مسلسل کالو اور بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔کالو کے لیے یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔زمین پر بیٹھنے والا کرسی پر بیٹھ کر بے چینی محسوس کر رہا تھا؛لیکن بچوں کے علاج اور امدادی رقم کی امید میں وہ اپنی گھبراہٹ اور بے چینی سے مسلسل لڑ رہا تھا۔اس کے سامنے ملک کے نام ور ٹی۔وی سٹار،کھلاڑی،ادیب اور دانش ور بیٹھے ہوئے تھے۔معذور بچوں اور ان کے والدین کی حالت دیکھ کر ہر دل اداس اور ہر آنکھ نم ناک تھی۔باپ قرض کی بھاری گٹھری اٹھائے یہاں تک پہنچا تھا،اسے یقین تھا کہ بچوں کے علاج کے ساتھ ساتھ اسے اتنی رقم ملے گی کہ وہ قرض اتارنے کے ساتھ ساتھ اچھی زندگی کا آغاز کر سکے گا۔

ایک آدمی حاضرین کو بچوں کی بیماری کی تفصیلات،ڈاکٹروں کی تجویز،علاج اور اخراجات بتا رہا تھا۔اس کے خاموش ہو جانے کے بعد ایک ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔یہ آدمی جو ملک کا معروف اداکار اور پروڈیوسر تھا،سٹیج پر آنا چاہتا تھا۔اسے سٹیج پر بلا لیا گیا۔کالو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔وہ سوچ رہا تھا کہ نو دس لاکھ روپے تو پکے ہو گئے۔اتنی دیر میں وہ اداکار مائیک تک پہنچ کر اعلان کر رہا تھا:

"حاضرین! مجھے ان بچوں کو اس تکلیف میں دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ہم لوگوں نے اس سے پہلے اس طرف کیوں توجہ نہ دی۔میں چینل کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہماری آنکھ کھول دی ہیں۔میں اپنی طرف سے اپنی تین مہینے بعد ریلیز ہونیوالی فلم کی پہلے دن کی تمام کمائی ان بچوں کے علاج کے لیے وقف کرتا ہوں۔"

حاضرین نے خوب تالیاں بجائیں۔معذور بچوں کے باپ کے چہرے پر چھپی حیرانی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔وہ اس بات پر حیران تھا کہ اس شخص نے ایک پیسا نہیں دیا،تو تالیاں کیوں بجائی جا رہی ہیں۔وہ اسی سوچ میں گم تھا،اسے پتا ہی نہ چلا کہ قومی کرکٹ ٹیم کا ایک مشہور کھلاڑی مائیک تک پہنچ چکا ہے۔اس نے جب بچوں سے ہمدردی جتائی تو یہ غریب سوچ کی زنجیریں توڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔اس وقت وہ کھلاڑی امداد کا اعلان کر رہا تھا:

" مجھ سے ان بچوں اور ان کے والدین کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔اس لیے میں اپنی طرف سے اپنی یہ شرٹ پیش کرتا ہوں۔اس شرٹ پر پوری ٹیم کے کھلاڑیوں کے دستخط ہیں"۔اس نے شرٹ لہرا کر حاضرین کو دکھائی اور اس کے حوالے کر دی۔اس کے پیچھے پیچھے ایک کھلاڑی اپنا بیٹ اور ایک کھلاڑی اپنی ہاکی بھی اس کے ہاتھ میں تھما گیا۔

ہال میں ایک بار پھر بجنے والی تالیاں اس کے دل پر گھونسے مار رہی تھیں۔اس نے بے بسی سے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔اسی دوران میں ایک مشہور و معروف ڈاکٹر صاحب سٹیج پر آ چکے تھے۔انھوں نے بھی اپنی طرف سے یہ پیش کی:

"جب بچوں کا علاج شروع کیا جائے تو ان بچوں کے ٹیسٹ ہمارا ہسپتال بالکل فری کرے گا۔"

ایک ادیب نے اپنی کتابوں کا سیٹ بہ طور چندہ پیش کیا۔ایک حکومتی نمائندے نے وڈیو لنک کے ذریعے بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ بچوں کے علاج کے لیے وزیر اعظم سے بات کرے گا۔اسی طرح کئی نام ور اور مشہور و معروف لوگ سٹیج پر آئے،کسی نے شرٹ دینے کا احسان کیا،کسی نے بیٹ دیا،کوئی ہاکی تھما کر داد لے گیا اور کوئی وعدے کا ہار پہنا گیا۔پروگرام ختم ہو گیا تھا۔ہاتھوں نے تالیاں بجا بجا کر ہال سر پر اٹھا لیا تھا لیکن کالو کسی اور سوچ میں گم تھا۔اسے تو اب یہ غم ستائے جا رہا تھا کہ اپنی بستی میں واپس کیسے جائے گا۔اس کے پاس تو واپسی کا کرایہ بھی نہیں تھا۔

اپنی زبان

غیر کی زبان پر عبور ہونے کے باوجود اپنی زبان کے ساتھ دل لگی آزادی کا ظاہری ثبوت ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔

وائسرائے ہند، مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے انکے رہائش گاہ آتا ہے۔مولانا آزاد کے ساتھ ترجمان بیٹھا ہوتا ہے-وائسرائے جو بات کرتا ہے ترجمان اسکا ترجمہ کرکے مولانا آزاد کو بتاتا ہے-پھر مولانا آزاد کی ہر بات کا ترجمہ انگریزی میں کرکے وائسرائے کو بتاتا ہے۔

یوں ہوا کہ ترجمان کچھ ترجمہ درست نہ کرسکا تو مولانا آزاد نے اسکی غلطی درست کرکے کہا کہ یوں کہو۔ملاقات کے اختتام پر وائسرائے مولانا آزاد سے بولا جب آپ کو انگریزی آتی ہے تو پھر ساتھ ترجمان کیوں بٹھایا؟ مولانا ابوالکام آزاد نے فرمایا:" آپ پانچ ہزار میل چل کر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکے۔میں گھر بیٹھے ہوئے کیسے اپنی زبان چھوڑ دوں۔

اَنا کی صلیب پر۔۔۔!!!

ڈاکٹرعبدالباری
(کراچی)

مانسون کے دنوں میں لاہور کا موسم کتنا خراب ہو جاتا ہے۔ آسمان پر گھرے بادل اور زمین پر شدید حبس!۔۔۔اتنی گھٹن کہ سانس لینا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔اس گھٹن سے گھبرا کروہ ننگے پاؤں لان میں نکل آئی۔یکا یک موسم کا زور ٹوٹا۔ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔اسے بارش میں بھیگنا ہمیشہ سے پسند تھا۔وہ چند دن پہلے ہی امریکہ سے لوٹی تھی جہاں اس کی بیٹی ہیوسٹن میں کینسر اسپیشلسٹ تھی۔ایک بیٹی تو پہلے ہی داغ مفارقت دے چکی تھی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد خاور بھی ایک حادثے میں ساتھ چھوڑ گیا تھا۔اس کے بعد وہ اپنے اور خاور کے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کی جدو جہد میں لگ گئی۔ ان دونوں کا مشترکہ خواب مہوش کو ڈاکٹر بنانا تھا۔خاور کا گھرانہ یوں بھی آسودہ حال تھا اور وہ خود بھی ایک اچھی ڈاکٹر تھی لہٰذا اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے میں اسے چنداں دِقت نہ ہوئی اور وہ بڑے فخر وغرور سے مہوش کو ڈاکٹر بنتے دیکھتی رہی۔یوں خاور کی جدائی کا زخم بھی رفتہ رفتہ بھرتا چلا گیا۔مشکل تو اس وقت ہوئی جب مہوش نے امریکہ جانے کی ضد کی۔چھوٹی بہن دماغی کینسر میں مبتلا ہوکر انہیں چھوڑ گئی تھی،سواس بیماری کے خلاف جہاد ہی مہوش کا مقصد حیات بن گیا تھا۔وہ بھی تو اپنے گھر والوں کو سندھ کے ایک شہر میں چھوڑ کر لاہور آبسی تھی۔۔۔پر کتنا فرق تھا دونوں کی ہجرت میں!اس نے تو اپنا شہر کسی کی محبت کو ٹھکرا کر چھوڑا تھا اور مہوش بہن کی محبت کو اپنا مقصد حیات بنا بیٹھی تھی۔دوسری بار اسے کسی کے خواب چکنا چور کرنے کی ہمت نہ ہوسکی اور مہوش اسے تہنا چھوڑ کر امریکہ چلی گئی۔

بارش تیز ہونے لگی تو وہ تیزی سے کمرے میں آگئی۔آئینے پر نظر پڑی تو چونک پڑی۔کیا یہ وہی تھی جس پر ایک عالم فریفتہ تھا جس کے تعاقب میں نظریں رہتی تھیں۔موٹی موٹ،مدھ بھری نشہ برساتی آنکھوں کے دیپ اب دھندلانے لگے تھے۔گھنی ابریشمی سیاہ زلفیں وقت کی دھول میں اَٹ کر خاکستری ہو چلی تھیں جن میں جا بجا چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے۔جسم کا گداز پن اب ڈھے چلا تھا۔اس کا فتنہ انگیز سراپا جو انٹر سائنس کے زمانے میں ساتھی لڑکوں پر قیامت ڈھاتا تھا اب اپنی کشش کھوتا جارہا تھا۔اس کی وہ مورنی جیسی باوقار چال وہ بانکپن جوڑوں کے درد کی بنا پر ماضی کی داستان بن گیا تھا۔وقت کتنا ظالم ہے کس بے دردی سے جوانی کی امنگوں، حوصلوں اور سنہری دنوں کو ماضی کے اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے۔وہ کانونٹ سے میٹرک کرکے آئی تھی۔سندھ کے اس چھوٹے سے شہر میں انٹر کا ایک ہی کالج تھا جہاں مخلوط تعلیم تھی۔اس نے آتے ہی سب پر اپنی دھاک بٹھادی۔ذہین تو تھی ہی،فرفر انگریزی بولتے جب وہ اساتذہ کے سوالات کے جواب دیتی تو سب دنگ رہ جاتے۔ اس کا سحر تو جب ٹوٹا جب مہروز نے کالج میں قدم رکھا۔درمیانہ قد،قبول صورت، چرب زبان،ذہین،اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت۔وہ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر پہلی رو میں بیٹھا کرتا تھا۔کبھی کبھی کنکھیوں سے نگاہوں کے تبادلے اور ایک دوسرے پر مسکراہٹیں بھی نچھاور کی جاتی تھیں۔۔۔جلد ہی جہاں اس کا طوطی بولتا تھا وہیں مہروز کے قدم بھی جم گئے پر ایک مسابقت کی دوڑ تھی جو ان کے درمیان جاری تھی۔ پر وہ ہمیشہ مسکرا کر ہی ملتے تھے۔جوانی کی بہاروں میں شاید ایسے ہی ہوا کرتا ہے، ہر کھلتے،خوش رنگ پھولوں پر بھونرے منڈلاتے رہتے ہیں۔اس نے زبان سے تو کبھی اقرار نہیں کیا تھا پر لگتا تھا مہروز بحرِ محبت میں چھلانگ لگا بیٹھا ہے۔اس نے سوچا، اچھا ہے اس طرح بہک کر وہ مسابقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔اس نے اس کے ان خفتہ جذبات کی نہ تو پذیرائی اور نہ ہی دل شکنی۔۔۔یہ سلسلہ چلتا رہا۔ایک روز وہ مونگیا دوپٹہ کیا اوڑھ کر آئی،وہ اس کی پہچان بن گیا۔سب کہنے لگے مونگیا دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ اور بھی دمکتا ہے۔رفتہ رفتہ اسے یقین ہوگیا کہ مہروز کی دلچسپی روز افزوں ہوتی چلی جارہی ہے اور وہ اس کی زلفوں کا اسیر ہوگیا ہے۔کالج الیکشن کے زمانے میں وہ کلاس کی نمائندگی کا امیدوار تھا۔اپنی جملہ صلاحیتوں اور مقبولیت کے باوجود ہار گیا۔ اسے یاد آیا اس نے کیسے دلاسے دیئے تھے۔۔۔ایک بار بخار میں اس کی طویل غیر حاضری پر وہ کیسے بکھر گئی تھی۔کلاس تو کیا،اسے پورا کالج خالی خالی لگتا۔یہ کیا تھا؟ کیا وہ بھی۔۔۔؟اسے یقین تھا وہ کبھی کسی سے محبت نہ کرسکے گی۔گھر میں وہ اپنے باپ کے ماں سے ناروا سلوک اور آئے دن کے جھگڑوں سے بیزار تھی،ابّا اپنی بیٹھک میں رقص و سرور اور حسن وشباب کی محفلیں سجاتے،امّاں کے ٹوکنے پر نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی۔ ماں کے آنسو اس کے دل ودماغ تک جا پہنچتے اور تب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔سندھ ہی میں کیا،اس ملک میں ہر جگہ مردوں ہی کی حکومت ہے۔عورتوں کو کمتر مخلوص سمجھنے والے اُن سے برتے گئے ہر ناروا سلوک کو مردانہ شان گردانتے ہیں۔شروع شروع میں محبت کے ڈھکوسلے جتانے والے، واری نیاری ہو جانے والے مرد،دل بھر جانے پر تھوڑے ہی عرصے میں سر چڑھے جادو کو پاؤں کی جوتی بنا لیتے ہیں۔مہروز اسے اچھا لگتا تھا اس میں وہ سب کچھ تھا جس کے لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں۔۔۔پر تھا تو مرد! کیا پتہ، اپنی جون بدل کر اس کے باپ جیسا ظالم ہو جائیں۔اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس کھیل کو وہ یہیں روک دے گی۔اس نے مہروز سے بے اعتنائی برتنی شروع کردی۔مرجھایا، مرجھایا سا مہروز شروع میں تو لڑکھڑایا پھر مایوس ہوکر اپنی پڑھائی میں لگ گیا۔ویسے بھی ان دنوں ہمارے ایک ہی خواب تھے۔ میڈیکل کالج میں داخلہ!!! نتیجہ آنے پر وہ صوبے بھر میں اوّل آیا۔مجھے لگا دل کے ٹوٹنے پر اس نے اپنی ساری توجہ پڑھائی کو دے دی اور صلہّ پا گیا۔میں جو اس کے قدموں میں خود کو ہارنے لگی تھی سنبھلنے سے امتیازی نمبروں سے پاس ہوگئی۔۔۔ہم میڈیکل کالج میں آگئے۔۔۔یہاں بھی اس نے ایک روز مجھے کاریڈور میں آلیا۔۔۔ تسنیم کتنا خوبصورت کالج ہے،لڑکے لڑکیوں کا اژدہام ہے۔ایسے میں چند چہرے ہی

صورت آشنا ہیں۔۔۔کیا ہی اچھا ہوا گر ہم پرانی خوشگوار یادوں کے سائے میں اپنا تعلق قائم رکھیں۔نجانے کیوں مجھے قہر میں ڈوبے ہوئے اپنے باپ کا چہرہ یاد آ گیا اور میں ایک شان بے نیازی سے کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔میری اس حوصلہ شکنی سے شاید وہ ٹوٹ گیا۔۔۔کلاس میں ماضی کی طرح چھا جانے کے باوجود، وہ سال اوّل کے امتحانات میں اپنی امتیازی پوزیشن برقرار نہ رکھ سکا۔۔۔میں جو اس کی گونا گوں صلاحیتوں کی دل سے قدر دان تھی۔۔۔برداشت نہ کر پائی اور اس کی صلاحیتوں کو مہمیز دینے کے لیے ایک گری ہوئی حرکت کر بیٹھی جس پر آج بھی میں شرمندہ ہوں۔میں اپنی والدہ کو لے کر اس کے گھر چڑھ دوڑی اور روتے ہوئے شکایت کی کہ مہروز کالج میں میرا پیچھا کرتا ہے مجھے بدنام کر رہا ہے۔میری توقع کے عین مطابق میری یہ حرکت اس کے اعصاب پر بجلی بن کر گری اور محبت کے خول میں لپٹا مہروز ایک بار پھر اپنی جملہ صلاحیتوں سمیت کالج کے نصابی اور غیر نصابی میدان میں ڈٹ گیا۔ایک بار پہلے بھی وہ میری بے اعتنائی پر صوبے بھر میں اوّل آیا تھا اور ایک بار پھر میری اس گری ہوئی طفلانہ حرکت سے مہروز مجھ سے بیزار ہو کر کالج پر چھا گیا۔باصلاحیت تو وہ تھا ہی کلاس میں پوزیشن بھی لی، تقریری مقابلوں میں جھنڈے گاڑے، میگزین سیکرٹری بنا اور وہ جو کلاس کی نمائندگی کا الیکشن انٹر سائنس میں ہارا تھا بلا مقابلہ طلباء یونین کا جنرل سیکرٹری بھی منتخب ہوا۔میں جو اس کی کامیابیوں پر دل میں فرحاں و نازاں تھی، ٹوٹ گئی اور اپنی جملہ صلاحیتوں کو سرد خانے میں ڈال کر ایک عام طالبہ کی طرح میڈیکل کالج میں دن گزارنے لگی۔پر دل ہی تو ہے۔۔۔اُبال آ جائے تو سب کچھ فراموش کرنے لگتا ہے۔

غالباً تیسرے سال کے کلاس فنکشن کے جب ہال خالی ہو گیا۔مہروز اور اس کے گروپ کے چند لڑکے اور کچھ لڑکیاں باقی رہ گئے۔ہمیں اسٹیج کی آرائش میں استعمال ہونے والے اپنے دوپٹے واپس لینے تھے، ہم سب خوش، مطمئن اور فنکشن کی کامیابی پر مگن تھے۔۔۔موقع پاتے ہی محفل سجا بیٹھے۔گانوں کی فرمائش ہوئی۔۔۔میری ایک ساتھی جو بہت خوش گلو تھی اور مہروز پر فدا بھی، اس نے انتہائی خوبصورتی سے یہ غزل گائی:

کسی سرنگوں سی ڈالی پہ رکھیں گے چار تنکے
نہ بلند شاخ ہو گی، نہ جلے گا آشیانہ

غالباً مہروز کے نظر انداز کرنے پر وہ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ہاسٹل میں چونکہ میں بھی گا لیتی تھی سب میرے پیچھے پڑ گئے۔میں جو اتنے عرصے سے مہروز کی محبت میں جل رہی تھی بظاہر اس سے بیزار، پر اندر سے اس پر نثار، خود پر قابو نہ رکھ سکی اور گانے لگی:

لگا کر تم سے دل خواب پریشاں کون دیکھے گا
شبِ غم کی درازی، زلفِ جاناں کون دیکھے گا

میرے اس متضاد عمل سے جانے اس پر کیا گزری ہو گی۔۔۔متغیر چہرہ، بکھرے بال، بے بسی سے ہونٹ کاٹتا مہروز ٹھکرائے جانے کے ردِّعمل کی زندہ تصویر بنا بیٹھا تھا۔

وہ دن تو بھلائے نہیں بھولتا۔۔۔ہم ڈاکٹر بن چکے تھے اور وہ ہمارا کالج میں آخری روز تھا۔۔۔کالج کی سیڑھیاں چڑھتا مہروز مجھے اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔۔۔اس کی نگاہوں میں کامیابیوں اور تمناؤں کے دیئے روشن تھے۔مجھے روک کر اس نے کہا تسنیم مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔۔۔میرا وجدان مجھے بتا چکا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔۔۔میں نے زبردستی چہرے پر ناگواری کے تاثرات لاتے ہوئے کہا مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔۔۔شاید یہ میری احمقانہ سوچ تھی کہ اگر میں نے اس وقت سپر ڈال دی تو مہروز کی کامیابیاں ادھوری رہ جائیں گی۔۔۔میں اسے دنیا کا سب سے کامیاب انسان دیکھنا چاہتی تھی۔میں اسے کیسے اپنی محبت کے گرداب میں ڈبو دیتی۔مجھے معلوم تھا میری لگائی ہوئی ہر چوٹ پر تلملا کر وہ اپنا آپ منوانے کی تمام تر کوششیں کر ڈالتا ہے۔میری دلی تمنا تھی کہ دنیا بھر کی کامیابیاں اس کے قدموں تلے ہوں۔چاہے میں ساتھ ہوں نہ ہوں۔مجھے یقین تھا میری لگائی ہوئی یہ آخری چوٹ بھی اس کی صلاحیتوں کو مہمیز کر دے گی۔ویسے بھی کب اس نے مجھ سے گڑگڑا کر محبت کے لیے اپنا دامن پھیلایا تھا شاید یہ بھی میری انہونی خواہش تھی کہ وہ اپنا مردانہ غرور بھلا کر میرے آگے تڑپے، روئے، گڑگڑائے گو کہ میں نے کبھی اس کے جذبات کی پذیرائی نہ کی تھی پر وہ تو مرد تھا۔میں تو یوں بھی مردوں کی برتری اور ظالمانہ رویوں سے خوفزدہ تھی اور اپنی ماں کے برعکس اپنی برتری اور حاکمیت کی خواہاں تھی۔کیسے اپنا آپ تمام عمر کے لیے اسے سونپ دیتی۔میں نے اس کے عروج کے لیے اپنی خواہشات کی قربانی دی۔اس ڈر سے کہ کبھی میں موم نہ ہو جاؤں۔میں نے وہ صوبہ ہی چھوڑ دیا اور لاہور آن بسی کہ کامیابیوں کے زینے چڑھتا، کسی موڑ پر مہروز میرے سامنے آئے اور میں اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاؤں۔انہیں سوچوں میں گھر کر میں خوشی خوشی اپنی انا کی بھینٹ چڑھ گئی۔اپنے ہی ہاتھوں اپنے ارمانوں کا حشر بر پا کیا اور اب خود ہی اس پر ماتم کناں ہوں۔۔۔یہ سب کتنا اذیت ناک ہے، کوئی میرے دل سے پوچھے۔۔۔مہروز تو شاید ہمیشہ مجھے ہی الزام دے گا۔

لاہور میرے لیے ایک اجنبی شہر تھا۔یہاں ہر چیز مختلف تھی۔زبان، رہن سہن اور طور طریقے۔چند سالوں کی تنہائی کے بعد مجھے خاور مل گیا جو ایک آرکیٹیکٹ تھا۔نجانے اسے مجھ میں کیا نظر آیا، پیچھے ہی پڑ گیا حتیٰ کہ رویا، تڑپا اور گڑگڑایا بھی۔۔۔تیزی سے گزرتے وقت اور تنہائی سے گھبرا کر میں نے ہار مان لی اور اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔ہماری شادی شدہ زندگی چند سالوں پر محیط رہی جس میں، میں نے اسے ہمیشہ مہربان اور محبت کرنے والا پایا۔اس سے میری دو بیٹیاں ہوئیں۔ایک تو دماغی کینسر کے باعث ساتھ چھوڑ گئی۔بڑی بیٹی کینسر اسپیشلسٹ بن کر امریکہ کی ہو گئی اور ایک حادثے میں خاور بھی ساتھ چھوڑ گیا۔خاور اور اس کے گھر والوں نے مجھے اتنا پیار دیا تھا کہ میں رفتہ رفتہ اپنے ماضی کو بھولتی چلی گئی تھی پر ان سب کے جاتے ہی تنہائی کے عفریت نے مجھے گھیر لیا۔آئے دن کی بیماریوں اور تنہائی کی بناء پر مہوش میرے سر ہو گئی کہ کم از کم ایک چکر ہی امریکہ کا لگا لوں۔مجبوراً مجھے جانا پڑا۔مجھے امریکہ کے عجائبات سے کوئی سروکار نہ تھا۔دن تو گزارنا پڑتا تھا، پر شام ہوتے ہی مہوش کے آنے پر میں جی اٹھتی تھی۔

باقی صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ کیجیے

آشیانہ

نصرت شمسی

(رام پور)

آج مجھے بزرگ ولا میں انٹرویو لینے جانا تھا۔ان بزرگوں کے خیالات قلم بند کرنا تھے جو بزرگ ولا میں ایک عرصہ سے رہ رہے ہیں۔اولڈ ہوم کے مثبت اور منفی دونوں پہلو لوگوں کے سامنے لانا تھے تاکہ اس بڑھتے ہوئے مسئلہ کا حل نکل سکے۔لوگ اپنی جائیدادلوگوں،بزرگوں کے لیے وقف کرنے کے بارے میں سوچیں اور ہمارے معاشرے کے بوڑھے والدین بے آسرا نہ ہوں مگر......!

میں نے اپنے شہر میں کھلے بزرگ ولا میں قدم رکھا۔جسے کھلے پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور یہ عرصہ مختصر نہیں کہا جا سکتا۔میں نے ولا میں قدم رکھا،اپنے آنے کی اطلاع میں وہاں کی انچارج کو پہلے ہی دے چکی تھی۔اس لیے تمام عورتیں اپنی آنکھوں میں امید کے چراغ جلائے بڑی بے چینی کے ساتھ میری منتظر تھیں۔میں نے اپنا انٹرویو شروع کیا،بہت سی بزرگ خواتین سے ملاقات کی اور دوسری طرف مردانے میں جا کر بھی اپنے تاثرات قلم بند کیے۔یہ اپنے آپ میں ایک انوکھا بزرگ ولا تھا جس کے ایک حصہ میں خواتین اور دوسرے حصہ میں مرد رہتے تھے۔ناشتہ کھانا اور عصر کی چائے کے بعد مغرب تک تمام مرد اور عورتیں ایک ساتھ رہتے تھے۔اپنے دکھ سکھ بانٹتے اور پھر مغرب کی نماز سے پہلے رات کے کھانے تک کے وقفے کے لیے جدا ہو جاتے،یہاں ذات برادری کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ہر مذہب کے لوگوں کے لیے بزرگ ولا کھلا ہوا تھا اور سب آپس میں انسانیت کے ناطے سے رہتے تھے۔ہر تہوار منایا جاتا،ہر جشن پر چراغاں ہوتا۔بس یہی ان کی زندگی کی ساجھی خوشیاں رہ گئی تھیں۔

انٹرویو کافی اچھا ہوا تھا۔بہت سا مواد میرے پاس جمع ہو چکا تھا۔جو میری کامیابی کا ضامن ثابت ہو سکتا تھا۔میں چلنے کی تیاری میں تھی کہ مجھے ایک کمرے میں ایک عورت بیٹھی دور سے ہی نظر آئی اور میں حیرت زدہ رہ گئی کہ تمام لوگ میرے پاس جمع تھے تو پھر یہ......میرے قدم ان کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

''کیا میں اندر آجاؤں؟''

میں نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

بوڑھی آنکھوں نے مجھے دیکھا اور سر ہلا کر مجھے اجازت دے دی۔میرے پیچھے چند عورتیں بھی تھیں۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟''

میں نے پیشہ وارانہ انداز میں ان سے پوچھا۔کیمرہ آن کیا اور مائک ان کے منہ کے قریب لگا دیا۔

انھوں نے نظریں اٹھا کر جن عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔اف......!کیا تھا ان نظروں میں۔کتنا کرب،اذیت،درد،وقت کی چوٹ،اپنوں سے بچھڑ جانے کا ملال اور اپنوں کی کرم فرمائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔یہ عجیب تاثر تھے جو مجھے ان کے چہرے پر نظر آ رہے تھے ورنہ باہر تو ہر عورت اپنے بچوں سے پیچھا چھڑا کر خوش تھی۔

''یہ اماں بی ہیں۔''

پیچھے سے ایک آواز آئی۔

''اور یہاں آنے والی سب سے پہلی خاتون بھی۔''

اس خبر نے مجھے حیران کر دیا اور میں اماں بی کے قریب آ گئی۔

''آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔''

میں نے سوال کیا۔میرے سوال نے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ان کے ہاتھ کپکپانے لگے۔بچھڑ جانے کا دکھ ان کے چہرے کی ایک ایک سلوٹ سے عیاں ہونے لگا،ناک پھڑ پھڑانے لگی اور ہونٹ کانپنے لگے۔

''بیٹا!''

انھوں نے حلق پر زور ڈال کر مجھے پکارا۔

''میرے الفاظ تمہارے اس انٹرویو کو فیل بھی کر سکتے ہیں اور لاکھوں بوڑھوں کو ناپسند بھی آ سکتے ہیں مگر میں صرف اپنی بات ہی کہنا چاہوں گی۔اس......اس بزرگ ولا نے اگر مجھے سہارا دیا ہے تو......تو اسی بزرگ ولا نے مجھ سے میرا گھر بھی چھینا ہے۔''

''جی......!''

ان کے اس انکشاف سے میں حیران رہ گئی۔

''مگر وہ کیسے......؟''

میں نے پوری دل جمعی سے اپنی توجہ ان کی طرف مبذول کر لی۔

''بیٹا میرے تین بیٹے اور تین بہوئیں تھیں۔سب اپنی اپنی زندگی میں خوش تھے۔چھوٹی موٹی کھٹ پٹ ہوتی رہتی تھی۔میری بہوئیں مجھے برداشت نہیں کرتی تھیں۔مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں اب انھیں بری لگنے لگی ہوں۔گھر کا ایک کمرہ میرے پاس تھا مگر!خیر جو بھی تھا جیسا بھی تھا میرا گھر تھا۔جہاں میں نے ساری عمر گزاری تھی۔مجبوری میں ہی سہی میری اولادیں مجھے رکھے ہوئے تھیں۔یہ سوچ کر کہ وہ آخر میرے ساتھ کر بھی کیا سکتی تھیں۔گھر کی فرد تھیں گھر میں ہی تو رہیں گی مگر انھیں دنوں یہ بزرگ ولا کھل گیا اور میرے بچوں کو جیسے موقع مل گیا۔میرا وجود انھیں فوراً بوجھ لگنے لگا۔اس کمرے کے لیے سب کی ضرورتیں سامنے آنے لگیں۔مجھ سے میری بہوئیں بے وجہ شاکی رہنے لگیں اور اس کا بیان وہ اپنے شوہروں سے بھی کرنے لگیں۔اب ان سب کو یہ بزرگ ولا اپنے مسائل کا حل نظر آنے لگا حالانکہ اگر یہ بزرگ ولا نہیں کھلتا تو میں جس طرح بھی رہ رہی تھی اپنے

گھر میں تو تھی، اپنے بچوں کی شکلیں تو مجھے دکھتی تھیں۔ اپنے پوتے پوتیوں کی آوازیں ہی میرے سناٹے دور کر دیا کرتی تھیں۔ ہفتہ میں ایک بار ہی سہی مجھے ان کا قرب تو نصیب ہو جاتا تھا۔ دنیاداری کو ہی سہی خوشی وغم کے موقع پر وہ سب میرے ساتھ تو ہوتے تھے۔ کبھی بھولے بھٹکے میرے نالائق بیٹوں کو میرا وجود تو نظر آتا تھا۔ میرا حال تو پوچھ لیا کرتے تھے...... میرے قریب تو آجایا کرتے تھے مگر......اب......"

یہ عجیب وغریب سوچ جب میرے سامنے آئی تو میں حیران رہ گئی۔

ممتا کی ماری اس عورت کی سوچ کہہ رہی تھی کہ یہ اولڈ ہوم ہی ہم بزرگوں سے ہمارے گھر ہماری اولادیں چھین رہے ہیں اگر ان کے کھلنے کا رواج ہی ختم ہو جائے تو کسی بھی طرح سہی ہر بزرگ اپنوں میں تو رہے گا۔ ماں اپنے بچوں سے دور تو نہیں ہوگی۔ ماں تو وہ عظیم ہستی ہے جو ہزاروں دکھ سہہ کر بھی بچوں کو خوش دیکھ کر خوش رہتی ہے۔ اس کی پہلی اور آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ بس اس کی اولاد اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ ان بزرگ ولا جیسے گھروں نے نہ صرف ان سے گھر چھینے ہیں بلکہ رشتے اور ان کے لمس بھی چھین لیے ہیں۔ زندگی کے بچے کھچے سارے رنگ بھی چھین لیے ہیں۔ میری سوچ کو ایک نئی راہ ملی تھی۔ ان اماں بی کی بات نے میری سوچ کا رخ بھی بدل دیا اور میں یہی سوچتی رہی کہ کیا باقی لوگ بھی ان کی سوچ سے متفق ہوں گے؟...... آپ بتایئے آپ کیا سوچتے ہیں؟ کیا اماں بی سہی ہیں؟

"چھانگ ای چار"

چین کی قومی خلائی انتظامیہ نے اتوار کے روز بتلایا "چھانگ ای چار تحقیقی چاند گاڑی کا انیسواں قمری دن تمام ہوا۔ "چھانگ ای چار" کا تحقیقاتی سفر ۸۔ دسمبر ۲۰۱۸ء کو شروع ہوا تھا۔ ایک سال سے زائد کامیاب سفر کے بعد "چھانگ ای چار" ۳۔ جنوری ۲۰۱۹ء کو چاند کے قطب اٹیکن بیسن وون کرمانا کریٹر پر پہلی بار اُترا تھا۔ ٹائیڈل لاکنگ اثرات کے سبب چاند کے گھومنے کا دائرہ اس کی گردش کی مانند ہے۔ ایک قمری دن زمین کے چودہ دنوں اور ایک قمری رات بھی اتنی طویل ہوتی ہے۔ انیسویں قمری دن کے دوران اس چاند گاڑی نے مغرب کی جانب تقریباً تین میٹر کے فاصلے پر ایک گڑھے کی جانچ کر کے سراغ رسانی کے اعداد و شمار کی نئی کھیپ حاصل کی۔

آم کا سہرا

جو آم میں ہے وہ لبِ شیریں میں نہیں رس
ریشوں میں ہے جو شیخ کی داڑھی سے مقدس

آتے ہیں نظر آم تو جاتے ہیں بدن گس
لنگڑے بھی چلے آتے ہیں کھانے کو بنارس

ہونٹوں میں حسینوں کے جو امرس کا مزہ ہے
یہ پھل کسی عاشق کی محبت کا صلہ ہے

آمد سے دسہری کے ہے منڈی میں دسہرا
ہر آم نظر آتا ہے معشوق کا چہرا

ہر رنگ میں ہلکا ہے تو اک رنگ میں گہرا
کہہ ڈالا قصیدے کے عوض آم کا سہرا

خالق کو ہے مقصود کہ مخلوق مزہ لے
وہ چیز بنا دی ہے کہ بڈھا بھی چبا لے

پھل کوئی زمانے میں نہیں آم سے بہتر
کرتا ہے ثنا آم کی غالب سا سخنور

اقبال کا ایک شعر قصیدے کے برابر
چھلکوں پہ بھنک لیتے ہیں ساغر سے پھٹیچر

نفرت ہے جسے آم سے وہ شخص ہے بیمار
لیتے ہیں شکر آم سے اکثر لب و رخسار

آموں کی بناوٹ میں ہے مضمر تیرا دیدار
بازو ودسہری سے وہ کیری سے لبِ یار

ہیں جام و سبو خم کہاں آنکھوں سے مشابہ
آنکھیں تو ہے بس آم کپھانکوں سے مشابہ

کیا بات ہے آموں کی ہوں دیسی کہ بدیسی
سرخے ہوں سرولی ہوں کہ تخمی ہوں کہ قلمی

چونسے ہوں سفیدے ہوں کہ کھجری ہوں یا فجری
اک طرفہ قیامت ہے مگر آم دسہری

فردوس میں گندم کے عوض آم جو کھاتے
آدم کبھی جنت سے نکالے نہیں جاتے

''وہ''

ڈاکٹر فیاض احمد ڈار
(آرتھ بڈگام)

چاردیواری میں مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ اس میں داخل ہو چکا تھا۔اندراس کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تھی مگراُس کی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔وہ صوفی کی طرح دم لیا ہوا اندر بیٹھا تھا۔میں اُس کی کج روش سے تنگ آ گیا۔اس کا منہ قفس بنا ہوا تھا حالانکہ اُس کے ساتھ بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا مگر۔۔۔آج اُس کی خاموشی سے میرے دل کی کلی نہیں کھلی۔میں دل میں سوچنے لگا کہ وہ اس طرح کبھی خاموش نہ رہا۔نہ جانے اُسے کیا ہوا۔میں نے اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔پھر بھی وہ کنائیوں سے کام لیتا رہا۔میں چیخا، چلایا لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔وہ خاموش تماشائی بن کر دیکھتا رہا۔چاردیواری میں وہ آتا تھا لیکن بے چین دکھائی دیتا۔دال میں کچھ کالا ہے ورنہ وہ خاموش نہیں رہتا۔مجھے تشویش ہوئی کہ کسی نے اس کے کان تو نہیں بھرے ورنہ وہ نہیں روٹھتا۔

دراصل میں اس کے ارادوں کو بھانپنے میں ناکام ہوا اور میں نے اُس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔وہ گونگے کی طرح سلوک کرتا رہا جس سے میں مبہوت ہوا۔پھر اشارے میں ہی اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔میں چلا اس کے ساتھ سفر کیا اور بہر حال سفر میں وہ آگے بڑھا اور میں نے اُس کا تعاقت کیا۔سفر کے دوران ایک دفعہ جی۔۔۔میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو نظر نہیں ٹھہری۔کیونکہ سفر بہت طویل تھا۔وہ پھرتیلا تھا اور چلنے میں کوتاہی ہرگز نہیں برتتا۔وہ آگے نکلا اور مجھے پیچھے رہتے دیکھ کر اُس نے خاموشی توڑ دی۔

اب کیوں چل نہیں رہے ہو؟

چلو ابھی منزل نہیں آئی۔

مگر ٹانگیں سوجھنے سے میرا دل آگے جانے کو نہیں کرتا۔اس لیے میں نے چلنے سے انکار کیا حالانکہ اُس نے مجھے منوانے کی بے انتہا کوشش کی مگر میں نے نہیں مانا، تنگ آ کر اُس نے کہا:

''تم تو سرکش ہو، باغی ہو۔۔۔اب میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔تم امیدوں پر کھرا نہیں اُترے۔بالکل نہیں اُترے۔آج میں تم کو خلوص کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ دوستی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔تم مغرور ہو۔اور مجھے اب تم جیسے مغرور کے ساتھ رہنے کو دل نہیں کرتا۔''

یہ کہہ کر وہ بھاگ گیا سنسان کی اور۔میں کچھ بھی نہین کر پایا۔اب مجھے اُس کی جدائی ستانے لگی، رُو رُو کر مجھے ہچکیاں ہونے لگیں۔پھر اپنے ہی جیسے آدمی نے میرے آنسو پونچھے اور کہنے لگا کہ تو اتنا مغموم کیوں ہے؟

کیا بتاؤں؟ آج میرا ہمسفر مجھ سے چھوٹ گیا۔

''وہ کہاں گیا؟''

'سُنسان کی اور'

''مگر''

''مگر کیا''

وہاں دوجے کو ساتھ لینے کی اجازت نہیں۔اس لیے وہ اکیلے گیا۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اپنے سوا کسی کو نہیں پایا۔پھر مجھے اُس کے آنے کی توقع نہ رہی۔میں مایوس ہو کر لوٹا اور نظریں چُراتا ہوا سوچنے لگا کہ اُس نے خواہ مخواہ مجھے سرکش نہیں پکارا۔دراصل اُسے مجھ پر توقع ہی اُٹھ گئی۔کیونکہ میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا، بالکل بھی نہیں دیا۔میں سرکش ہوں، ورنہ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاتا۔وہ خوابوں خیالوں میں آتا رہا لیکن بظاہر پھر کبھی نہ ملا۔

نوادرات

قدیم نوادرات جمع کرنے کی شوقین ایک خاتون نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی دکان کے کاؤنٹر پر بلی کو جس پیالے میں دودھ پلا رہا ہے اس چینی کے قدیم پیالے کی قیمت تیس ہزار ڈالر سے کم نہیں۔خاتون نے سوچا کہ شاید یہ شخص اس پیالے کی قیمت سے ناواقف ہے۔اس خاتون نے اپنے طور پر بے حد چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔جناب! کیا آپ یہ بلی فروخت کرنا پسند کریں گے؟ تو اس شخص نے کہا۔یہ میری پالتو بلی ہے، پھر بھی آپ کو یہ اتنی ہی پسند ہے تو پچاس ڈالر میں خرید لیجیے۔

خاتون نے فوراً پچاس ڈالر نکال کر اس شخص کو دیے اور بلی خرید لی، لیکن جاتے جاتے اس دکان دار سے کہا۔میرا خیال ہے کہ اب یہ پیالہ آپ کے کسی کام کا نہیں رہا۔برائے کرم اسے بھی مجھے دے دیجیے۔میں اس پیالے میں بلی کو دودھ پلایا کروں گی۔دکان دار نے کہا۔خاتون! میں آپ کو یہ پیالہ نہیں دے سکتا، کیونکہ اس پیالے کو دکھا کر اب تک 300 بلیاں فروخت کر چکا ہوں۔

ملک میں بسنے والے ان باشعور عوام کے نام جنھیں طرح طرح سے بے وقوف بنایا جاتا ہے۔

(پرمزاح۔۔۔۔لیکن مزاحمت سے گریز۔۔۔۔۔۔۔۔)

’’ **یا اللہ** کتنی بھی کوشش کروں مگر پھر بھی دیر کیوں ہو جاتی ہے......آخر کیوں ں ں ں ں ں ں ں ں ں؟۔۔۔کب امّی مجھے بھی زویا بجیا کی طرح ذمہ دار ہونے کا لقب دینگی۔۔۔‘‘ آشی نے خود سے کہا۔

اس نے آج صبح کا آغاز امّی کے جگانے کے بعد نمازِ فجر سے کیا تھا پھر ہر کام کے لئے موبائل میں ریمائنڈر سیٹ کیا کیونکہ آج اُس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے وجود سے ہمیشہ سے منسلک غیر ذمہ دار ہونے کا لقب ہٹا کر ہی دم لیگی مگر۔۔۔

’’آخر میں دیر ہونا کیا ہمیشہ کی طرح آج بھی فرض تھا؟‘‘ خود سے خفا ہوتے ہوئے آشی نے بڑی اداسی سے اپنے آپ سے شکوہ کیا اصل میں آج واقعی میں اسکی کوئی غلطی نہیں تھی بلکہ بجلی کے چلے جانے سے اسکے کئی کام تھوڑی دیری سے پورے ہوئے، اس لئے وہ قصوروار ٹھہرائے بھی تو کسے۔۔۔خیر یہ بھی آشی کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی بات اس کے مطابق نہ پیش آتی، قصور کسی اور کا ہوتا تو بھی دوسروں کے بجائے وہ خود ہی سے خفا ہو جاتی، اور اس کے پیچھے محترمہ کا یہ فلسفہ کارگر تھا کہ دوسروں سے خفا ہونے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ خود اپنے آپ سے ناراض ہو جانا جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کی بعد میں خود سے نا تو معافی مانگنی پڑتی ہے اور نہ ہی منانے کے لئے کوئی منّت وسماجت، آخر بندہ خود سے کتنی دیر ناراض رہ سکتا ہے اور آشی کے لئے خود سے ہمکلام نہ ہونا تو مانو جوئے شیر نکالنے کے مثل تھا۔

اس نے امّی کے اور اپنے کپڑے استری کر لئے، باورچی خانے میں اپنے حصے کے کام پورے کئے، زویا بجیا کا دیا سینڈوچ بیگ میں رکھا، پھر ایک بار مُڑ کر پورے کمرے کی جانب نگاہ دوڑائی کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی اور بعد میں امّی سے ڈانٹ سننی پڑے، ’’ہم م م م م م م م م م م م۔۔۔سب کچھ تو ٹھیک ہے اوہ! چوکی کی چادر میں اتنی سلوٹیں۔۔۔یہ تو امّی کو ذرا بھی پسند نہیں‘‘ آشی نے جلدی سے سب ٹھیک کیا اور کپڑے تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلی، ابھی سیڑھیوں سے اُتر کر باہر ہی نکلی تھی کہ اسے فوراً کچھ یاد آیا۔۔۔’’یااللہ! سب سے ضروری سامان تو میز پر ہی چھوٹ گیا۔۔۔اگر امّی کی بنائی چیزوں کی فہرست ہی میرے پاس نہ ہوگی تو ہم سامان کیا لائینگے بھلا۔۔۔‘‘ وہ دوبارہ سیڑھیوں پر چڑھ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔۔۔’’اب کیا بھول گئی بھئی! کبھی تو ایک دفعہ میں سب لے کر باہر جایا کرو، ہزار دفعہ سمجھایا کہ صبح کے وقت ایک کاغذ پر ضروری باتیں درج کرلیا کرو اور پھر اسی کے مطابق کام کرلیا کرو، اس سے سارے کام بھی ہو جائنگے اور وقت بھی ضائع نہیں ہوگا مگر ہماری بات کیوں سنینگی۔۔۔‘‘ یہ آواز امّی کی تھی کیونکہ آشی کی عادت تھی کہ وہ اکثر چیزیں بھول جایا کرتی پھر وہ سامان لینے اسے واپس گھر آنا پڑتا تھا۔

بہر حال اس نے لسٹ اٹھائی روڈ پر آ کر رکشہ لیا اور یونیورسٹی پہونچ گئی، اپنے شعبے میں داخل ہوتے ہی آشی نے سامنے کھڑے سر مشتاق کو سلام کیا اور کلاس میں پہنچی وہاں بیٹھتے ہی آشی نے اپنی دوستوں کو اپنا تغلقی فرمان سنا دیا کہ وہ لوگ آج اسے ہر روز کی مانند فضول گپ شپ میں مبتلا نہ کریں کیونکہ اسے بہت سارے کام ہیں اور اسکے ساتھ ہی اس نے آمنہ، پریتی، زینب اور صدیقہ کو شام اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور باقی کی تفصیل شام کو بتانے کا کہہ کر وہ اپنے کاموں میں لگ گئی، پھر جلدی سے لائبریری گئی، وہاں سے اشفاق احمد کی کتاب ایشو کروائی جس کا مطالعہ وہ پچھلے کئی دنوں سے کرنا چاہ رہی تھی کیونکہ ان دنوں وہ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ سے انتہائی درجہ متاثر تھی، وہاں سے لوٹتے وقت اس کی کئی سہیلیاں جو کہ کینٹین میں کھڑی گرما گرم سموسوں کے مزے لوٹ رہی تھیں ان لوگوں نے اسے بھی آواز دی مگر وہ انکے کئی دفعہ کے اسرار پر بھی ادھر کا قصد نہ کر سکی، کیونکہ ابھی اسے کچھ نوٹس زیراکس کے لئے دینے کے ساتھ ہی چند اہم رسالے خریدنے کے لئے جانا تھا مگر اس نے اپنی کلائی پر لگی گھڑی پر جو ہی نگاہ دوڑائی تو وقت اسے ان تمام کاموں کی بلکل بھی اجازت نہیں دے رہا تھا اس لیے اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے ان کاموں کو ترک کرنا بہتر سمجھا، اور جلدی سے باہر نکل کر بازار کے لئے رکشہ لے لیا۔لیکن اتنا سب کچھ اس نے کیا کس لئے تھا؟ آخر اس قدر جلد بازی کا سبب کیا تھا؟ کیا آج کوئی خاص دن تھا؟ جس نے اسے صبح سے ایک لمحے کی بھی مہلت نہ دی تھی۔

دراصل اس سب کے پیچھے یہ وجہ کارفرماں تھی کہ آج بڑے دنوں کے بعد آشی کے گھر خوشیوں نے دستک دی تھی، اسکی امّی جو کافی دنوں سے اپنی بڑی بیٹی زویا کے لئے ایک اچھے رشتے کے انتظار میں پلکیں بچھائے بیٹھی تھی، اور اب تو اس بات کے لئے بارگاہِ خداوندی میں ہر لمحہ ہاتھ پسارے رہنا ہی انکا مقدر بن گیا تھا، لیکن پچھلے ہفتے انکی یہ دعائیں رنگ لے آئیں اور پروردگارِ عالم نے انکی اس دُعا کو شرفِ قبولیت کا درجہ دے ہی دیا، انکی ایک سہیلی کے توسط سے اُنکے گھر ایک بہت اچھے رشتے کی آمد ہوئی، لڑکے نے ہوٹل مینیجمنٹ کی تعلیم لی تھی اور حیدرآباد کے ایک ہوٹل میں اچھے عہدے پر فائز تھا، لڑکے کے والدین نہایت ہی شریف اور عزت دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان لوگوں کو کسی قسم کے جہیز سے سروکار نہ تھا بلکہ ایک دیندار اور مشفق لڑکی کی طلب تھی، جو لکھنو میں مقیم انکے گھر کو سنبھال سکے، کیونکہ پچھلی برس انہوں نے اپنی بیٹی عارفہ کی شادی کی تھی اور اسکی رخصتی ہونے کے باعث انکے گھر میں دشت و بیاباں کے سے سونے پن نے اپنا ڈیرا ڈال لیا تھا، بیٹے کی نوکری باہر ہونے سے والدین اکیلے ہو گئے تھے، لیکن اگر انکی بہو اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد میں قیام کرنا چاہے اور وہ دونوں چھٹّیوں میں اُن سے ملنے آتے رہیں تو وہ اس پر بھی رضامند تھے کیونکہ انکا ماننا تھا کہ بچوں کی خوشی میں ہی انکی خوشی شامل ہے۔وہ لوگ بڑی سادگی سے چند دنوں میں آ کر رسمِ نکاح

کرنا چاہتے تھیں،امّی نے یہ سب سنا تو وہ کس طرح ایسے رشتے پر رضامند نہ ہوتیں، کہاں ایک طرف جہیز لینے والوں میں بھی انہیں ایسا رشتہ نہ ملا تھا اور کہاں اللہ نے انکے گھر اتنا اچھا پیغام بھیج دیا۔امّی نے تو جو کچھ طلب کیا تھا اللہ نے انہیں اس سے کئی درجہ زیادہ عطا کیا، یہ سب سن کر امّی کی آنکھیں اشک آلود ہوگئی اور انہوں نے جانبِ آسماں دیکھ کر کہا۔۔۔’’یا اللہ بیشک تو رحیم اور کریم ہے تیرے جلوے لازوال، تیری عنایتیں بے مثال،اے میرے مولا تونے میری دُعا قبول کر کے زمانے بھر میں اس ماں کی عزت رکھ لی اور میری ہنرمند اور سلقہ شعار بیٹی کا ایسا نایاب رشتہ بھیج کر مجھے دوبارہ زندگی عطا کردی۔۔۔اے پاک بے نیاز میں کن لفظوں میں تیرا شکرادا کروں‘‘۔۔۔اتنا کہہ کر انکی آنکھوں سے اشکوں کی برسات ہونے لگی ۔۔۔اور انکی زبان سے مستقل یہی جملے ادا ہو رہیں تھیں۔۔۔’’شکر ہے میرے مالک تیرا لاکھ لاکھ شکر تیرا لاکھ لاکھ احسان۔۔۔‘‘

اُدھر سے نکاح کی تاریخ کا مطالبہ کیا گیا تو امّی کو فوراً استخارے کا خیال آیا جسکے لئے امّی نے کسی عالم سے کہا اور پچھلی کئی راتوں سے خود بھی نمازِ استخارہ جاری رکھی اور انہیں اس کے اچھے نتائج حاصل ہوئے اس لئے کل ہی نکاح کی ایک تاریخ متعین ہوئی تھی جس پر لڑکے والے بھی رضامند تھے۔ بھلا اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ اس سب کے لئے وہ اپنے خالق کا شکریہ ادا نہ کرتی، اسی سلسلے میں امّی نے آج شام کو محفلِ میلاد کا قصد کر کے کچھ قریبی رشتہ داروں و عزیزوں کو مدعو کیا، اسکے ساتھ ہی رات کے دسترخوان پر محلّے کے قریبی مدرسے میں زیرِ تعلیم کچھ طلباء کو مع مدرس و ناظم بلایا تھا، کیونکہ آشی کے والدین کا یہ ماننا تھا کہ مدرسے کے بچوں کو جب غم کے موقعوں پر قرآن خوانی کے لئے یاد کیا جاتا ہے تو پھر خوشیوں میں کیوں نہ بلایا جائے، ابّا نے باورچی وغیرہ طئے کردئے تھے۔

آشی اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھی کہ امّی اس مبارک دن کی راہ نہ جانے کب سے تک رہی تھیں اور اب جبکہ زویا بجیا کے نصیبوں سے وہ دن دیکھنے کو ملا ہے تو امّی کسی کام میں ذرا بھی کوتاہی برداشت نہیں کرینگی۔۔۔کیونکہ بہت ممکن تھا کہ اس تقریب میں لکھنو سے اُنکے سمدھیوں کی بھی آمد ہو اس لئے امّی چاہتی تھیں کہ سب کچھ بہت اچھی طرح سے ہو۔۔۔بعض اوقات شادی کی تیاّریوں میں انکے جوش وخروش کو دیکھ آشی کو یوں لگتا مانو انہیں دوبارہ زندگی کی باریابی ہوئی ہو، اسکی بجیا کے کپڑے وزیورات وہ جس اشتیاق سے تیار کروا رہی تھیں کہ آشی کو یوں لگتا کہ اس وقت اگر منکر نکیر بھی آجائے اور حکمِ خداوندی سے امّی سے انکی زندگی طلب کرے تو وہ اُن سے بھی شادی مکمل ہونے کی مہلت مانگ لینگی۔۔۔ آشی نے کچھ سوچ کر خود سے کہا۔۔۔

’’کیا! امّی خود کے لئے بھی کبھی کچھ مانگتی ہونگی یا ہمیشہ ہم بچّے ہی انکی دُعاؤں کا مرکز ہوتے ہیں؟ کبھی تعلیم، تو کبھی صحت، کبھی شادی تو کبھی کامیابی کسی نہ کسی سلسلے میں ہم بچّے ہی انکی دعاؤں پر حق جمائے بیٹھے ہیں لیکن اتنا سب کچھ ان سے لینے پر بھی ہم اولادیں انہیں کچھ بھی تو نہیں دے پاتے۔۔۔کیا دنیا کا کارواں اسی طرح رواں رہیگا کہ مائیں تو ہمیں اپنا سب کچھ دے دیں لیکن جب ہمارا وقت آئے تو ہم انکے لئے کچھ بھی نہ کرسکیں‘‘، پھر آشی نے ایک گہری سانس لے کر اپنی آنکھیں موند لی اور دل ہی دل میں امّی کے لئے یہ دُعا کی کہ۔۔۔’’یا اللہ! میری امّی کو ہمیشہ سلامت اور صحت یاب رکھنا، مجھے انکی اطاعت گزار و فرمابردار اولاد بنانا، اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں اپنے والدین کے لئے کچھ بننے کی توفیق عطا فرمانا، اور میرے وجود کو ہمیشہ میرے والدین کے لئے خوشی کا باعث بنانا‘‘

آج صبح سے آشی کی جلدبازیوں کا سبب یہی سب کچھ تھا کیونکہ پچھلی رات اس تقریب کے لئے امّی نے کچھ ضروری چیزوں کی فہرست اسکے حوالے کر دی تھی جسکے لئے اسے یونیورسٹی سے ہو کر بازار جانا تھا اور فہرست میں درج تمام سامان لے کر گھر لوٹنا تھا۔۔۔

ابھی وہ اپنے خیالوں میں گُم تھی کہ رکشے والے کی مسلسل بجنے والی گھنٹیوں نے اسے جھنجھوڑ کر خیالوں کی دنیا سے حقیقت کے بازار میں لا کھڑا کیا، اس وقت شہزادی آشی کا رکشہ بازار کے درمیانی حصّے میں کوچ کر چکا تھا اور اسی جگہ سے انہیں سامان خریدنا تھا چنانچہ محترمہ نے رکشے والے کی اُجرت سے کچھ زیادہ رقم اسکے حوالے کی جسے قبول کرتے ہی رکشے والے کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ اس طرح بکھر گئی مانو ساحل کی طرف لہریں دوڑ لگا کر چلی آئی ہوں یا کسی پھول پر قطرۂ شبنم گرنے سے تروتازگی آگئی ہو، آشی آگے بڑھنے ہی والی تھی کہ تبھی رکشے والے نے اس سے کہا۔۔۔’’دیدی آپ کہیں تو اور آگے تک چھوڑ دیں‘‘ بطور شکریہ اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر آشی کو احساس ہوا کہ اس غیر تعلیم یافتہ انسان میں بھی تہذیب کا مادّہ کس قدر سرایت کئے ہوئے ہے، جسے باہر لانے کیلئے اگر کوئی چیز درکار ہے تو وہ ہے صرف تھوڑی سی توجہ، انکساری اور اخلاق، ورنہ اس نے کئی دفعہ یونیورسٹی میں بھی بڑے بڑے لوگوں کا دامن تہذیب سے مبّرا پایا تھا، اس نے رکشے والے سے کہا۔۔۔’’نہیں بھیّا آپ جائیں، ہم یہاں سے پیدل چلے جائینگے‘‘ اتنا کہہ کر وہ امّی کی تجویز کردہ دکانوں کی جانب راغب ہوئی، تقریباً تمام ضرورت کی چیزوں کی باریابی اسے دو سے تین دکانوں پر ہی ہوگئی تھی اسکے لئے اسے زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑا، اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایک دفعہ لسٹ سے سارا سامان ملالے کہ کہیں کچھ باقی تو نہیں رہ گیا، اس نے لسٹ نکال کر سامان چیک کرنا شروع کردیا، ورنہ امّی ناراض ہونگی اور کہہ دینگی کہ ’’تم کبھی کوئی کام ذمہ داری سے کروگی بھی یا نہیں‘‘ اس نے شرارت سے امّی کے جملے دوہرائے اور مسکرا کر سامان دیکھنے لگی۔۔۔ ’’چپس، نمکین، سموسے، بسکیٹ، جوس، کھجوریں، مٹھائیاں، سنڈوچیس، فروٹ کیک، پاپڑی وغیرہ‘‘۔۔۔ پھر خود سے بولی ’’چلو بھئی یہ سب تو ہوگیا‘‘۔۔۔آشی نے سکون کی سانس لی اور اپنے کاندھیں پر تھپکی دے کر خود کو شاباشی دی۔

دراصل یہ سارے کام اسکے لئے تھوڑے مشکل اس لئے بھی تھے کہ یہ سب ہمیشہ ابّا کرتے آئے تھے مگر اب جبکہ وقت کم اور کام زیادہ ہوئے تو کچھ کام آشی کے حصّے بھی آگئے، یہ سامان لے کر وہ آگے بڑھنے لگی تبھی اس نے دیکھا کہ صفحے کی دوسری جانب امّی نے کچھ پھل اور میوے بھی درج کئے تھے۔۔۔اس نے

کہا۔۔۔''اوہ ہو! ابھی یہ بھی لینا ہے۔۔۔'ان تمام چیزوں کا بوجھ لئے اب تک وہ کافی تھک گئی تھی۔

اس نے سڑک کی دوسری جانب مقیم پھل منڈی جانے کا ارادہ کیا تو کافی بھیڑ نظر آئی کیونکہ اسی وقت اسکے شہر کے زیادہ تر اسکولوں کی چھٹّی ہوتی تھی اسی وجہ سے ہر طرف اسکول بس، بچوں کی ٹرالی اور رکشوں کا ہجوم تھا، اس لئے اس نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور پیدل جانے لگی، جاتے وقت راستے میں آشی کی نظر چوڑیوں سے آراستہ ایک دُکان پر پڑی جہاں تقریباً سبھی رنگوں کی چوڑیاں موجود تھیں، جسے دیکھ کر اس تھکن میں بھی اسکی آنکھوں میں چمک آگئی، اور یہ تو انسانی فطرت ہے کہ اپنی پسند کی چیزیں دیکھتے ہی اسے ہمیشہ آسودگی کا حصول ہوتا ہے اس نے گھڑی کی جانب نگاہ ڈالی تو وقت اسے کسی طرح وہاں جانے کی اجازت نہ دیتا تھا مگر وہ اپنے دل کو کس طرح مطمئن کرتی، اگلے چند پلوں میں وہ دُکان کے سامنے موجود تھی اور بڑے قرینے سے سجی چوڑیوں کو نہار رہی تھی۔۔۔ تمام زیورات میں فقط چوڑیاں ہی تو اُسے سب سے زیادہ عزیز تھیں، یہ چوڑیاں ہی اسکی کمزوری تھیں جنکی لالچ دے کر زویا بجیا اکثر اس سے کئی کام لے لیا کرتی تھیں، اسکی نظر میں تو سونے کے زیورات کی بھی اتنی وقعت نہ تھی جتنی ان کانچ کی رنگ برنگی چوڑیوں کی تھی، کم از کم انہیں پہننے پر اسے بیجا احتیاط سے تو کام نہ لینا پڑتا تھا کہ کہیں گر نہ جائے یا کھو نہ جائے، اور سب سے خاص بات انہیں خریدنے لئے بہت زیادہ پیسے درکار نہ تھے، اس لئے کوئی بھی تقریب ہو اسکے کپڑے کتنے ہی سادہ کیوں نہ ہوں، لیکن بنا چوڑیوں کے وہ گھر سے چلی جائے ایسا کبھی نہ ہوتا تھا۔۔۔ نا جانے کن کن رنگوں کی چوڑیاں اس نے اپنے پاس جمع کر رکھی تھیں۔۔۔امّی اور زویا بجیا اسے کتنا کچھ لا کر دے دیتیں مگر جب تک چوڑیاں نہ ہوں وہ خوش نہ ہوتی۔ رنگ برنگی کانچ کی نازک چوڑیاں، جو کسی قسم کی زور زبردستی برداشت نہیں کر سکتی بلکل تتلیوں اور لڑکیوں کی مانند، انکے ساتھ تو پیار، محبت و الفت کا سلوک روا رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، ہاں انہی کانچ کی چوڑیوں کی طرح تو تھی آشی، جتنی جلدی روٹھتی اس سے کہی جلدی رضامند ہو جاتی، کتنا نادان، معصوم اور سادہ تھا اسکا دل دنیا کے فریبوں سے انجان۔

چوڑیوں کو دیکھ کر آشی کو بچپن کا ایک واقعہ یاد آجاتا ہے کہ رمضان کا مہینہ پورا ہوا چکا تھا چاندرات تھی اور اگلے روز عید، مگر آشی کی چوڑیاں اب تک نہ آئی تھی، امّی کو اور بھی مصروفیتیں تھیں اور وہ رات میں کیونکر بازار جاتیں جبکہ وہاں اس قدر بھیڑ ہو، یوں بھی امّی کو وہ عورتیں سخت ناپسند تھیں جو چاندرات کو اپنے گھر کے کام کاج چھوڑ بازاروں کی رونق بننے نکل پڑتی تھیں مانو رمضان تک قید رہی ہوں اور آج ہی انہیں رہائی کا پروانہ سونپا گیا۔۔۔اسی لئے امّی نے ابّا سے اسرار کیا، ابّا یہ ساری چیزیں کبھی نہ خریدتے تھے مگر بات انکی دلاری بیٹی کی تھی، اس لئے رضامند ہو گئے، صبح جب آشی نیند سے بیدار ہوئی تو اسکے پہلو میں بڑا خوبصورت نارنگی چوڑیوں کا سیٹ رکھا تھا جسے دیکھ کر اسکی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا وہ خوشی سے چڑیوں کی مانند پھدکنے لگی اور ابّا اسے دیکھ شاد ہونے لگے، نئے لباس سے آراستہ ہو کر جیسے ہی وہ گھر سے باہر گئی، اپنی ساری دوستوں کو کتنی خوشی سے اس نے اپنی چوڑیاں دکھائی تھیں، اور اٹھلا اٹھلا کر سب کو بتایا تھا کہ یہ اسکے پیارے ابّا لائے ہیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت بھی پیش آیا، جب وہ محض دس یا گیارہ برس کی تھی اور اسکی اکلوتی اور جان سے عزیز بینا خالہ کی شادی تھی، نانی امّی کے گھر سبھی عورتوں کو چوڑیاں پہنانے کے لئے منہارن بلائی گئی تو اس نے بھی نانی امّی سے ضد کی اور کُم کُما و کامدانی کا جوڑا الگوا کر خوب ساری چوڑیاں پہن لیں، تاکہ دوسروں سے ذرا بھی پیچھے نہ رہے منہارن نے اسے کتنا ہی سمجھایا کہ ''ارے بٹیا! بچے کم ہی پہنتے ہیں بس کرو'' مگر وہ یہ سب کہاں سننے والی تھی اس لئے سبھی عورتوں کی طرح کلائیاں بھروا کر ہی مانی تھی۔ اس رات وہ شادی ہال میں گھوم گھوم کر گھر کے باقی بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ تبھی ماریہ آپی سے ٹکرانے کے سبب وہ گر گئی اور اسکی بہت ساری چوڑیاں ٹوٹ گئی، جس پر وہ نانی، ابا اور امّی کو اپنی کلائی دکھا کر کتنا روئی تھی اور بینا خالہ کی رُخصتی سے قبل ہی اس نے رُخصتی کا سماں باندھ دیا تھا۔۔۔سب نے اسے بارہا سمجھایا کہ کل دوسری چوڑیاں دلا دینگے مگر اس سے صبر نہ کیا گیا اسے تو اپنی وہی چوڑیاں چاہئے تھیں جو کہ ٹوٹ گئی تھی، تب نہ جانے امّی نے اسے کیسے منایا تھا۔۔۔آشی ابھی اپنے ماضی میں ہی کھوئی تھی کہ تبھی دُکان دار نے پوچھا۔

''باجی کون سی چوڑیاں دکھاؤں۔۔۔'' اسکی آواز پر وہ چونک گئی۔۔۔اور دل میں کہا۔۔۔''ارے میں بھی کہاں گُم ہو گئی تھی۔۔۔'' پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دکان دار سے کہا۔۔۔''بھائی! ذرا یہ دھانی، پیلی اور گلابی والی چوڑیاں تو دکھانا، یا اللہ! سبھی تو اتنی پیاری ہیں کون سی لوں اور کن کو چھوڑوں۔۔۔''، پھر کچھ تامل کے بعد اس نے کہا۔۔۔''بھائی ایسا کریں یہ پیازی، دھانی، آسمانی، گلابی، پیلی، سُرخ، اور ہاں یہ ساون والی بھی ان سب کے دو درزن کے سیٹ بنا دے'' اسکا بس چلتا تو وہ ہر رنگ کی چوڑی سے ایک سیٹ ضرور لے لیتی، مگر جیب کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے۔

لیکن ایسا بالکل بھی نہیں تھا کہ یہ ساری کی ساری چوڑیاں شہزادی آشی نے صرف اپنے لئے خریدی تھیں بلکہ اس نے تو سبھی چوڑیاں مختلف ناپوں کی لی تھی تاکہ اپنی خالہ و چچازاد بہنوں اور اپنی دوستوں میں بانٹ سکے، کیونکہ بچپن ہی سے اپنی امّی کی زبانی سنتی آئی تھی کہ تحفہ دینا سنت رسولؐ ہے اور اسی لئے دوسروں کو تحفہ دینا اُسے بہت پسند تھا، اسکی ہر لحمہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ دوسروں میں خوشیاں تقسیم کر سکے اسکا ماننا تھا کہ آخر یہی تو زندگی کا حاصل ہے ورنہ باقی سب تو فانی ہے۔

دوکاندار سے چوڑیوں کا پیکٹ وصول کر کے اس نے جلدی سے قیمت ادا کی اور جوں ہی اس نے آگے کی منزل کا رُخ کیا تو اسے سامنے ایک چھ سات برس کی بچّی نظر آئی، بچّی کی حالتِ زار اسکی مفلسی کا بیان کرنے کو کافی تھی، آشی کچھ کہہ پاتی کہ اتنے میں سڑک کی دوسری جانب پولیس کے دو کارندوں کے

آنے سے شور ہونے لگا، جہاں پر ایک غریب شخص ہاتھ کی کاریگری سے بنی کچھ آرٹ پیسیس زمین میں سجائے بیچ رہا تھا، ہٹلر کی طرح نمودار ہوئے پولیس کوالوں نے پہلے تو اسکی سجائی چیزوں کو حقارت آمیز نظروں سے گھورا اور پھر پیر سے چھو کر اس سے یہاں سے فوراً سارا سامان ہٹانے کا اشارہ کیا بیچارا غریب اُن کی ظلم سے پُر نظروں کو لمحہ بھر بھی دیکھنے کی تاب کیا رکھتا اس لئے جلدی جلدی اپنا سامان ایک بوسیدہ چادر میں سمیٹنے لگا لیکن جب ان حیوانوں کی بھوک اس پر بھی نہ مٹی تو غیر قانونی طور پر سڑک کنارے یوں دُکان لگانے کے جرم میں اس سے جرمانہ وصول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔۔۔دونوں پولیس کارندوں کے چہروں پر وحشی مسکراہٹ شیطانی کھیل کھیل رہی تھی۔۔۔دونوں نے نظروں ہی نظروں میں طئے کر لیا تھا کہ اب تو اوپری کمائی کر کے ہی دم لینگے۔۔۔اس آدمی نے ان وحشی بھیڑیوں کے آگے گڑگڑا کر بڑی منت وسماجت کی کہ وہ اس سے پیسے نہ لیں کیونکہ اسکے پاس بہت ناکافی اُجرت ہے، وہ غریب، کمزور، لاچار و بے بس انسان بار بار انہیں بتا تا رہا کہ:

''صاحب آج سبیرے سے کھالی دوئی گاہک آئے ہیں، دوئی دن سے بچا لوگ روٹی نئے پائن، ہمرے پاس بس روٹین بھر کا پیسوا بھا۔۔۔ہمکا ماپھ کر دیو صاحب کل سے ای جگہ نہ لگاؤبے۔۔۔گلتی ہوئے گئی جائے دیو صاحب ہمکا جائے دیو بڑی کرپا ہوئی آپ لوگن کی مائی باپ۔۔۔''

مگر دونوں غریب کو زدو کوب کرنے لگے، اسکے پھٹے ہوئے کُرتے کو جیسے ہی پولیس نے پکڑنا چاہا تو اسکا کالر کُرتے سے بلکل اسی طرح سے غائب ہو چکا تھا جیسے چیل کے گھونسلے سے گوشت، اس لئے پولیس والے نے بٹن کے پاس سے اسکے کُرتے کو تھام کر کہا..

'' کا ہے ماپھ کر دیئی سالے! جمپیا تورے باپ کی ہے کہ کانون توری جوروں کے گھر سے آوا ہے۔۔۔ہمکا سکھاوت ہے۔۔۔چل سالے جرمانا نکال جلدی نئے تو تھانے لئے جائیکے کھوب بڑھیا کھدمت کروائی۔۔۔سالا ہم لوگن کا پڑھاوت ہے کہ پیئسا نئے ناہمکا تو مالوم نئے نہ کہ رات کا ایٹ کرے کھاتر چھپائے کے رکھے ہے''

اب کچھ لوگ رُک کر یہ تماشہ دیکھنے لگے مگر بچانے کے لئے کوئی آگے نہ آیا، کیونکہ غریب کی جان سوائے اسکے اور اسکے گھر والوں کے کسی کو عزیز نہیں ہوتی، ان اونچے طبقے والوں کے مطابق اوّل تو غریبوں کے پاس عزّت نامی کوئی شئے ہوتی ہی نہیں تو بھلا عزّت جانے کا سوال کہاں سے آئے، اسی بھیڑ میں کسی دوکاندار نے جملہ کسا:

''ارے ای سالن کے تو روج روج کے کام ہے ای سب، بھک منگون، چور، حرام جادے سالے کہاں کہاں سے آجاتے اوو با جار بگاڑ آپن ساتھ ہمئو لوگن کے کام دھندا بگاڑ کے رکھ دیتے ای نگوڑوے، بہت بڑھیا بھوا جو پولیس والن آئے گئے آج''۔۔۔تبھی ایک اور آواز آشی کے کان میں پڑی۔۔۔''راجو بھیّا پھلیم دیکھ لیو۔۔۔ایدم نئی لگی ہے۔۔۔ای ہی ہی ہی ہی''..

آشی نے سوچا جہاں لوگوں کی یہ سوچ ہو وہاں بھلا کوئی اس کی مدد کیا کریگا اسکا دل مسلسل اس غریب کی مدد کو آمادہ تھا مگر ان وحشی پولیس والوں کے سامنے جا کر اس غریب کی حمایت میں کچھ بولنے سے اسکی امّی کی نصیحتیں بار بار پیروں کی بیڑیاں بن کر اسے روک رہی تھیں..... پولیس والے اب بھی اس مظلوم وبیکس کے سامنے پیسے لینے کو تیار کھڑے تھے، اس کی منتوں کا ان پر بلکل اسی طرح کوئی بھی اثر نہ ہوا تھا جیسے بے موسم بادل کسان کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کو نظر انداز کر پانی اور اولوں کے ساتھ اسکے کھیت میں کسی غازی کی طرح حملہ آور ہو کر اسکی ساری محنتوں کو رائگاں و برباد کر دیتے ہیں، جب اس بیچارے کے پاس اور کوئی راسطہ نہ رہا۔۔۔تو مرتا کیا نہ کرتا۔۔۔چارو ناچار غریب نے اپنی آج کی ساری کمائی جو دھوتی کے اوپری حصّے میں گانٹھ لگا کر جمع کی تھی، اُن جلاّدوں کے ہاتھوں پر نم آنکھوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُنڈیل دی۔۔۔ کیونکہ یہ اسکے لئے اب محض چند پیسے نہیں تھے بلکہ بچوں کے خالی شکم میں پچھلے دو روز سے جل رہی آگ ٹھنڈا کرنے کا سامان تھا..اس مرتی اور تڑپتی ہوئی زندگی میں اپنوں کے چہروں پر لمحاتی مسکراہٹ بکھیرنے کا ایک سامان تھا، جو اسکے لئے اپنے نڈھال بچوں و بیوی کے سامنے محبت ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔۔۔اسکے ذہن پر سوار یہ تمام باتیں اشکوں کی صورت میں آنکھوں سے ڈھلنے لگی کیونکہ غریبوں کے تو خون بھی بے مول ہوتے ہیں بھلا انکے اشکوں کی کیا اوقات، لیکن دھرتی ماں تو اپنی ہر اولاد سے برابر کی محبت کرتی ہے اسکے لئے تو نہ کوئی امیر ہے نہ ہی غریب اس لئے وہ اپنے بچے کے ان قیمتی موتیوں کو دامن میں سمیٹ کر اپنے اندر جذب کرتی رہی۔۔۔پیسے لے کر دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔۔۔''چل سالا کہت رہا پیسوا نئے نا، کیسا نکلواوا۔۔۔چل اب دوئی می نٹ میں پُھٹ لئے اب دھر دو بارا دیکھی نہ تو کا سالے''۔۔۔اب تماش بیں بھی اپنی جگھوں پر واپس جانے لگے، وہ اپنی نظریں جھکائے آنسوؤں کو چھپاتا ہوا اپنا بچا ہوا سامان سمیٹنے لگا کہ کہیں دنوں پھر سے واپس نہ آجائیں۔

تبھی آشی کی نظر پھر سے اس بچّی پر پڑی جو اب بھی اسی جگہ کھڑی تھی اب آشی کو سمجھ آیا کہ یہ اسی کی بیٹی ہے جو شاید ان درندوں کے شور اور بھیڑ سے ڈر کر اِدھر چلی آئی تھی آشی اس چھ سات سالہ بچّی کو غور سے دیکھنے لگی جو کہ للچائی ہوئی نظروں سے کبھی چوڑی کی دُکان کی جانب تکتی تو کبھی اپنی کلائی میں سجے مختلف رنگ کے کنگنوں کو، جو کہ اب پُرانے ہونے کے باعث ہر طرح اپنی چمک کھو چکے تھے۔۔۔اور ساتھ میں لگی مٹھائی کی دوکان بھی برابر تکتی جا رہی تھی۔۔۔مگر جہاں روٹی بھی بڑی جدوجہد پر میّسر ہوتی ہو، اور یہ بھی پتہ نہ ہو کہ آج روٹی ملے گی بھی یا نہیں۔۔۔بھلا وہاں خواہشوں کا کیا گزر۔۔۔آشی کے لئے یہ منظر بڑا دل برداشتہ تھا یہ سب دیکھ کر اسے اس قدر تکلیف ہوئی کہ وہ یہ بھی بھول گئی کہ بازار میں کس لئے آئی تھی۔۔۔آشی کو یاد آیا کہ جب وہ بچپن میں ابّا سے کسی چیز کی فرمائش کرتی اور کبھی کبھار اس وقت پیسے کم ہونے کے باعث ابّا وہ چیز خریدنے سے قاصر ہوتے تو بعد میں جلد از جلد اسے وہ چیز لا کر دیتے، لیکن

یہ نادان بچّی اپنے باپ سے آرزو کرے بھی تو کس طرح جہاں مفلسی وغربی نے اسکے منہ پر قفل لگادئے ہو۔

اگلے چند لمحوں میں آشی نے اسکی جانب قدم بڑھائے، تھیلے سے اس کی کلائی کے ناپ والی گلابی چوڑیاں نکالیں جو اس نے خالہ کی سب سے چھوٹی بیٹی اُمّی کے لئے لی تھیں اور لمحے بھر میں اسکی ننھی معصوم کلائیوں کو پرانی چوڑی سے خالی کر کے نئی گلابی چوڑیوں سے پُر کر دیا، جسے دیکھ بچّی کا دل شاد ہو گیا۔۔۔باپ کی نظر بچّی پر پڑی تو اسے خوش دیکھ کر وہ لمحے بھر پہلے اپنے ساتھ ہوئے نارَوا سلوک کو جیسے بھول گیا ہو اور خود بھی مسکرانے لگا۔۔۔آشی کو اس وقت محسوس ہوا کہ جن لوگوں کی زندگی میں خوشیوں کی عمر شبنم کے قطروں جیسی ہوتی ہے ان کے لئے ایک چھوٹی سی خوشی بھی کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔۔۔پھر اس نے دوسرے تھیلے سے کچھ سموسے، مٹھائیاں اور پیسے نکال کر اس بچّی کو دئے اور اس سے اسکے والد کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔۔۔بچّی اپنے باپ کے پاس جاتے ہی خوشی سے چوڑیاں دکھانے میں مصروف ہو گئی۔۔۔اس کے باپ نے دور سے ہی ہاتھ جوڑ کر آشی کو ڈھیروں دعائیں دی، مانو آشی کے اس محبت آمیز سلوک نے اسکے تازہ زخموں پر مرحم لگا دیا ہو جسکے لئے وہ دور سے اسکا شکریہ ادا کر رہا ہو۔آشی کو لگا کہ شاید اس نے اپنی جانب سے اسکے درد کا چھوٹا سا مداوا پیش کر دیا ہے کیونکہ وہ اب تک اس بات سے شرمندہ تھی کہ وہ پولیس والوں کی بدتمیزیوں کے سبب اسکی کوئی مدد نہ کر سکی تھی۔

لیکن اب باپ بیٹی کی خوشی کا یہ منظر دیکھ کر اسکا دل مطمئن ہو گیا تھا ،وہ اس بچّی کو چوڑیاں پہنا کر اس قدر خوش تھی کہ اتنی خوشی اسے آج سے قبل خود چوڑیاں پہننے پر بھی نہ ملی تھی۔۔۔اس کے دل کو کتنا سکون محسوس ہوا تھا۔۔۔لیکن اس جذبہ کو وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی اسے لگا یہ وہ جذبہ ہے جس کا حصول بعض اوقات برسوں میں بھی نہیں ہوتا۔۔۔پھر بولی:

''سکون! نہیں نہیں! یہ صرف سکون نہیں ہو سکتا تو پھر کیا نام دوں اسے۔۔۔یہ۔۔۔یہ۔۔۔یہ تو۔۔۔ہاں۔۔۔یہ تو روحانی سکون ہے جو انسان کو اندرونی طور پر آسودگی بخشتا ہے، ارے یہ تو وہ سکون ہے جسکی تلاش میں لوگ ساری زندگی سرگرداں رہتے ہونگے نہ جانے کیا کچھ کرتے ہونگے کتنی عبادتیں کتنی ریاضتیں۔۔۔تب جا کے انکی باریابی یہاں تک ہوتی ہوگی۔۔۔''

اُسکے ذہن میں اس وقت بہت کچھ چل رہا تھا مگر پھر بھی وہ اس لمحہ کچھ کہنے سے قاصر تھی، ہاں! بس خاموشی سے محسوس کر سکتی تھی اُسے ایسا لگ رہا تھا نہ جانے وہ کتنی لمبی مسافت طئے کر کے آئی ہو اور کسی مقام پر پیڑ کی ٹھنڈی چھایا اور شربت کا ایک ٹھنڈا گلاس اسکے ہاتھ آ گیا ہو جس نے اس لمبی مسافت کی ساری تھکن و تشنگی رفع کر دی ہو۔۔۔تبھی اسے کچھ یاد آیا۔

''یا اللہ۔۔۔امّی۔۔۔اور انکا سامان۔۔۔سب لے کر گھر بھی جانا ہے''۔۔۔اس نے جلدی سے باقی کی چیزیں لیں اور رکشہ کیا، اگلے آدھے گھنٹے میں وہ اپنے گھر پر تھی۔۔۔جہاں امّی کی ڈانٹ پلکیں بچھائے اسکے استقبال کے لئے تیّار تھی۔۔۔''آ گئیں محترمہ! ارے آپ نے اتنی جلدی آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ کل تک آرام سے آتیں۔۔۔کام تو ہوتے ہی رہتے ہے پر سیر و تفریح زیادہ ضروری ہے۔۔۔وغیرہ وغیر'' امّی مستقل اپنی بات کہہ رہی تھیں لیکن آشی پر آج انکی کسی ڈانٹ کا اثر نہیں ہوا نہ اس نے کسی بات کا بُرا مانا اور نہ ہی کوئی صفائی پیش کی۔۔۔کیونکہ اس وقت وہ کس قدر پُرسکون تھی۔۔۔اسکا دل بار بار اسکے سامنے گواہیاں پیش کر رہا تھا کہ آج کی اس ڈانٹ کے بدلے اس نے بڑی قیمتی چیز خریدی ہے۔۔۔اور اسی لئے اس احساس کو وہ اتنی جلدی کھونا نہیں چاہتی تھی۔۔۔زویا بجیا نے اسے پانی کا ٹھنڈا گلاس پکڑایا ہی تھا کہ۔۔۔تبھی دروازے پر گھنٹی بجی۔

ٹنگ ٹانگ ٹنگ ٹانگ ٹنگ ٹنگ ٹانگ۔۔۔زویا نے آواز لگائی۔۔۔

''ارے کون ہے! ذرا ٹھہر بھی جاؤ۔۔۔آ رہی ہوں بھئی''۔۔۔لیکن پھر سے گھنٹی کی آواز ہوئی۔

ٹنگ ٹانگ ٹنگ ٹانگ ٹنگ ٹنگ ٹانگ۔۔۔جلدی جلدی میں بیچاری ہانپنے لگی۔۔۔پھر آواز آئی۔۔۔ٹنگ ٹانگ ٹنگ ٹانگ ٹنگ ٹنگ ٹانگ۔۔۔آشی کو لگا۔۔۔یہ صورِ اسرافیل سب کو اٹھا کر ہی دم لیگی۔۔۔زویا بولی ''ارے بس آ گئی''۔۔۔دروازہ کھولا۔۔۔تو دروازے پر بینا خالہ اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھیں اور انہی کی بیٹیاں یہ شرارت کر رہیں تھیں۔۔۔زویا نے خالہ سے سلام کر کے اُمّی کے کان زور سے کھینچے۔۔۔''آہ آہ آہ۔۔۔ارے زویا آپی چھوڑیے تو! اب نہ کرونگی وعدہ رہا''۔۔۔پل بھر میں آشی کا گھر خالہ جان خالہ جان کے شور سے گونج اٹھا اور خالہ کی بیٹیاں امّی سے جا کر لپٹ گئی، پھر کیا تھا امّی کا غصہ نہ جانے کہاں رفع ہو گیا۔۔۔تبھی آشی نے دھیرے سے کہا۔۔۔''زویا بجیا جان بچی تو لاکھوں پائے۔۔۔'' یہ سن کر دونوں بہنیں آپس میں قہقہے لگانے لگیں اور آشی نے اپنی پیاری بینا خالہ کے پاس جا کر انکے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال دیا جو ابھی تک اپنا نقاب بھی نہ اُتار پائی تھیں۔

سزا

''حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے''
غالبؔ کو کیا ملی تھی سزا ، کچھ خبر نہیں
ہم کو سزا ملی ہے کرونا کی شکل میں
تاریک رات ہے اور آثارِ سحر نہیں

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

" میزانِ عدل "

جہانگیر اشرف

(برطانیہ)

سرخمیدہ ہیں لب بستہ ہیں کوئی شکایت نہیں کرتے
کیسے لوگ ہیں غلامی کی ترک روایت نہیں کرتے

ظلم سہنا اور چپ رہنا بھی ظلم کی حمایت ہے یارو
اہل صدق و صفا کسی ظالم کی حمایت نہیں کرتے

طاقت کے ایوانوں کی طرف جھکتا ہے میزانِ عدل بھی
سنا تھا کہ منصف کسی سے کوئی رعایت نہیں کرتے

چاہے پاؤں میں زنجیر ڈلے چاہے گردن پہ تیغ چلے
ہم شبیر کے نام لیوا کسی غاصب کی بیعت نہیں کرتے

بے کس و مجبور لوگوں کی آواز بناؤ جہانگیر
اہل درد اپنے دکھوں کی حکایت نہیں کرتے

○

تصور اقبال

(اٹک)

تمنا ڈوبنے والے کی گر ہے اب کنارے کی
تو سچ پوچھو ہمیں ہر پل ضرورت ہے سہارے کی

کتابِ زیست کیسے ہو مکمل غم کے مارے کی
کمی رہ جائے گی آخر خوشی والے سپارے کی

ذرا سی بات پر ہم رات بھر الجھے رہے خود سے
زیادہ ہے دیے کی روشنی یا پھر ستارے کی

وہ آندھی اور بارش سے بھلا محفوظ کیسے ہو
عمارت جو بنی ہوتی ہے پتھر اور گارے کی

بدل دیتا ہے تقدیریں سُنا تھا ہم نے بچپن میں
ضرورت ہے ہمیں بھی اُس ولی کے اک اشارے کی

پڑا تھا اک دُکاں میں یونہی مدت سے یقیں کرلو
ہوا سے بڑھ گئی قیمت ولیکن اک غبارے کی

زباں جو چیر دیتی ہے گھڑی بھر میں ہمارے دل
ضرورت ہی نہیں کوئی تصوّر ایک آرے کی

ہم اُن کو چھوڑ بھی دیتے ہیں گھر والوں کے کہنے پر
مگر یہ بات لگتی ہے تصوّر جی خسارے کی

○

رئیس صدیقی

(دہلی)

اور کچھ تیز چلیں اب کے ہوائیں شاید
گھر بنانے کی ملیں ہمکو سزائیں شاید

بھر گئے زخم مسیحائی کے مرہم کے بغیر
ماں نے کی ہیں مرے جینے کی دعائیں شاید

میں نے اک خواب میں خود اپنا لہو دیکھا ہے
ٹل گئیں سر سے تری ساری بلائیں شاید

میں نے کل جنکو اندھیروں سے دلائی تھی نجات
اب وہی لوگ مرے دل کو جلائیں شاید

پھر وہی سر ہے ، وہی سنگِ ملامت اسکا
در گذر کردیں مری اس نے خطائیں شاید

اب وہ کہتا نہیں مجھ سے کہ برہنہ تو ہے
چھن گئیں اسکے بدن سے بھی قبائیں شاید

اس بھروسہ پہ کھلا ہے مرا دروازہ رئیسؔ
روٹھنے والے کبھی لوٹ کے آئیں شاید

○

جنیدآزر

(اسلام آباد)

دیئے کے حق میں جبھی تو گواہی میری ہے
کہ اس کے بجھنے میں ساری تباہی میری ہے

اگر میں آنکھ میں سورج کی ضَو نہ بھر پاؤں
تو پھر سمجھ لے کہ یہ کم نگاہی میری ہے

مجھے خموشی کا طعنہ ضرور دے، لیکن
سکوتِ شب میں تو پہلی صدا ہی میری ہے

مجھے بچا نہیں سکتا بیانیہ میرا
مقامِ عدل ہے اور سربراہی میری ہے

جو چاہے تو وہ سبھی کچھ روا ہے تیرے لیے
ہر ایک بات یہاں ناروا ہی میری ہے

بڑے جتن سے کمایا ہے میں نے نورِ سخن
پھروں جو بات سے تو رُوسیاہی میری ہے

شریکِ راز ہوں میں حرف کے تقدس کا
یہ سلطنت ہے مری، کجکلاہی میری ہے

○

شاداعظمی

(اعظم گڑھ)

پھیکی پھیکی ہے زندگی اپنی
غم ہیں اپنے، نہیں خوشی اپنی

دشمنی کا مزاج تھا ہی نہیں
اور رسمی تھی دوستی اپنی

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
یوں گزرتی ہے زندگی اپنی

بے ثمر اور بے اثر بھی تمام
جہل سے بڑھ کے آگہی اپنی

انجمن میں بھی ہم اکیلے ہیں
انتہا پر ہے بے کسی اپنی

اجنبی اس قدر تو پہلے نہ تھے
شہر یہ اپنا اور گلی اپنی

اس میں مَیں اور مجھ میں وہ گم ہے
شاؔد زندہ ہے عاشقی اپنی

○

ثاقب تبسم ثاقب

(علی پور چٹھہ)

فنا کا خوف اب ہر گام پر لکھا ہوا ہے
یہ خطرہ تو وبا کے نام پر لکھا ہوا ہے

اُفق میں ڈوبتا سورج گواہی دے رہا ہے
لہُو اِس شام کے انجام پر لکھا ہوا ہے

مجھے معلوم ہے احوال شامِ مضطرب کا
غمِ ہجرت مکاں کی شام پر لکھا ہوا ہے

مَیں بکتا ہوں کہیں چھپ کر کہیں بازار میں بھی
مرا ایمان تو بس دام پر لکھا ہوا ہے

یہاں پر ہیجڑے قانون کی ہے حکمرانی
کہ زن کو کاغذی انجام پر لکھا ہوا ہے

کہیں پر نام ہی سے کام چلتا ہے پیارے
کہیں پر رزق سارا کام پر لکھا ہوا ہے

کہانی کار کو مشہور جس نے کر دیا یوں
فسانہ وہ کسی گمنام پر لکھا ہوا ہے

○

نوید سروش
(میر پور خاص)

سبھی کے ساتھ راتوں کو سفر کرنا نہیں آتا
مجھے تیری طرح کوئی ہنر کرنا نہیں آتا
مجھے معلوم ہے انجام الفت کی کہانی کا
کوئی بھی مسئلہ صرفِ نظر کرنا نہیں آتا
کبھی ایسے درختوں کے دلوں سے پوچھ لو جا کر
جنہیں تخمِ تمنا کو ثمر کرنا نہیں آتا
بڑے بزدل وہ ہوتے ہیں جو چھپ کر وار کرتے ہیں
کسی صورت بھی ان کو باخبر کرنا نہیں آتا
مکانِ دل بڑی مدت سے ہے ویران سا میرا
مرے دل کو بسا کر تم کو گھر کرنا نہیں آتا
تمہاری کامیابی کس طرح ممکن بھلا ہوگی
تمہیں میری طرح خونِ جگر کرنا نہیں آتا

پریم ناتھ بسمل
(پٹنہ)

آج ساون کی پھر سے گھٹا چھا گئی
پہلی پہلی ملاقات یاد آ گئی
یوں ہی چھائی گھٹا، چاندنی رات تھی
میں ترے دل کو اور تو مجھے بھا گئی
یاد آنے لگیں تیری سرگوشیاں
حسرتیں بڑھ گئیں، دل کو تڑپا گئی
شبنمی رات میں آگ دل میں لگی
اور جوانی سے ٹکرا گئی
تیری پائل سنانے لگی راگنی
چاند کی روشنی تجھ کو نہلا گئی
یہ نہیں تھی خبر ہو گئی کب سحر
دیکھ پورب کی لالی وہ گھبرا گئی
شکریہ تیری الفت کا اے جانِ من
دل کو دردِ محبت سے تڑپا گئی
مسکرا کر ادا سے جھکا لی نظر
بات بسملؔ کی سن کے وہ شرما گئی

سبیلہ انعام صدیقی
(کراچی)

دل کے موسم نے کی میٹھی کچھ گفتگو
رُت بدلنے سے پھر بدلی کچھ گفتگو
شب ہوائیں سناتی رَہیں داستاں
کی ستاروں نے البیلی کچھ گفتگو
تم سے کس نے کہا ہم تمھارے نہیں؟
چھیڑ کر دیکھ لو خود ہی کچھ گفتگو
ماضی جیسا رہا اُس پہ کیا تبصرہ
آؤ کرتے ہیں آگے کی کچھ گفتگو
کچھ نہاں بھی، عیاں بھی تھا کہتے ہُوئے
اک پہیلی کے جیسی تھی کچھ گفتگو
رائے رکھتا ہے وہ کیا ہمارے لیے
اُس سے کرنا ہماری بھی کچھ گفتگو
اُلجھے دھاگوں کے جیسی سلجھتی نہ تھی
اُس نے کی ایسی اُلجھی سی کچھ گفتگو
شب مُصلّے پہ سر کو جھکائے ہُوئے
اپنے رب سے بھی کی اپنی کچھ گفتگو
ہم تو محوِ سماعت سبیلہؔ رہے
کرتی رہتی ہے تنہائی کچھ گفتگو

○

ڈاکٹر قطب سرشار (محبوب نگر)

محرومیوں میں رب کی ''عطا'' کا شعور ہے
سب سے قریب رہ کے بھی لگتا ہے دور ہے

بڑھنے لگی ہیں فخر کی ریشہ دوانیاں
یہ کیفیت نہایت ذہنی فتور ہے

دھن کی بہشت نقشِ مشجر ہے اصل میں
منظر تمام حرص و ہوس کا ظہور ہے

کیا ڈھونڈتے ہو عالمِ کون و فساد میں
ہر سمت اس فضا میں غبار شرور ہے

فاتح سپاہ مرتکب قتل ہے عبث
خود سے نبرد آزما ذوقِ جسور ہے

نا آشنائے ضبط نے برسائے ایسے تیر
سارا بدن شکیب کا زخموں سے چور ہے

کھولی بیاضِ شعر تو قاری کو یوں لگا
ہر لہجہ باوقار ہے ہر لفظ نور ہے

کچھ دیر کے لئے سہی کرلیں مشاربت
مانا ہمارے درمیاں نفرت ضرور ہے

نفرت سے ٹوٹ پڑتے ہیں تنہا پہ بیسیوں
اس کا قصور یہ ہے کہ وہ بے قصور ہے

ذکی طارق بارہ بنکوی (اتر پردیش)

فہم سے تیری ماورا ہوں میں
اے مرے یار فلسفہ ہوں میں

جیسے سورج کی ہو اجالے سے
تیری پہچان بن گیا ہوں میں

میں کہوں جیتا ہوں تری خاطر
وہ کہے جھوٹ بولتا ہوں میں

یوں بظاہر تو ہوں دوانہ مگر
رازِ عالم سے آشنا ہوں میں

اب نہیں اٹھتے مجھ سے ناز ترے
اے مری زیست تھک چکا ہوں میں

شکلِ اشعار میں خدا کی قسم
ذہن و دل کو نچوڑتا ہوں میں

شکریہ تیری رحمتوں کا رب
سارے عالم پہ چھا گیا ہوں میں

جانے کیوں پہلے سا تپاک نہ تھا
آج کل ان سے جب ملا ہوں میں

انجم جاوید (کراچی)

ورد رحمان آسرا ہے مجھے
اسم اعظم یہی ملا ہے مجھے

کتنی راتوں کا رت جگا ہے مجھے
اک غزل نے جگا رکھا ہے مجھے

ایک مضمون نامکمل نے
کس قدر تنگ کر دیا ہے مجھے

کوئی مامور ہے حفاظت پر
اک موکل نے یہ کہا ہے مجھے

اس محبت نے کار دنیا سے
لا تعلق سا کر دیا ہے مجھے

یہ اداسی بلا وجہ تو نہیں
لازما '' کچھ نہ کچھ ہوا ہے مجھے

مجھ پہ کچھ پڑھ کے پھونک اے جوگی
ایک ناگن نے ڈس لیا ہے مجھے

دیکھ جلدی نہ کر بچھڑنے کی
اک ترا ھی تو آسرا ہے مجھے

میری ماں ھے مرے لئے درویش
اسی درویش کی دعا ہے مجھے

تم ھی انجم کے دل کی دھڑکن ہو
میرے دل نے یہی کہا ہے مجھے

محبوب خان اصغر (کراچی)

کیا پتہ تھا کہ میری قوم بکھر جائے گی
کرب و آلام شب و روز سے مر جائے گی

جبکہ آلودہ بہت ہونے لگا ذوق طلب
شخصیت پھر تو یقیناً ہی بکھر جائے گی

روپ نیتا کا لئے سانپ نکل آتے ہیں
قوم کیا خاک کسی سانپ سے ڈر جائے گی

علم ناقص کی طلب چھوڑ کے چل حق کی طرف
صورتِ فکر بہرحال سنور جائے گی

کسی مطلوب کے قدموں میں پڑی ہوگی انا
لوٹ آئے گی سرِشام کدھر جائے گی

برہنہ لگتی ہے جو کذب کے پیراہن میں
سچ کی چادر میں تو ہستی بھی نکھر جائے گی

نخوتوں کا یہ یقیں ہے کہ خودی ہے بے بس
یہ گماں ہے کہ انا جبر سے ڈر جائے گی

اس نے ہر سمت سے رکھا ہے ہمیں گھیرے میں
کیا پتہ اب یہ بلا کون سے گھر جائے گی

طاق میں کب سے ہے رکھا ہوا قرآں اصغر
اس کو پڑھتے رہو تقدیر سنور جائے گی

ڈاکٹر سید قاسم جلال (بہاولپور)

دلائل کریں گے اثر ہولے ہولے
وہ قائل تو ہوں گے مگر ہولے ہولے

بنیں گے نئے بام و در ہولے ہولے
بسیں گے یہ ویراں کھنڈر ہولے ہولے

صعوباتِ منزل سے مت ہو پریشاں
کہ کٹ جائے گا یہ سفر ہولے ہولے

ستاروں کی مالا بکھرنے لگی ہے
جھکا جا رہا ہے قمر ہولے ہولے

تعاقب میں رہزن ہیں، راہیں کٹھن ہیں
نہ چل اے مرے راہبر ہولے ہولے

اندھیروں کی سانسیں اُکھڑنے لگی ہیں
چھکنے لگی ہے سحر ہولے ہولے

ڈھلے گا عمل میں ہر اک عزم کم کم
شرارا بنے گا شرر ہولے ہولے

عیاں راز آہستہ آہستہ ہونگے
اُٹھے گا نقابِ نظر ہولے ہولے

پریشاں نہ ہو طائرِ پر شکستہ
نکل آئیں گے بال و پر ہولے ہولے

ابھی تو ہے پہلی ملاقات ان سے
عیاں ہوں گے عیب و ہنر ہولے ہولے

توہّم کی آندھی نے نخلِ خرد کے
اُجاڑے ہیں برگ و ثمر ہولے ہولے

حکایاتِ دل کی جگہ لے رہے ہیں
مضامینِ علم و خبر ہولے ہولے

جلالؔ اس تضادِ طبیعت کے باعث
نہ برباد ہو جائے گھر ہولے ہولے

رشی خان (جرمنی)

عقل والے سوچ کر ہی ڈر گئے
ہم جنوں میں کام ایسے کر گئے

وصل کے بارے میں کیا آیا خیال
ہجر کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے

ہم اکیلے مے کدے کی شان ہیں
جو گھروں والے تھے اپنے گھر گئے

زندگی تو اک مسلسل جنگ ہے
جنگ میں جب ہار مانی مر گئے

کار زارِ عشق میں اکثر رشیؔ
پگڑیاں گر بچ گئیں تو سَر گئے

○

لکھا تھا:

مناسہ کی غلام بھاگاں اپنے آقا سلطان فتح علی المعروف ٹیپو سلطان کے اس پوتے اور برکت علی کے بیٹے، رحمت علی کو اپنی املاک کے ساتھ سندر بن کی دیوی بنوں بی بی کی پناہ میں دیتی ہے۔

تینوں عورتیں میری کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ میری حالت غیر تھی، میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور جسم پسینے پسینے تھا جب میں نے انہیں کہا، اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس کاغذ کے پرزے پر لکھی ہوئی تحریر کا ترجمہ سناؤں، میں آپ کو ہندوستان کی ایک تاریخی حقیقت کے چھوٹے سے ایک باب سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے کچھ دیر تک اپنے جذبات کو سمیٹا اور اپنی سانسوں کو متوازن کیا۔ جب تینوں وفورِ شوق سے میری جانب متوجہ ہوئیں تو میں نے کہا، میں بھی آپ کو اسی سرکش سلطان کے بارے بتاتا ہوں جس کو کچلنے کے لیے انگریزوں نے آپ کے جدِّ اعلیٰ جنرل آرتھر ولزلی کو ہندوستان بلوایا تھا۔ سرکش ٹیپو سلطان اپنی کمزوریوں سے اور گوروں کے ہتھکنڈوں سے واقفیت کی وجہ سے سرنگا پٹم کی چوتھی لڑائی سے پہلے ہی جنگ کی کروٹ کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جنگ کے نتیجے میں اس کے خاندان کا کوئی فرد نہیں بچے گا۔ اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ اس کے محل میں اور اس کے آس پاس انگریزوں کے جاسوسوں کا جال بچھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنے محل میں بھی بہت ہی محتاط ہو کر بات کرتا تھا اور بہت کم لوگوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ بھاگاں نامی ایک دائی محل کے ان معدودِ چند قابلِ بھروسہ لوگوں میں تھی۔ ٹیپو سلطان اسے ماں کی طرح سمجھتا تھا اور اسے بڑی امّاں کہتا تھا۔ ٹیپو سلطان اور اس کے خاندان کے نوے افراد کی پیدائش کے وقت بھاگاں موجود تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ شاہی دائی تھی جس نے اس خاندان کے تمام افراد کو پیدا کیا تھا۔

۱۵۔جنوری ۱۷۹۹ء کو سلطان کے خاندان کا آخری بچہ اور سلطان کا پوتا پیدا ہوا تو سلطان نے اس کا نام رحمت علی رکھا۔ پیدائش کے وقت اس معصوم بچے کا باپ انگریزوں کی قید میں تھا۔ بچے کی ماں کا نام مناسہ تھا۔ سلطان کی یہ بہو اس کے عزیز ترین دوست اور انگریزوں کے مخالف راجہ ایشو رائے کی بیٹی تھی۔ سلطان نے زچہ بچہ کو بھاگاں کے ساتھ ۱۸۔جنوری کو یعنی بچے کی پیدائش کے تیسرے دن بیل گاڑیوں پر محل کے نوادرات کے ساتھ کسی انجانی منزل کی طرف بھجوایا تھا۔ سلطان کی شہادت ۴۔مئی ۱۷۹۹ء کے روز ہوئی تھی۔ سرنگا پٹم کی فتح کے بعد انگریزوں کو مخبروں سے اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے اس خاندان کے آخری چراغ کو گُل کرنے اور تین بیل گاڑیوں پر لدا ہوا شاہی خزانہ حاصل کرنے کے لیے چہار اطراف اپنے جاسوس دوڑائے۔ ملک کے طول وعرض میں کئی عام منادیوں میں وگوں کو انعام کے لالچ دئے گئے کہ ان تین مفروروں کی مخبری کرنے والوں کو دو لاکھ روپے نقد اور جاگیر انعام میں دی جائے گی۔ لیکن ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ۱۱۔جولائی کو یعنی سرنگا پٹم کی آخری لڑائی کے دو ماہ بعد تین مفروروں میں سے ایک عورت کی لاش دریائے جمنا میں تیرتی ہوئی ملی۔ لاش کو سلطان کی بہو مناسہ کے طور پر شناخت کر لیا گیا لیکن بچے اور بھاگاں کے ساتھ اس خزانے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ جس سے قیاس لگایا گیا کہ دونوں مفرور اور بچہ اپنے املاک کے ساتھ دریائے جمنا پار کرتے ہوئے کہیں غرق ہو گئے ہوں گے۔ اس کے بعد سے اب تک کئی لوگوں نے اس خزانے کی تلاش میں دریائے جمنا کے ایک ایک انچ کو کھنگال کر اپنی زندگیاں گنوا دیں۔ لیکن یہ خزانہ ہنوز کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔

تینوں عورتیں اشتیاق کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھیں جب میں نے روزی سے کہا، اس لکھے ہوئے کاغذ کے مطابق آپ کا دادا اسی سرکش سلطان کا وہی نومولود پوتا تھا جس کو آپ کے پردادا کی حکومت ہندوستان بھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اوپر والے حصے نے جیسے موسیٰ کی پرورش کی ذمہ داری فرعون کے سپرد کر دی تھی اسی طرح بنوں بی بی نے تمہارے دادا کو پالنے کے لیے تمہارے پردادا کا انتخاب کیا تھا۔ یہ رقعہ بھاگاں یعنی تیسرے مفرور کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ اس نے انگریزوں کے خوف سے بے بسی کے عالم میں لکھا ہے کہ وہ اس بچے کو اس کی املاک کے ساتھ سندر بن کی دیوی بنوں بی بی کی پناہ میں دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم تینوں ٹیپو سلطان کی نسل سے ہیں؟ روزی اور کیری نے بیک وقت پوچھا۔ جب کہ ڈالیا آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے گنگ تھی۔ انہیں جواب دینے کی بجائے میں نے ڈالیا کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا، تم کہاں کھو گئی ہو؟ اسے جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے کپکپاتے ہوئے لبوں کو اپنے دانتوں تلے دبا کر پوچھا، کیا تمہارے پاس ٹیپو سلطان کی کوئی تصویر ہے؟ اب تو نہیں ہے لیکن کل کہیں سے مل سکتی ہے۔ لیکن کیوں؟ میں نے جواب دے کر پوچھا تو ڈالیا بولی، جس رات میں نے برصہ سے پہلی ملاقات کی تھی اور صبح میں نے تمہیں بتایا تھا کہ رات تم نے مجھے ایک سہانہ خواب دیا ہے۔ اس رات میں نے ایک پختہ عمر کا لمبی تیلی خوبصورت مونچھوں والا ایک آدمی خواب میں دیکھا تھا جس نے سر پر ایک کلاہ جیسا تاج پہنا تھا۔ برصہ اس کے قدموں کے پاس بیٹھی تھی اور میری ممی، نانی اور میں اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔ اس آدمی نے مجھے اپنے پاس بُلا کر بٹھاتے ہوئے کہا تم مجھے اس لیے بھاتی ہو کہ تم شکل وصورت سے بالکل اپنی نانی جیسی ہو۔ پھر اس نے میرے ہاتھ پر کچھ رکھتے ہوئے کہا تھا، لو تمہاری نانی نے یہ تمہارے لیے بھجوایا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ آنکھ کھلی تو میری مٹھی ایسے بند تھی جیسے انسان کچھ لینے کے بعد مٹھی بند کرتا ہے۔

پھر وہ لاکٹ کی جانب اشارہ کر کے بولی، نانی سے لاکٹ ملنے پر مجھے یاد آیا کہ شاید اس نے اسی لاکٹ کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میں نے جواب دیا،

تم نے ٹیپوسلطان کا حلیہ بالکل ٹھیک بتایا ہے لیکن تمہارا دوسرا قیاس غلط ہے کہ اس نے خواب میں تمہیں یہ لاکٹ دیا تھا۔ خواب میں اس نے تمہاری نانی روزی کی جانب بھی اشارہ نہیں کیا تھا۔ اس کا اشارہ تمہاری جھرنانی مناسہ کی جانب تھا۔ میری معلومات کے مطابق ٹیپو سلطان نے اپنے دوست راجہ ایشورائے کو انگریزوں کے خلاف مدد کے لیے شاہِ فرانس کے پاس بھجوایا تھا۔ واپسی پر وہ ایک فرانسیسی عورت کو بیاہ کر اپنے ساتھ لایا تھا۔ مناسہ اسی کی بیٹی تھی۔ وہ بھی شکل و صورت سے ہندوستانی نہیں لگتی تھی۔ اسی وجہ سے ٹیپوسلطان کا پوتا یعنی تمہارا جھرنانا بھی شکل وصورت سے ہندوستانی نہیں لگتا ہوگا۔ اگر ہم ذرا سی کھوج لگائیں تو ہمیں تمہاری جھرنانی مناسہ کی تصویر میسور کے عجائب گھر میں یا کہیں نہ کہیں سے ضرور مل جائے گی۔ مجھے گمان ہے کہ تمہاری صورت اسی مناسہ سے ملتی ہے، میں نے اسے کہا۔ تفصیل بتانے کے دوران روزی اور کیری حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ روزی بولی، نوجوان تمہیں ہندوستان کی تاریخ پر خاصہ عبور ہے۔ یہ معلومات تم نے کہاں سے لی ہیں۔ کتابوں سے۔ میں نے جواب دیا۔

ایسے میں مجھے ایک خیال آیا تو میں نے ڈالیا سے پوچھا تم نے برصہ کو خواب والے مرد کے قدموں کے پاس بیٹھے دیکھا تھا نا؟ ہاں، اس نے جواب دے کر پوچھا، کیوں؟ میرا خیال کہ میں برصہ کو جانتا ہوں، میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کیسے؟ کیا مطلب؟ تینوں عورتوں نے پوچھا تو میں نے کہا، تاریخی معلومات کے مطابق بھاگاں کی گردن اور ہاتھوں پر برص کے داغ تھے اور برصہ کا نام میں نے اس ناگن کے پھن پر سفید داغ دیکھ کر رکھا تھا۔ ناگن برصہ دراصل تمہاری خاندانی دائی بھاگاں ہے جو پچھلے کئی جنموں سے سانپ کے روپ میں خزانے کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری منتظر ہے۔ ڈالیا نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا، تمہارا مطلب ہے کہ مرنے کے بعد انسان واقعی کوئی دوسرا جنم لیتے ہیں اور وہ دوسرے جنم میں کسی اور جاندار کے روپ میں پیدا ہوتے ہیں؟ میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا، چلو اٹھو اور نیچے چل کر برصہ یعنی بھاگاں کو یہ لاکٹ دکھاتے ہیں۔ اس کا ردِعمل دیکھنے کے بعد اگر میرے قیاس کی تصدیق ہوئی تو ہم واپس آ کر تمہاری ماں اور نانی کو لے جائیں گے۔ بھاگاں ان سے مل کر بھی ویسے ہی خوش ہوگی جیسے تم سے مل کر۔ ڈالیا بھی جوش میں کھڑی ہوگئی۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ لے کر میں نے دوسرے ہاتھ سے ڈالیا کا ہاتھ پکڑا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا لاکٹ اور بھاگاں کا لکھا ہوا رقعہ تھا۔ ہم ابھی خیمے سے نہیں نکلے تھے کہ کہیں قریب سے اچانک نمودار ہوکر بھاگاں نے ڈالیا سے لپٹ کر اس کے لاکٹ والا ہاتھ چومنا شروع کر دیا۔ ڈالیا نے بھی اس سے لپٹ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ڈالیا کو روتا دیکھ کر روزی اور کیری بھی رونے لگیں۔ بھاگاں ایک سے لپٹ کر دوسرے سے اور دوسرے سے لپٹ کے تیسرے سے اور تیسرے سے لپٹ کر پہلے سے لپٹتی۔ وہ کبھی ان کے چہروں پر اپنی زبان پھیرتی اور کبھی اپنا سر ان کی گود میں رکھتی۔

میں نمناک آنکھوں سے ان بچھڑے ہوؤں کا ملاپ دیکھتا رہا۔ ایسے میں کالی بھی کہیں سے نکل کر میرے پاس آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی برصہ آ کر میرے قدموں کو چاٹنے لگی جیسے میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ میں نے اسے اٹھا کر گلے لگاتے ہوئے اردو میں کہا، دیکھ بھاگاں! تُو تو جانتی ہے کہ میں نے اپنی جانب سے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب دیوئیوں نے مجھ سے کروایا ہے۔ تو میری بجائے بنوں بی بی اور مناسہ کا شکریہ ادا کر۔ تم اسے اپنی زبان میں کیا کہہ رہے ہو؟ ڈالیا نے آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا، یہ میرے قدموں کو چوم کر تمہارے ملاپ پر میرا شکریہ ادا کر رہی تھی تو میں نے اسے کہا ہے کہ میری بجائے دیوئیوں کا شکریہ ادا کرو۔ ڈالیا نے جواب دینے کے بجائے میرے گلے لگ کر مجھے چومنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے چومتی جاتی اور کچھ کہے بنا روتی جاتی۔ میں نے بھی اپنی دونوں بانہوں میں بھر کر اسے جی بھر کر رونے دیا۔ اس کی حالت ذرا سنبھلی تو اس نے اپنا سر میرے کندھوں پر رکھ کر زور زور سے ہانپنا شروع کر دیا۔ میں اسے بانہوں میں بھر کر چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ روزی اور کیری بھی سرخ آنکھوں سے میرے قریب آ ئیں۔ روزی نے اپنا ہاتھ میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا، شکریہ نوجوان تم بڑے باکمال انسان ہو۔ کیری نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا، میں ہندوستان اپنے خاوند کے پاس نہیں آئی بلکہ پہلی بار اپنے میکے آئی ہوں۔ جس کے لیے میں تمہاری شکرگزار ہوں۔ میں نے تینوں کو اپنے ساتھ چمٹا کر کہا، یہ سب کچھ تو دیویوں نے کیا ہے۔ میں تو بس درمیان کا آدمی ہوں۔ درمیان درمیان کچھ نہیں۔ تم نے ہمیں یہ سب دیا ہے۔ تم نے۔ سمجھے۔ تم نے مجھے یہ سب دیا ہے، ڈالیا نے ایک بار پھر روتے ہوئے میرا گال چوم کر جذباتی لہجے میں کہا۔ اچھا بابا اچھا، تم جیسا بھی سمجھو، میں نے مسکرا کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو میرے جواب پر ڈالیا کے ساتھ اس کی ماں اور نانی مسکرانے لگیں۔

جذبات کی شدت میں کمی ہوئی تو ڈالیا نے کہا، میں اپنے اجداد کا علاقہ اور گھر دیکھنا چاہتی ہوں اور تم ہی مجھے وہاں لے چلو گے۔ میں نے جواب دیا، اگر ہمیں کل ہیلی کا پٹر مل جائے تو ہم میسور جاسکتے ہیں۔ جہاں ٹیپوسلطان کا محل آج کل عجائب گھر بنادیا گیا ہے جس میں تمہارے خاندان کے افراد کی تمام تصاویر اور باقی نوادرات رکھے ہوئے ہیں۔ کیا تم ہیلی کا پٹر اڑانا بھی جانتے ہو؟ ڈالیا نے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔ نہیں۔ اس لیے ہمیں کسی کو ساتھ لے جانا پڑے گا۔ سٹیو کا پٹر اڑانا جانتا ہے۔ اگر تم کہو تو اسے یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں سٹیو کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرلوں، کیری بولی۔ ٹھیک ہے، میں نے کہا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی، اچھے تو میں اپنے خیمے میں چلتی ہوں۔ اگر وہ جاگ رہا ہوگا تو اسے سب کچھ بتا دوں گی۔ میں اٹھتے ہوئے بولا، اچھا تو پھر آپ لوگ بھی سو جائیں، باقی باتیں صبح ہوں گی۔ وہاں سے نکل کر میں اپنے کمرے میں آیا اور کپڑے بدل کر بستر پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ ڈالیا کے جس مسئلے کو میں اب تک مشکل سمجھ رہا تھا وہ اچانک آسان ہو گیا تھا۔ اب یہاں میرا کام ختم ہو چکا تھا

اور میں بنوں بی بی کے ڈیرے پر واپس جانا چاہتا تھا۔ اپنی سوچوں کو کسی طرح سمیٹ کر میں بھی سو گیا۔

صبح ڈالیا نے مجھے جگا کر نوید سنائی، چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ سٹیو ہمیں آج ناشتے کے بعد کاپٹر پر میسور لے جانے کے لیے راضی ہو گیا ہے۔ تیاری کرنے کے بعد ہم پانچوں کاپٹر میں بیٹھے۔ بھاگاں اور کالی میرے ساتھ ایک بیگ میں تھیں۔ کیری نے شاید رات کو ہی سٹیو کو ساری تفصیل بتا دیا تھی اس لیے وہ مجھ سے سارے راستے اسی بارے میں سوالات کرتا رہا اور میں جواب دیتا رہا۔ ڈالیا نے سلطان کی تصویر دیکھ کر پہچان کر ہمیں بتایا کہا سی آدمی کو اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ تینوں عورتیں اپنے آبائی شہر اور محل کی شان و شوکت دیکھ کر بڑی متاثر تھیں لیکن ہمیں سلطان کی بہو مناسہ کی تصویر کہیں نظر نہیں آئی۔ یہ سب کچھ بعد از دو پہر تک ہو گیا۔

واپسی پر میں نے سٹیو سے کہا، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم فتح پور سیکری کی بجائے رات ہونے سے پہلے سندر بن جائیں؟ وہ کیوں؟ سٹیو کی بجائے ڈالیا نے پوچھا۔ میرے خیال میں ہمیں تمہارے لیے خزانہ وہیں کہیں سے ملے گا۔ کون سا خزانہ، سٹیو نے پوچھا تو میں نے کہا، تین بیل گاڑیوں پر لدا ہوا خزانہ۔ تمہارے خیال کے مطابق وہ خزانہ کہیں واقعی موجود ہے؟ روزی نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، بالکل ہے۔ اگر نہ ہوتا تو بچاری بھاگاں تمہاری منتظر نہ ہوتی۔ کیری بولی، جس خزانے کو پچھلے ایک سو پچاس سال سے ماہر کھوجی نہ ڈھونڈ سکے تو وہ ہمیں کیسے ملے گا۔ سٹیو نے گرہ لگائی، اگر کوئی خزانہ واقعی موجود ہے تو ہم اسے سندر بن کے لاکھوں ایکڑ کے علاقے میں کہاں کہاں کھوجتے پھریں گے۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا، ہمیں کسی کھوج کی ضرورت نہیں ہو گی کیونکہ ہمارے پاس خزانے کی چابی ہے۔ کون سی چابی؟ روزی نے حیرت سے پوچھا۔ کیا مطلب؟ ڈالیا اور سٹیو نے یک زبان ہو کر پوچھا تو میں نے بیگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا، ہمارے پاس بھاگاں ہے۔ یہ پچھلے ڈیڑھ سو سال سے تمہارے خزانے کی نگرانی کرتی رہی ہے اور یہی ہمیں وہاں لے جائے گی۔

لیکن اتنے وسیع علاقے میں ہم اسے کہاں کہاں لئے پھریں گے، سٹیو بولا تو میں نے جواب دیا، ہم اسے کہیں نہیں لیے پھریں گے۔ یہ ہمیں ناک کی سیدھ میں خزانے تک لے جائے گی۔ وہ کیسے؟ کیری نے پوچھا تو میں نے کہا، میں اس کو بیگ سے نکالتا ہوں۔ آپ کاپٹر کا رُخ اس کے سر کی جانب کر دیں۔ جہاں یہ کنڈلی مار کر اپنا سر جسم میں سمیٹ لے، آپ وہیں کاپٹر اتار دیں۔ کیا یہ کام واقعی اتنا ہی آسان ہے جتنا تم بتا رہے ہو؟ سٹیو نے پوچھا تو میں نے کہا، تجربہ کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ ہاں یہ بت تو ہے، سٹیو نے جواب دیا تو میں نے سٹیو سے کہا، میں بھاگاں کو اب بیگ سے نکالنے لگا ہوں آپ کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہنے لگا، ڈرنے کی بات تو چھوڑو، میں تو کل رات سے اسے دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ بیگ کھول کر بھاگاں اور کالی کو نکالا اور کاپٹر کے فرش پر چھوڑ دیا۔ دونوں نے اپنا رخ سندر بن کی جانب کر دیا۔ چاروں امریکی حیرت سے دونوں سانپوں کو دیکھتے رہے اور سٹیو کاپٹر کو بھاگاں کے سر کی جانب اڑاتا رہا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد دونوں ناگنوں نے کنڈلی ماری تو میں نے سٹیو کو کاپٹر اتارنے کو کہا۔ اس نے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کاپٹر اتارا۔ دونوں ناگنوں کو اٹھائے میں نیچے اترا اور انہیں زمین پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے ایک جانب دوڑ لگائی میں ان کے تعاقب میں گیا اور باقی لوگ میرے پیچھے۔ کچھ آگے جا کر وہ برگد کے ایک پرانے سوکھے درخت کے تنے میں گھسے جہاں ہم میں سے کسی کا گھسنا تقریباً ناممکن تھا۔ ڈالیا چھوٹی جسامت کی تھی اس لیے میں نے اسے کہا، ہم آگے نہیں جا سکتے اس لیے آگے تم ان کا پیچھا کرو۔ تم خود کو تنہا محسوس نہ کرنا اور خود کو کم بھی خیال نہ کرنا۔ اگر تم آگے نہ جانا چاہو تو ان سانپوں سے کہہ دینا یہ تمہیں واپس لائیں گے۔ اس نے کہا، جب سے مجھے بھاگاں کی حقیقت معلوم ہوئی ہے مجھے اس کی موجودگی سے خوف کی بجائے سکون محسوس ہوتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے وہ تنے میں دونوں ناگنوں کے پیچھے گھسی تو سٹیو نے مجھ سے پوچھا، تمہارے خیال میں یہاں کتنا خزانہ ہو گا؟ میں نے جواب دیا، تین بیل گاڑیوں جتنا اور اگر بیل گاڑیوں کے مال کو آج کے ترازو سے تولا جائے تو میرے خیال کے مطابق ایک ٹرک بھر لوڈ ہو گا۔ وہ بولا اگر اتنا خزانہ ہے تو میں اسے ہندوستانی حکومت کی اجازت لینے سے پہلے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میں اس ملک میں قانونی طور پر کھدائی کرنے آیا ہوں غیر قانونی طور پر کچھ نہیں کروں گا۔ میں نے جواب دیا یہ مسئلہ آپ کا ہے میرا نہیں ہے۔ وہ کیوں؟ کیری نے پوچھا۔ اس لیے کہ میرا کام یہاں پر ختم ہو گیا ہے۔ میں جہاں سے آیا تھا وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ روزی نے میرے جواب پر حیران ہو کر پوچھا، کیا تم اس خزانے سے اپنا حصہ نہیں لو گے؟ میں نے جواب دیا، کاہے کا حصہ؟ اس خزانے میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ خزانہ آپ کی امانت کے طور پر پچھلے ایک سو پچاس سال سے حقدار کا منتظر تھا۔ مجھے دیوتاؤں نے اسے حقدار تک پہنچانے کا وسیلہ بنا کر بھیجا ہے حصہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم اپنی خوشی سے اس خزانے میں سے تمہیں کوئی حصہ دینا چاہیں تو؟ کیری نے پوچھا تو میں نے جواب دیا تو میں لینے سے انکار کر دوں گا۔ میں دیوئیوں کی کرپا سے یہ کام کر رہا ہوں کسی حصے کے لالچ میں نہیں۔ روزی بولی، اگر تم ہم سے کچھ نہیں لو گے تو ہمیں دکھ ہو گا۔ میں نے جواب دیا اگر آپ مجھے زبردستی کچھ دینے کی کوشش کریں گے تو مجھے دکھ ہو گا اور مجھے یوں لگے گا جیسے آپ میری انمول محبت کو چند سکوں کے ترازو میں تول کر اس کی قدر و قیمت گھٹا رہے ہیں۔ کیری نے کہا، ہم تمہارے مستقبل کی سوچ رہے ہیں۔ کل کلاں تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ بھگوان کی کرپا سے مجھے آج تک نہ کبھی کسی شے کی کوئی کمی ہوئی تھی اور نہ آئندہ ہو گی۔ سندر بن میں بنوں بی بی کا ڈیرہ میرا گھر ہے جہاں میرے گزر بسر کے لیے سب کچھ موجود ہے۔ اس لیے اگر آپ لوگ واپسی پر مجھے وہاں اتارتے جائیں تو آپ کی کرپا ہو گی، میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ایسے میں بھاگاں، کالی اور ان کے پیچھے ڈالیا تنے کی کھو سے نمودار

ہوئے۔ ڈالیا کے ہاتھوں میں ایک پرانا ڈبا تھا اور وہ ہمیں جذباتی انداز سے بتانے لگی۔ اس جگہ سونے چاندی کے برتنوں میں ہیرے جواہرات رکھے ہیں۔ اتنا سامان ہے کہ ہمیں ہیلی کاپٹر کے کئی پھیرے لگانے پڑیں گے۔ یہ دیکھو، اس میں کیا ہے؟ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک زنگ آلود ڈبہ سب کے سامنے کھولا تو اس میں ایک بڑا سا زمرد کا پتھر رکھا تھا۔ سب نے باری باری اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ سٹیونے کہا، میں نے یہ جگہ ریڈار کی مدد سے نوٹ کر لی ہے۔ سورج ڈھل رہا ہے۔ اندھیرا چھانے سے پہلے ہم واپس فتح پور سیکری چلتے ہیں۔ کل میں سریت اور جان سے مشورہ کر کے حکومتِ ہند سے قانونی بات چلانے کے بعد کام کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا، تو ٹھیک ہے۔ آپ واپسی پر مجھے بنوں بی بی کے ڈیرے پر اتارتے جائیں۔ وہ کیوں؟ ڈالیا نے غیر یقینی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں نے جواب دیا، اس لیے کہ جس مقصد کے لیے دیوی نے مجھے تمہارے ہاں بھجوایا تھا وہ آج پورا ہو گیا ہے۔ اب یہاں میری کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ میرے جواب پر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے سب کی جانب حیرت سے دیکھا۔ چند لمحوں بیشتر خزانہ پانے کی خوشی سے اُس کا کھلا ہوا چہرا میری بات سن کر مرجھا گیا اور اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا، اچھا تم آج رات ہمارے ساتھ چلو۔ میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ پھر جو فیصلہ تمہارا من چاہے کرنا۔ ٹھیک ہے، میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ چلو تو پھر کاپٹر میں بیٹھیں، سٹیونے کہا اور ہم سب اندر بیٹھے۔ اس بار ڈالیا میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اور اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ بار بار میرے کندھوں سے اپنا سر رگڑ کر مجھے اداس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کا ماحول سوگوار ہو گیا تھا اس لیے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جب ہم فتح پور سیکری کے کھنڈروں میں اترے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا اپنے خیمے میں گیا۔ کپڑے بدلے، دانت صاف کیے اور ڈالیا کے انتظار میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ ڈالیا نے مجھے کیا کہنا ہے۔ میں اس کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ بعد ایک پتلے سے سفید نائٹ گاؤن میں ملبوس چہرے پر ہلکا سا میک اَپ کیے میرے خیمے میں داخل ہوئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گاؤن کے پردے تلے اس کے جسم کا ایک ایک انگ صاف جھلک رہا تھا۔ مجھ سے چمٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے شان جی۔ تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم جہاں رہنا چاہو گے میں وہیں رہوں گی۔ تمہارے ساتھ جیوں گی اور تمہارے ساتھ مروں گی۔ پھر اس نے اپنے بدن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے گاؤن کے بٹن کھولتے ہوئے کہا، مجھے دیکھو۔ کیا میں جوان نہیں ہوں؟ کیا میں حسین نہیں ہوں؟ کیا میں پُرکشش نہیں ہوں؟ اس کے جسم سے نگاہیں چرا کر میں نے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا، ڈالیا جی تم بہت ہی خوبصورت ہو۔ تم لاکھوں میں ایک ہو۔ تمہارے ساتھ جیون بسر کرنے والا مرد بڑا بھاگوان ہوگا۔ جس روز میں نے تمہیں پہلی بار بنوں بی بی کے ڈیرے پر دیکھا تھا تو تم مجھے بہت بھائی تھی۔ اگر میں بھی تمہیں بھاتی ہوں تو پھر تم مجھے چھوڑ کر کیوں جانا چاہتے ہو؟ اس نے اپنا سر میرے کندھے سے رگڑتے ہوئے پوچھا تو میں نے جواب دیا، چھوڑ کر چلے جانا بھی بعض اوقات چاہت کا تقاضا ہوتا ہے۔ اپنی پسند کی شے کو چھوڑ کر چلے جانا کہاں کی چاہت کا تقاضا ہے؟ پھر اس نے میرے کرتے کے بٹن کھولتے ہوئے اور میرے ہونٹ چوم کر جذباتی لہجے میں کہا، آج میں تمہیں جیون کا ایک نیا حسین ترین اور جذباتی روپ دکھاؤں گی۔ آج میں تمہیں اپنا سب کچھ سونپنے آئی ہوں۔ آج ساری رات تم مجھے پیار کرو، جی بھر کر پیار کرو اور پھر میرے ساتھ ہمبستری کرو۔

اس کی بات کا مطلب سمجھ کر میں بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے کہا، ڈالیا جی! اس سے پہلے کہ تم یہ بات آگے بڑھاؤ، ذرا میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ سنبھالی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے میرے ساتھ چلنے لگی۔ ہم خیموں سے نکل کر دارا کے کمرے میں پہنچے۔ جہاں میں نے سانپ پکڑ کر ڈرم میں بند کیے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بڑے سانپ کو اٹھایا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا، ڈالیا جی! اس وقت ہندوستان کے خطرناک ترین سانپوں میں سے ایک سانپ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کا ڈسا انسان علاج کے بغیر چند گھنٹوں میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کو چھیڑا تو اُس نے حسبِ عادت مجھے ڈسا۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ میرے ہاتھوں میں مر گیا۔ مرے ہوئے سانپ کو ایک کونے میں پھینک کر میں اُسے واپس اپنے خیمے میں لایا اور اپنے پاس بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا، ڈالیا جی، تم نے ابھی دیکھا ہے کہ ایک زہریلا سانپ مجھے ڈسنے کے بعد میرے زہر کی تاب نہ لاتے ہوئے خود مر گیا ہے۔ میں ایک زہریلا انسان ہوں جسے کاٹنے کے بعد نہ صرف زہریلے حشرات الارض مر جاتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ شب بسری کرنے والے بھی زندہ نہیں رہتے۔ تمہیں کس شے نے زہریلا بنایا ہے؟ ڈالیا نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، سانپوں کے زہر نے۔ پیدا ہونے کے بعد سے اٹھارہ سال تک میرے خون میں دنیا کے ہر سانپ کا زہر داخل کیا جاتا رہا ہے جس نے مجھے زہریلا کر دیا۔

اس نے مسکرا کر بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے برہنہ سینے پر رکھ کر مجھے بستر پر اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا، بس اتنی سی بات؟ میں یہ رِسک لینے کے لیے تیار ہوں۔ تم بستر پر لیٹ کر مجھے پیار تو کرو۔ آج میں تمہیں جذبات کی ایسی شاہراہوں کی سیر کراؤں گی جن سے تم ابھی تک ناآشنا ہو اور مجھے یقین ہے کہ کل صبح تک تمہارا ڈر بھی جاتا رہے گا۔ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا، ڈالیا جی یہ ڈر نہیں حقیقت ہے اور یہ شاہراہیں بھی میرے لیے نئی نہیں ہیں۔ میں ان کی سیر کر

چکاہوں اوراسی وجہ سے میں یہ رسک لینے کے لیے تیارنہیں ہوں۔میری ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے اس نے میرے چہرے کواپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کراپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا،مرنے کا خطرہ تو مجھے ہے نااور میں یہ خطرہ مول لینے کوتیار ہوں۔تم مت گھبراؤاور میرے مرنے کی فکر بھی نہ کرو۔بس وہی کرو جو میں چاہتی ہوں اور جس کے لیے میں تیار ہوکر آئی ہوں۔آج رات تم میرے ساتھ ہمبستری کے مزے لوٹو پھر کل صبح تمہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔کل صبح مجھے دلانے کے لیے تم زندہ ہی نہ ہوگی، میں نے دُور ہٹتے ہوئے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔پھر میں نے بڑے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر کہا، ڈالیا جی، سانپ کا کاٹا صبح کا سورج تو دیکھتا ہے لیکن میرے ساتھ رات بسر کرنے والیوں کو صبح کی روشنی دیکھنا تک نصیب نہیں ہوتی۔اب سے پہلے میں اپنی دو پیار کرنے والیوں کو نادانستگی میں کھو چکا ہوں۔تمہیں جانتے بوجھتے سزائے موت نہیں دوں گا۔

کیا مطلب؟ اسے شاید پہلی بار میری بات کی سنگینی کا احساس ہوا تھا تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔کیا تم پہلے بھی کسی اور کے ساتھ۔۔۔؟ ڈالیا نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھا تو میں نے جواب دیا، ہاں ڈالیا جی۔یہ سچ ہے کہ تم سے پہلے دولڑکیوں نے مجھ سے پیار کرنے کا جرم کرنے کے بعد میرے ساتھ شب بسری کی غلطی کی تھی۔جس کی سزا انہیں موت کی صورت میں ملی تھی۔تم میرے بارے میں جاننے کی متمنی تھیں نا۔چلو میں آج تمہیں اپنی کہانی سناتا ہوں۔اُن دو پیار کی متوالی بدنصیب لڑکیوں کی کہانی سناتا ہوں جنہیں میں نے نادانستگی میں سزائے موت دی تھی۔اسے اپنے ساتھ چمٹا کر میں بستر پر بٹھایا اوراسے رمپا اور ماریہ کے سنگ گزاری ہوئی رات کے بعد ان کی موت اور باعثِ موت بتانے کے بعد پختہ لہجے میں کہا، اُن دو معصوموں کو میں نے انجانے میں محبت کرنے کی سزا موت دی تھی لیکن تمہیں جانتے بوجھتے موت کے منہ میں کبھی نہیں دھکیلوں گا۔تو کیا اسی وجہ سے تم بنوں بی بی کے ڈیرے پر رہ رہے تھے؟ میری داستان سن کر ڈالیا نے میرے سینے سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے پوچھا۔ہاں! یہ ایک بڑی وجہ ہے۔پھر کچھ سوچ کر بولی، طب کی دنیا میں امریکہ باقی دنیا کے مقابلے میں بہت آگے ہے۔جو کچھ تم نے کہا ہے اگر وہ سچ بھی ہے تو میرے خیال میں اس کا تریاق یا تدارک ہمارے ڈاکٹروں کے علم میں ضرور ہوگا۔تم میرے ساتھ امریکہ چلو۔وہاں پر ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے تمہارا مکمل علاج کروانے کے بعد تمہیں میرے ساتھ ایک بار پھر معتدل زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔میں نے جواب دیا، عرصہ ہوا میں نے معتدل جیون گزارنے کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا ہے ڈالیا جی۔

وہ کیوں؟ اُس نے پوچھا۔اس لیے کہ دیویاں اور دیوتا ایسا نہیں چاہتے۔اگر میرے جیون کا مقصد بیوی بچے اور گھر ہوتا تو میں بھی باقی لوگوں جیسا ہوتا۔ڈالیا نے جذباتی انداز سے کہا، تمہیں نہیں معلوم کہ تم سے ملنے کے بعد سے اب تک میں تمہیں اپنا سب کچھ مان کر تمہارے سنگ اپنا جیون گزارنے کے خواب دیکھتی رہتی ہوں۔میں نے جواب دیا، تم سے پہلے نیتو نے بھیم یرے ساتھ پریم کی گلی میں جیون گزارنے کے کچھ ایسے ہی خواب دیکھے تھے لیکن دیوتاؤں نے اسے بھی ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین لیا تھا۔میں نہیں چاہتا کہ نیتو کی طرح تمہیں بھی اپنی محبت کی بھینٹ چڑھادوں۔نیتو کون تھی؟ اس نے پوچھا۔ڈالیا کو اپنی اور نیتو کی پریم کہانی سنانے کے بعد میں نے کہا، مجھے دینے کے بعد دیوتاؤں نے شادی سے دو ہفتے پہلے نیتو کے ساتھ میرا سب کچھ واپس لے لیا تھا۔

اس نے حیرت اور دلچسپی سے میری ساری کہانی سنی اور بولی، نیتو کو کیا ہوا تھا؟ یہ معمہ میں ابھی تک حل نہیں کرسکا۔میں نے بتایا تو وہ بولی، یہ تو تم پر تو سراسر ظلم ہوا ہے۔آخر تم نے ان کا کیا بگاڑا ہے کہ دیوتا ہر پیار کرنے والا تم سے چھین لیتے ہیں اور وہ تمہاری دنیا روشن ہونے سے پہلے ہی اندھیر کردیتے ہیں؟ میں نے بڑے تحمل سے جواب دیا، پہلے میں بھی کچھ ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔سنسار میں ہر شے کی تخلیق کسی خاص مقصد کے تحت ہوتی ہے اور اسی مقصد کے تحت ماحول اس کی تربیت کرتا ہے۔اگر دورانِ تربیت طالبِ علم سے کوئی کوتاہی ہوتی ہے تو اس کو سرزنش کیا جاتا ہے۔یہی کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا تھا۔جب مجھے اپنی تخلیق کا مقصد معلوم نہیں تھا تو میں نے پیار کرنے کی غلطیاں کی تھیں۔اس لیے سزائیں پائی ہیں۔اب مجھے اپنے ہونے کی وجہ کا علم ہے اس لیے وہ غلطیاں نہیں دہراؤں گا۔تمہارے خیال کے مطابق تمہارے ہونے کا مقصد کیا ہے؟ ڈالیا نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، مجھے بھگوانوں نے دوسروں کی سیوا کے لیے پیدا کیا ہے۔اگر میں نہ ہوتا تو نہ سیتا رام مناسہ کے درشن کرسکتا اور نہ تلک رام کو مناسہ کی خوشبو نصیب ہوتی اور نہ تمہیں اپنے اجداد کی کھوئی ہوئی جائیداد ملتی۔تم میری جائیداد ہو اور میرا سب کچھ ہو۔مجھے اپنے اجداد کی دولت بھی نہیں چاہیے۔کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ میں بھگوانوں سے کہہ کر اپنے اجداد کی ساری دولت کے بدلے تمہیں مانگ لوں؟ ڈالیا نے جذباتی انداز میں میرا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا، تم صرف اپنے بارے میں کیوں سوچتی ہو، ڈالیا جی۔تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی ہو۔ذرا اپنے دائرے سے نکل کر سوچو کہ اگر میں رمپا، ماریہ یا نیتو کے ساتھ گھر بسا کر بچے پیدا کر رہا ہوتا تو تمہارے کام نہ آسکتا۔کیا تم مجھے اپنا قیدی بنا کر ان تمام ضرورتمندوں کا حق تلف کرنا چاہتی ہو جنہیں آنے والے وقت میں میری ضرورت ہوگی؟ ڈالیا جی، جیون کی راہ میں پہلا سانس لینے سے آخری سانس تک انسان کبھی کچھ پاتا ہے اور کبھی کچھ کھوتا ہے۔کبھی کبھی پانے سے کھونا بہتر ہوتا ہے۔کبھی انسان بازی ہار کر ایسی خوشی محسوس کرتا ہے جو جیتنے والے کے نصیب میں نہیں ہوتی ہے۔تمہارے جیسی حسین لڑکی کو پیچھے چھوڑ کر جانا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن میں یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔میں چاہتا ہوں تم اپنی دنیا میں ایسے لوٹو کہ تمہیں اپنی قربانیوں پر فخر ہو اور تمہیں اپنی ہار پر ناز ہو۔میں یہاں سے جاتے وقت تمہارے چہرے پر ایک فاتح جیسی مسکان دیکھنا چاہتا ہوں۔

مجھے نہ کبھی نیتو، ماریہ اور رمپا کو الوداع کہنے کا موقع ملا تھا اور نہ میں تمہیں الوداع کہنا چاہتا ہوں۔ان کی طرح تمہاری یادوں کو بھی میں ہر سمے اپنے پاس سنبھال کر رکھنا چاہتا ہوں۔

میری باتیں سن کر ڈالیا بولی، مجھے جیون کی نئی راہ دکھانے کا شکریہ۔تمہاری بات میری سمجھ میں اب آئی ہے۔دراصل میں خود فراموشی اور خودغرضی کے ایک ایسے خول میں تھی جہاں مجھے اپنے اور تمہارے علاوہ کچھ نہیں دِکھتا تھا۔اپنے لیے تو سب جیتے ہیں دوسروں کے لیے جینے میں جو مزا ہے اس کی دمک میں تمہارے چہرے پر دیکھ رہی ہوں اور تمہاری باتوں سے محسوس کر رہی ہوں۔تم نے مجھے جیون کی ایک ایسا راہ دکھائی ہے جسے میں اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کروں گی۔اگر اس دنیا میں دیوتا واقعی انسانوں کے روپ میں آتے ہیں تو مجھے یقین ہے وہ ہو بہو تم جیسے ہوں گے۔میں اپنی آئندہ نسلوں کو بتاؤں گی کہ میں نے انسان کے روپ میں ایک جیتا جاگتا دیوتا دیکھا تھا۔اچھا اب تم آرام سے سو جاؤ۔میں نے تمہارا کافی وقت ضائع کیا ہے۔میں اپنے خیمے میں جاتی ہوئی شاید میری نانی میرا انتظار کر رہی ہیں۔یہ کہتے ہوئے ڈالیا میرے ماتھے پر بوسہ دے کر خیمے سے نکلی تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے قربانی کی چمک تھی اور اس کے ہونٹوں پر ایک پُرعزم مسکراہٹ تھی۔ایک ایسی مسکراہٹ جو کسی فاتح کے ہونٹوں پر اپنی شاندار کامیابی کے بعد آتی ہے۔اس کے ساتھ ہی مناسہ کی خوشبو نے میرے خیمے کو معطر کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر بعد میں اُٹھا اور بھاگاں کو بیگ سے نکال کر پوچھا، تم ڈالیا کے پاس رہنا چاہتی ہو یا میرے ساتھ سندر بن جانا چاہتی ہو۔میرے سوال کے جواب میں اس نے میرے گرد لپٹی ماری۔اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر کالی اور بھاگاں کو ایک بیگ میں ساتھ لے کر میں اپنے خیمے سے جسم پر دو کپڑوں میں نکلا اور آہستہ سے چلتا ہوا سریت کے خیمے کے قریب آ کر ہولے سے اس کو آواز دی۔سریت میری آواز سن کر آنکھیں ملتا ہوا نکلا اور پوچھا، آپ اس وقت۔خیر تو ہے شمان جی؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں خیریت ہے۔کیا آپ مجھے گاڑی میں بس کے اڈے تک چھوڑنے جا سکتے ہیں؟ اگر آپ کو کہیں جانا ہے تو جیپ لیتے جائیں۔نہیں آپ مجھے بس کے اڈے تک چھوڑ آئیں تو بڑی کرپا ہو گی۔اچھا آپ ایک منٹ ٹھہریں۔یہ کہتا ہوا وہ اندر گیا کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی۔اس نے جیپ نکالی اور میرے جیپ میں بیٹھتے ہی پوچھا، آپ کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے سریت کو جواب دیا، واپس سندر بن۔کیوں؟ اس نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، آج یہاں پر میرا کام ختم ہو گیا ہے اس لیے۔ہمیشہ کے لیے؟ سریت نے پوچھا۔جی ہاں، میں نے جواب دیا تو وہ بولا جان تو کہہ رہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ کچھ عرصہ تک رہیں گے۔کیا سٹیو اور جان کو آپ کے جانے کا علم ہے؟ اگر نہیں ہے تو صبح تک انہیں علم ہو جائے گا، میں نے جواب دیا۔بس کے اڈے پر سریت مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔جہاں سے میں نے واپس کی بس پکڑی۔بارہ گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد میں بنوں بی بی کے ڈیرے کے دروازے پر ابھی نہیں پہنچا تھا کہ ڈیرے کے دروازے پر کئی شمان میرے استقبال کے لیے جمع تھے۔جیسے انہیں میری آمد کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی۔سب نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا۔ایک نے آگے بڑھ کر مجھے کہا، صیام بابو، بڑے بابا آپ کو یاد کر رہے ہیں۔میں ان کے ساتھ بڑے بابا کی کٹیا میں گیا تو سامنے باپو اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کے ساتھ اپنی بانہیں پھیلائے ہوئے مجھے گلے لگانے کے منتظر تھے۔میں بھی ان کے سینے سے چمٹ کر پھٹ پڑا۔

بقیہ : ماس

میوزیم میں رکھے ہیں جہاں اس کے استعمال میں رہنے والی دیگر اشیاء بھی موجود ہیں۔جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ چار سو پونڈ وزن کے انسانوں میں سے ایک انسان نے اگر اپنا تمام فاضل گوشت پندرہ دن میں استعمال کر لیا تو ظاہر ہے کہ اسے چھپنا پڑا ہوگا۔بات دراصل یہ ہے کہ وہ کھانے کا شوقین تھا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا تھا اور پھر اس کا جثہ بھی بڑا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا جسم اس سے زیادہ سے زیادہ خوراک طلب کرتا تھا۔مگر شہر میں وہ تو اکیلا چھپنے والا آدمی نہیں تھا۔حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ اسی رویے کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔

ایک صبح کو مسز اورفیلا کو جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ اس نے فلاں چیز کہاں رکھی ہے؟ بیٹا اس وقت اپنا داہنا کان کھا رہا تھا اور اتنا مصروف تھا کہ اس نے ماں کی کوئی بات نہ سنی۔تنگ آ کر ماں نے ''گمشدہ افراد'' کے دفتر سے رابطہ کیا۔دفتر نے ایک شخص کو اس کے گھر بھیجا کہ تحقیقات کرے۔اس شخص نے پوری تحقیقات کی اور فضلے کا صرف ایک تھیلا برآمد کر سکا جبکہ مسز اورفیلا کا کہنا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل تو وہ یہاں بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔لیکن یہ چھوٹی موٹی گڑبڑ اس شہر کی آبادی کے معمولات میں کوئی خلل نہ ڈال سکی۔لوگ اپنا ہی گوشت کھا کر خوش تھے۔ایک شہر جسے پیٹ بھر کر کھانے کے لیے مل رہا تھا بھلا کس طرح شکایت کر سکتا تھا! اس سے ثابت ہوتا تھا کہ گوشت کی قلت کے سبب جو بے چینی پھیل رہی تھی وہ تو اب نہیں تھی نا!! گوشت کی قلت کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔

ایک مسئلہ حل ہوا تھا تو دوسرا یہ پیدا ہو گیا کہ شہر کے لوگ غائب ہونے لگے تھے۔لوگوں کو زندہ رہنے کے لیے جس چیز کی ضرورت تھی وہ انہیں مل رہی تھی لیکن لوگوں کا اس طرح نظروں سے اچانک غائب ہو جانا کیا جملے کے خاتمے کے مترادف تو نہیں تھا؟ تاہم حالات کچھ ایسے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے ماس اپنا خراج وصول کر رہا ہو۔اس طرح کے بے موقع سوالات کرنے کا مطلب یہ تھا کہ شہر کی آبادی کا پیٹ بھرا ہوا ہے اس لیے پریشان کن سوالات نہ کیے جائیں۔

ورجیلیو پینیرا (Virgilio Pinera) کے چاہنے والے
اسے خود کو تباہ کرنے سے بچانے کے خواہشمند تھے۔ بیورو کریٹس اور کم مقبول
لکھاری اس سے حسد کرتے تھے۔ وہ بوہیمئن اور ہم جنس پرست تھا۔ کیوبا کی
سوسائٹی میں جو مردوں کے گرد گھومتی تھی اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ شاعر بھی
تھا لیکن اس کے ڈرامے اس کی مختصر کہانیوں سے بھی زیادہ مقبول تھے۔ ۱۹۵۰ء کا
عشرہ اس نے بوئنس آئرس (Buenos Aires) میں گزارا تھا جہاں اس کی
ملاقات بورجیس (Borges) سے ہوئی تھی۔ ان دنوں اس کی تخلیقات
''سُر'' (Sur) نامی جریدے میں شائع ہوا کرتی تھیں جو بہت بڑی بات تھی۔
کیوبا میں انقلاب کی آمد کے بعد وہ کیوبا لوٹ آیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں اسے ''سیاسی
اور اخلاقی جرائم'' کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ ایک تماشائی اور فضول
زندگی گزارنے والے کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتا رہا۔ ان دنوں اس کا دفاع
کرنے والے کم ہی ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں اسے ''کاساڈی لاس امریکاز
ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ اس کی کہانیاں کافکا کی کہانیاں محسوس ہوتی ہیں۔ ''ماس''
اس کی نمائندہ کہانی ہے جس میں وہ خود کو کھانے کے لیے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

☆

اس معاملے کا آغاز بہت سادہ طریقے سے ہوا تھا، اس میں کوئی دھوم
دھام، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ وجوہ کیا تھیں یہ بتانے کے لیے تفصیل میں جانے کی
ضرورت نہیں۔ چھوٹا سا شہر تھا اور وہ شہر گوشت کی قلت کا شکار ہو گیا تھا۔ شہر کی آبادی
گوشت خور تھی اور جب اس قلت نے شہریوں کے دروازوں پر دستک دی تو لوگوں
کے منہ سے تلخ کلمات برآمد ہونے لگے۔ بعض لوگوں کے خیال میں شہری آبادی
سے کوئی قوت انتقام لے رہی تھی۔ لیکن جیسا کہ عموماً اس قسم کے حالات میں ہوتا ہے،
احتجاجات کسی مربوط اور منظم تحریک میں تبدیل نہیں ہوئے۔ جب گوشت کی قلت
برقرار رہی تو لوگ مجبوراً سبزیوں اور ترکاریوں کی جانب متوجہ ہوئے اور زمین پر اُگنے
والی ہر قسم کی بھاجیوں اور ترکاریوں کو مزے مزے کے کھانوں میں تبدیل کرنے کی
کوشش کرنے لگے لیکن وہ لوگ گوشت خور تھے زمین کے اوپر اور نیچے پیدا ہونے والی
اشیاء مختلف طریقوں سے پکانے کی سعی جاری تھی کیونکہ مستقبل قریب میں گوشت کی
فراہمی کے آثار نہیں تھے۔ ایک متبادل اور قابل قبول کھانے کی تلاش ہو رہی تھی۔
اس ہڑبونگ میں ایک شخص مسٹر انسالڈو (Mr. Ansaldo) خاموش بیٹھا یہ تماشا
دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سکون اور طمانیت تھی۔ ایک دن اس نے اپنے
باورچی خانے میں موجود ایک بڑا سا چاقو منتخب کیا اور اسے تیز کرنے لگا۔ چاقو تیز
کرتے کرتے وہ رکتا اور دھار پر انگلی پھیر کر فیصلہ کرتا کہ اسے مزید کتنا تیز کرنا ہوگا۔
تھوڑی دیر بعد جب وہ چاقو کی دھار سے مطمئن ہو گیا تو اس نے اپنی پتلون نیچے گرالی
اور ایک ہی وار میں اپنے بائیں چوتڑ سے ایک بڑا سا تکہ نکال لیا۔ بڑا ہی خوبصورت
تکہ تھا۔ اسے اس نے دو موٹے موٹے حصوں میں تقسیم کیا۔ انہیں دھو کر اور صاف کر
کے اس نے پہلے سے تیار رکھے سرکے اور نمک کے تسلے میں لٹا دیا۔

جتنی دیر میں نمک اور سرکہ گوشت پر کام دکھاتے مسٹر انسالڈو نے
اپنی مرہم پٹی کی اور گوشت کے دونوں پارچوں کو پہلے بھٹی سے گزار کر انہیں بھونا
اور پھر انہیں اس توے پر تلنے کے لیے ڈال دیا جس پر ہر اتوار کو چپاتیاں بنایا کرتا
تھا۔ جب دونوں پارچے تلے جا چکے تو اس نے ایک پارچے سے ایک ٹکڑا نکال کر
کھانے کے لیے اپنی پلیٹ میں ڈال لیا تھا۔ مرہم پٹی کے باوجود اس وقت پوری
تیاری کے ساتھ ٹائی سوٹ میں بیٹھا اپنا گوشت کھانے کے لیے کانٹا اور چھری
آگے بڑھا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ انسالڈو کا ہمسایہ تھا جو گوشت
کی قلت کی اس سے شکایت کرنے کے لیے آیا تھا۔

انسالڈو نے ایک اچھے میزبان کی طرح ہاتھ کے اشارے کے ساتھ
مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے بتایا کہ وہ ابھی ''اپنے'' پسندیدے کھانا
شروع کرنے ہی لگا تھا جو نہایت خوبصورت اور اشتہا انگیز تھے۔ ہمسایہ جو گوشت
دیکھ کر حیرت زدہ تھا یہ پوچھنے سے خود کو روک نہ سکا کہ ''یہ گوشت کہاں سے آیا؟''
اس پر انسالڈو نے اپنا بایاں کولہا آگے بڑھا دیا اور حقیقت کھول کر
رکھ دی۔ ہمسایہ اس قدر پریشان اور روہانسا ہوا کہ اپنے منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکا
اور انسالڈو کے گھر سے نکل گیا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ ایک بار پھر انسالڈو کے گھر پر
تھا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ شہر کا میئر (Mayor) تھا جس نے اسے دیکھتے ہی
شہریوں کی گوشت کی قلت کے حوالے سے مجبوریوں کا ذکر کیا اور کہا کہ میں دل
سے چاہتا ہوں کہ میرے شہر کے لوگوں کو ان کی پسندیدہ خوراک ملے۔ پھر اس نے
انسالڈو کی پلیٹ پر نظر ڈالی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے محبوب شہری بھی اسی
طرح خوش خوراک ہوں جیسا کہ وہ، انسالڈو ہے۔ میئر نے کہا کہ میں جانتا ہوں
کہ انسالڈو اپنا نجی ذخیرہ استعمال کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے شہر کے لوگ
بھی اس کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ہر شہری اپنا خدا کا دیا ہوا ذخیرہ استعمال کرے۔
میئر نے کہا کہ اس طرح اس قلت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ شہر کے تعلیم یافتہ لوگ
معترض تھے۔ انہیں قائل کرنے کے لیے انسالڈو شہر کے مرکزی چوک میں پہنچا اور
کہا کہ میں اپنے شہری بھائیوں کو عملی طور پر بتاؤں گا کہ وہ کس طرح اس قلت پر قابو
پا سکتے ہیں۔ چنانچہ شہر کے چوک میں پہنچ کر اس نے وہاں بھی تمام شہریوں سے
خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہر شخص جو گوشت کی قلت محسوس کرتا ہے وہ اگر چاہے تو
خدا کی طرف سے عطیہ کردہ گوشت کے ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ کس

طرح؟اس نے کہا کہ اگر شہری باشندے چاہیں تو وہ اس کا عملی مظاہرہ کر سکتا ہے۔

اس نے کہا کہ خدا نے ہر شخص کو دو چوتڑ دیئے ہیں جن میں سے ایک قربان کیا جا سکتا ہے۔اس کے مطابق ہر شخص اگر اپنے بائیں کولہے سے گوشت کا ایک لوتھڑا نکال لے تو اس کا مسئلہ با آسانی حل ہو سکتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے لوہے کے ایک آنکڑے پر لٹکے دو مصنوعی پارچوں کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ کس طرح دو پارچے نکالے جا سکتے ہیں۔اس نے کہا ”ہر فرد کو خدا نے دو عدد کولہے دیے ہیں جن میں سے ایک وہ اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔“ اس نے مزید کہا کہ اپنے استعمال کے لیے ایک لوتھڑا نکالنا بہت زیادہ مشکل کام نہیں۔ تھوڑی بہت تکلیف تو ہر کام میں ہوتی ہی ہے۔اپنی طرف سے اس نے میئر سے کہا کہ وہ اگر چاہے تو انسالڈو مرکزی چوک پر آ کر ترغیب کے لیے ایک عدد پرجوش قسم کی تقریر بھی کر سکتا ہے۔میئر بخوشی راضی ہو گیا۔

چنانچہ مقررہ دن اور وقت پر انسالڈو مصنوعی پارچے آنکڑے پر لٹکا کر چوک میں پہنچ گیا جہاں میئر کی طرف سے پیشگی اعلان کے ردعمل کے طور پر شہر کے لوگ پہلے سے جمع تھے۔مظاہرے اور تقریر کے لیے میئر نے لکڑی کے پھٹوں کا ایک عارضی چبوترا سا بنا دیا تھا۔انسالڈو نے اپنی ترغیبی تقریر شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے ان کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔اس نے کہا کہ ہر انسان کو خدا نے فاضل اعضاء دیے ہیں جن میں سے ایک استعمال کر کے وہ زندہ رہ سکتا ہے۔پھر اس نے آنکڑے سے دونوں پارچے اتار کر اپنے بائیں کولہے پر لگا کر بتایا کہ ایک لوتھڑا کہاں سے کہاں تک کاٹ کر جسم سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد اسے دو حصوں میں کس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے تا کہ زیادہ دیر تک یا دنوں تک ان سے لطف اندوز ہوا جا سکے!

چوک میں موجود تمام شہری جو اپنے ساتھ مددگار کے طور پر اپنی بیویوں اور شوہروں کو لے کر آئے تھے، مرہم پٹی سے بھی لیس تھے۔انسالڈو نے کہا کہ ”میں صرف ایک کولہا تراش کر نکالنے کا مشورہ دیتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر آپ دونوں کولہوں سے محروم ہو جائیں کے تو بیٹھتے ہوئے آپ کو بڑی تکلیف ہوگی“ ان کلمات کے ساتھ اس نے اپنی تقریر ختم کی اور اشارہ کیا کہ جو لوگ اپنا بایاں کولہا کاٹنے کے لیے تیار ہوں وہ اپنا کام شروع کر دیں۔چوک میں جمع تمام لوگ اور ان کے مددگار مشغول ہو گئے۔کیسا زبردست منظر تھا۔اطراف میں کھڑے چند اخباری نمائندوں سے انسالڈو نے درخواست کی کہ اس پورے واقعے کی تفصیل اگر درج نہ ہو تو بہتر ہوگا۔لہٰذا یہ تو بتانا ممکن نہیں ہوگا کہ انفرادی طور پر کس نے کیا کیا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ منظر قابل دید تھا جس میں لوگوں نے اپنے اپنے گھروں سے لائے ہوئے تسلوں میں اپنے بائیں کولہے کاٹ کر ڈالے ہوئے تھے۔انسالڈو کی ہدایت پر اسی وقت ان کولہوں کے پارچوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔اسی وقت حساب کیا گیا کہ یہ پارچے جو نکالے گئے ہیں کتنے دن شہریوں کے کام آ سکتے ہیں۔ایک معروف ڈاکٹر نے اپنے تجربے اور لیاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک سو پونڈ کے ایک فرد کے ایک کولہے کو صاف کر کے تقسیم کرنے کے بعد بچ جانے والا گوشت 140 دن استعمال ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ایک دن میں آدھ پونڈ کھائے۔حساب کتاب میں یقیناً غلطی تھی مگر جو بات اہم تھی وہ یہ تھی کہ ہر فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اپنی پسند کے تکے، پسندے اور بوٹیاں خود کھا سکتا تھا۔اس موقع پر لوگوں نے ان عورتوں کے منہ سے سنا کہ وہ مسٹر انسالڈو کے نظریئے کی حمایت کر رہی تھیں۔مثال کے طور پر اگر وہ اپنی چھاتیاں خود ہی کھا جاتیں تو انہیں چھاتیوں کو چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ مردوں کی طرح محض بنیان پہن کر زندگی گزار سکتیں۔کچھ عورتوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں اس لیے کہ وہ انہیں کاٹ کر کھا چکی تھیں کہ یہ بادشاہوں کی مرغوب ڈش تھی۔

جب چوک میں یہ واردات ہو رہی تھی تو گلی میں دو عورتیں جو ایک دوسری کو بہت پرانی جانتی تھیں، اچانک ٹکرائیں تو باہم بوسوں کا تبادلہ نہ کر سکیں اس لیے کہ انہوں نے اپنے ہونٹوں کے پکوڑے بنا کر کھا لیے تھے۔

جیل کا وارڈن ایک مجرم قیدی کو اس لیے سزائے موت نہ دے سکا کہ اس نے مجرم کی انگلیاں پکا کر کھالی تھیں۔اس واقعے کے بعد وہ محاورہ مشہور ہوا تھا کہ ”ذائقہ ایسا کہ آپ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔“

اپنے اعضا کھانے کی مہم کی مزاحمت بھی ہوئی۔کپڑے سینے والی خواتین کی یونین نے متعلقہ حکام کو ایک رسمی احتجاجی درخواست دی کہ ان کی جانب سے درزیوں کی سرپرستی کی اپیلیں جاری ہونا بند ہو گئی ہیں۔اس مزاحمتی تحریک کا کوئی اثر نہیں ہوا اس لیے کہ شہریوں کی اپنا ہی گوشت کھانے کی مہم کسی خلل کے بغیر جاری رہی تھی۔

شہر کے مرکزی چوک میں ہونے والے واقعے کے بعد اسی حوالے سے ایک رنگا رنگ تقریب منعقد ہوئی۔اس تقریب کا انعقاد کچھ عرصے کے بعد ہوا تھا جس میں شہر کے معروف رقاص کے گوشت کے آخری لقمے کا کٹ کر اس کے منہ میں جانا تھا۔اپنے فن کے احترام میں اس نے اپنے ایک پیر کا آخری انگوٹھا چھوڑ رکھا تھا۔ رقاصوں کو اپنے پیروں پر ناز ہوتا ہے لہٰذا اس نے اپنے پیروں کی انگلیاں اپنی زندگی کے آخری لمحات کے لیے چھوڑ رکھی تھیں جب اس کو احساس ہوا کہ وہ دنیا سے رخصت ہونے والا ہے تو اس نے ایک ایک کر کے اپنے پیروں کی انگلیاں کھانی شروع کر دیں۔ اس کے پڑوسی دیکھ رہے تھے کہ اپنے آخری چند ایام میں وہ بے چین رہنے لگا تھا۔اب اس کے ایک پیر کا ایک انگوٹھا باقی رہ گیا تھا۔جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا وقتِ آخر آ گیا ہے اس نے اپنے دوستوں کو آخری آپریشن میں مدعو کیا۔اس کے گھر کے بڑے ہال میں مکمل سکوت کے عالم میں اسے چاقو حوالے کیا گیا۔رقاص نے خاموشی سے انگوٹھا تراشا اور اسے بھونے بغیر ہی اس سوراخ میں ڈال لیا جو کسی وقت اس کا خوبصورت منہ ہوا کرتا تھا۔اس موقع پر موجود تمام مہمان اچانک نہایت سنجیدہ ہو گئے تھے۔

لیکن جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، زندگی چلتی رہتی ہے۔۔۔اور یہی اہم ہے اور اگر اتفاق سے۔۔۔؟ لوگ کہتے ہیں کہ اس عظیم فنکار کے جوتے فلاں

باقی صفحہ ۹۶ پر ملاحظہ کیجیے

آخری بات

نصرت انور

(امریکہ)

لکھنے اور پڑھنے کے لیے دو آنکھوں، ایک حاضر دماغ اور کتاب کے صفحات پلٹنے کے لیے کم از کم ایک ہاتھ کی ضرورت تو ہوتی ہے لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے میرے یہ اعضاء گروی پڑے ہیں اور گوشہ عافیت مجھے میسر نہیں۔ اب جب میرا اپنا آپ میرے پاس نہیں تو ایسی صورت میں ظفر قریشی کی کتاب ''عالمی کہانیاں'' پر کچھ لکھنے کا فرمان ملا، چاروناچار میں کوشش کرتی رہی جسے میں نامکمل ہی کہوں گی۔ پھر ترجمہ شدہ کہانیوں کو ان کی اصل شکل میں پڑھنے کے لیے بھاگ دوڑ بھی کرنا پڑی۔

اکرام بریلوی ''ضمیر نامہ'' ایک مضمون میں لکھتے ہیں ''ترجمہ، مترجم اور ادیب کے درمیان سخن ورانہ ہم کلامی ہے۔ یہ ہم کلامی جتنی پیر رومی اور شمس تبریز جیسی ہوگی ترجمہ اتنا ہی اصل سے ہم کنار ہوگا۔''

''صلیبیں میرے دریچے میں'' میں شامل کسی ایک خط میں فیض احمد فیض نے اس طرح رقم فرمایا:

''پوری صحت کے ساتھ ترجمہ کرنا بہت عرق ریزی کا کام ہے جس میں تخلیقی کام سے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔''

مرزا حامد بیگ نے کہا ''تراجم نے نئے اسالیبِ بیان کو جنم دیا۔ پیرایۂ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال کو بڑھاوا دیا اور اظہار کے نئے سانچے فراہم کیے۔''

ظفر قریشی نے رنگ رنگ کے دیسوں کی رنگ برنگی کہانیوں کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ایلس منرو کی کہانی ''میورلی سے فرار'' (Leaving Maverly) کو پڑھ کر مجھے ایسا لگا کہ ایلس منرو (Alice Minro) اور مترجم کی فکری سطح میں کافی ہم آہنگی ہے۔ منرو کی کہانی کے طرزِ احساس کو مترجم نے خاطر میں رکھا۔ کرداروں کی چلت پھرت کو پورے دھیان میں رکھا۔ ''میورلی سے فرار'' زندگی کی سچائیوں میں سے ایک سچائی پر مبنی کہانی ہے۔ اہم کرداروں میں رے (Ray) پولیس کا ملازم ہے جو اپنی بیوی ازابیل کے ساتھ ایک کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔ ایک لڑکی لیہہ (Leah) ہے جو ایک سینما گھر میں ٹکٹ فروخت کرتی ہے لیکن نہایت قدامت پرست گھرانے سے تعلق کے باعث اسے فلم دیکھنے یا ڈائیلاگ سننے کی ممانعت ہے۔ رے (Ray) اس کو سنیچر کی رات کو گھر چھوڑنے کی ذمّے داری قبول کرتا ہے۔ کہانی کا عرصہ برسوں پر محیط ہے۔ ایک دن لیہہ (Leah) گھٹن کے ماحول سے تنگ آ کر فرار ہو جاتی ہے اور کسی چرچ کے منسٹر یا پادری کے بیٹے سے شادی کر لیتی ہے۔ کہانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو بچے جبر کے ماحول اور کڑے اُصولوں کے تحت پرورش پاتے ہیں وہ اصل دنیا کے معاملات کے ساتھ خود کو وابستہ نہیں کر پاتے اور عموماً بھٹک جاتے ہیں۔ چند سالوں بعد رے (Ray) کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ لیہہ (Leah) بھی اپنی ناکام شادی کے بعد منظرِ عام پر رے (Ray) سے ملاقات کرتی ہے۔ شاید کہانی یہ بتلا رہی ہے کہ زندگی میں اگر صحیح ساتھی نہ چُنا جائے تو تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور شاید یہ بھی کہ انسان کو اپنی تلاش اور ایک دوسرے کی تلاش میں وقت درکار ہوتا ہے۔ رے (Ray) اپنی بیوی کی ''باقیات'' کا انتظام کرنے کے بعد یہ سوچتا ہے ''یہ وجہ بھی درست ہے کہ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم آگے بڑھایا جائے۔''

ظفر قریشی نے کہانی کی زبان، کرداروں کے لب و لہجے اور ان کی ذہنی کیفیات کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے کہانی ان کی اپنی تخلیق لگتی ہے بلکہ کہانی کا ہر جملہ ان کی اپنی اختراع لگتا ہے۔

کتاب کی پندرہ کہانیوں میں سے جو کہانی مجھے بہت زیادہ دلچسپ اور پُرکشش لگی وہ ایسٹونیا کے ادیب آرمن کومیجی کی کہانی ''انجمن نامعلوم مطلقیان'' ہے۔ کارپوریٹ دنیا کے مزاج کے بارے میں یہ ایک پُرمسرت بیانیہ ہے۔ کہانی کے ہیرو نے معیشت کو قابو میں رکھنے کا سبق اپنے دادا سے سیکھا ہے۔ اس بیانیے میں اعداد و شمار کی وقعت اور اہمیت انسانی جذبات اور احساسات سے زیادہ دکھائی دیتی ہے یہاں تک کہ کہانی کا ہیرو معاشی اُمور میں اپنی اہلیت اور صلاحیت کو بہتر بنانے کی غرض سے خود کو برطرف کروا لیتا ہے۔ پیسوں کے حصول کے لیے دوڑ اور ان کو بچانے کے منصوبے معقولیت پسندی کہلاتے ہیں۔ ''انجمن نامعلوم مطلقیان'' زبردست جیتا جاگتا بیانیہ ہے۔ بچت کے لیے پٹرول میں مٹّی کا تیل ملا کر کم خرچ بالانشین ہونے کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔ کیچ اَپ (Ketchup) کی بوتل کو کسی خاص زاویے سے رکھنے کی ترکیب سوچی جاتی ہے جس سے آخری قطرہ بھی نچوڑا جا سکے۔ اس بیانیے کی شگفتگی سے محمد خالد اختر کی کتاب 2011 (جو انہوں نے 1950 میں لکھی تھی) کا کردار افضل ترکا یاد آتا ہے جو شروع میں ایک پنساری تھا لیکن جس نے آخر دم تک ترازو کے پلڑے کو تھامے رکھا تھا اور ساتھ ہی ساتھ تجارت اور ترازو کی برکتوں اور فوائد سے آگاہ بھی کرتا رہتا تھا۔ ''انجمن نامعلوم مطلقیان'' کو پڑھنا ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ ظفر قریشی نے کرداروں کی اصلیت کو منور رکھنے میں پورا کمال دکھایا ہے۔ بیانیے میں آرمن کومیجی (Armin Koomaji) کی تخلیقی توانائی اور ذہانت کو مترجم نے عمدگی سے ترجمہ کیا ہے اور جملوں کی چستی اور برجستگی کو برقرار رکھا ہے۔ بیانیے کا کردار خود اپنی زبان کو چٹخارے دار اس طرح بناتا ہے مثلاً:

''میں ایک کیوی فروٹ کھاتا ہوں تو اپنا وزن کر لیتا ہوں۔''

''حادثے میں دادا کی ٹانگیں ٹنڈی ہونے کے سبب ان کا قد 20 سینٹی میٹر چھوٹا ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ اگر انہیں چھوٹے تابوت میں ڈالا جائے تو

انہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ اپنے اس سوال کے جواب میں، میں نے ان کی آنکھوں میں چمک دیکھی کہ ان کا پوتا معقولیت پسندی کی راہ پر گامزن ہے۔ انہوں نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ سے میرا ہاتھ ہلکے سے دبایا۔''

''کم اہم ٹریفک سائنوں وغیرہ کو درگزر کرتے ہوئے مسافر کو اس کی منزل تک پہنچانا وہ اپنا فرض سمجھتا۔ ڈیش بورڈ سے اس نے تمام غیر ضروری میٹر وغیرہ نکال پھینکے تھے اور ان کی جگہ اصل میٹروں کی تصویریں لگا رکھی تھیں۔''

''میرا باپ'' ایک اور اپنی نوعیت کی انوکھی کہانی ہے جو بار بار قاری کی عقل کو کھٹکھٹاتی ہے۔ اس کہانی کے دو کردار فریڈی اور فریڈی کا باپ ہیں۔ فریڈی ایک ایسا کردار ہے جو دنیا کو دیکھنے کا وہ طریقہ ڈھونڈتا ہے جس کا علم پہلے کسی کو نہ تھا۔ سالواتورے اس کا گرو ہے جو خود ''متوازی استعداد'' نامی گروپ کا رکن ہے۔ اس گروپ کے لوگ مابعدالطبیعات کے فلسفے کے ماننے والے ہیں یعنی Quantum Physics یا نظریہ قدریہ یا الٰہیات کے قائل ہیں اور جن کو یقین ہے کہ انسان کے باطن میں اس کے نعم البدل ہوتے ہیں گویا وہ متوازی توانائی رکھنے کی وجہ سے اپنے متوازی فریڈی سے بات کرسکتا ہے جس سے خود شناسی میں مدد ملتی ہے۔ گویا فریڈی کے متوازی ہر وقت ایک اور فریڈی چلتا رہتا ہے۔ مابعدالطبیعات نظاموں میں کئی طرح کے فلسفے ہیں جن کے ذریعے انسان خود اپنی اصلاح کرسکتا ہے اور اپنے اندر دوسروں کے لیے ہمدردی اور احترام کے جذبے کو فروغ دے سکتا ہے۔ ظاہری طور پر فریڈی کے روّیے میں کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ کافی رواداری کہانی ہے۔ فریڈی کے بچپن میں اس کی ماں نے گلے میں رسّی ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ فریڈی کے ذہنی انتشار کا باعث شاید اس کے باطن میں ماں کی رسّی سے جھولتی ہوئی تصویر ہے جو اس کو کبھی کبھار ناراض اور چڑ چڑا بنا دیتی ہے۔ کہانی کی آخری سطریں کافی اثر انگیز ہیں۔ ''جب میرے باپ نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے آنکھیں بند کیں تو اس پر مجھے تشویش نہیں ہوئی۔ سالواتورے (فریڈی کا گرو) کہتا ہے کہ شعور کی ہر تبدیلی کے ساتھ جسم سے سیال مادّے کا اخراج ضروری ہے۔

بہت اچھا ترجمہ ہے۔ اس میں ظفر قریشی نے پورے صبر و استقامت اور بے پناہ صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ بامعنی ترجمے کے لیے جس قدر استعداد چاہیے ظفر قریشی نے اس کہانی میں بھرپور دکھائی ہے۔

''گلبرٹ کی ماں'' آئیر لینڈ کے ادیب ولیم ٹریور (Wiliam Trevor) کی کہانی ہے۔ یہ کہانی پڑھنے والے پر کپکپی طاری کر دینے والی زبردست کہانی ہے۔ کہانی کا آغاز ایک لڑکی کے قتل سے ہوتا ہے۔ بچپن ہی سے گلبرٹ کی دماغی اور نفسیاتی کونسلنگ ہوتی آ رہی تھی۔ وہ ایک الگ تھلگ رہنے والا قدرے مسخ شدہ کردار ہے۔ گلبرٹ کی ماں اپنے بیٹے کے بارے میں جانتی ہے لیکن اس کا اصل چہرہ سامنے لانے سے ہچکچاتی ہے۔ پوری کہانی کی فضا خوف اور بے چینی میں لپٹی ہوئی ہے۔ پورا وقت قاری کی حسیات پر وحشت طاری رہتی ہے۔ قاری واقعات کے سلسلے کو ایک ہی سوال سے جوڑتا ہے کہ لڑکی کا قاتل کون ہے؟ کہانی میں یہ عقدہ نہیں کھلتا کہ تمام سابقہ تخریبی کارروائیوں کا اور لڑکیوں کے قتل کی وارداتوں کا ذمّے دار کون ہے؟ کہانی میں جو چیز قاری کو آہستہ آہستہ اور خوفناک طریقے سے احساس دلاتی رہتی ہے گلبرٹ کی ماں کو پوری صورتِ حال کا علم ہے۔ گلبرٹ بھی اپنے ردّ عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ وہ ہی اصل مجرم ہے یہ مصنف کا کمال ہے کہ کہانی میں اس نے اتنا ابہام رکھا ہے کہ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ گلبرٹ مجرم نہ ہوتا ہم گلبرٹ کی ماں تمام وقت احساسِ گناہ میں مبتلا رہتی ہے۔ کہانی کا خالق ایک منجھا ہوا ادیب ہے جس پر چیخوف کی حسیات کا بہت زیادہ اثر ہے۔ میرا خیال ہے کہ کہانی کی کامیابی اسی میں ہے کہ اس کا نتیجہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ کہانی کا مطالعہ کر کے قاری جب اس کے کردار اپنے اندر جذب کر لیتا ہے تو وہ اس کے دماغ میں گاہے گاہے جلتے بجھتے رہتے ہیں۔

''ہٹائے جانے کے لائق'' یا ''Checking Out'' نائیجیریا کی ادیبہ چیما مانڈا انگوزی اڈیچی Chimamanda Ngozi Adig کی کہانی ہے جو قاری پر کافی جذباتی دباؤ ڈالتی ہے خاص طور پر تارکین وطن پر۔ وہ لوگ جو اپنا وطن تیاگ دیتے ہیں مگر رہائش کا اجازت نامہ نہ ملنے کے سبب مختلف پریشانیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ رہائشی اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے وہ بار بار غلط لوگوں اور ظالموں کے ہاتھوں میں پھنس جاتے ہیں۔ غلط دھندوں میں ملوث افراد اور کاروباری لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کبھی شادی کا لالچ دے کر پیسے اینٹھتے ہیں۔

اس کہانی کا مرکزی کردار اوبنزے ''Obenze'' ہے جو نائیجیریا سے کسی طرح لندن پہنچ جاتا ہے مگر لندن میں تقریباً روز ہی اس کا واسطہ مکّار، دھوکے باز اور لالچی لوگوں سے پڑتا ہے۔ اوبنزے ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے جسے کبھی یہ یقین تھا کہ وہ پوری کائنات کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہی اوبنزے اچھے مستقبل کی آس میں اپنا وطن ترک کرتا ہے اور بے وطنی میں دھکّے کھاتا ہے۔ پوری کہانی میں قاری اوبنزے کی ذہانت اور ایمانداری سے مرعوب ہوتا ہے۔ قاری کے دل میں اوبنزے کے لیے احترام اور اپنائیت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک اچھے دل کا سچّا لڑکا ہے لیکن بُرے لوگوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہوتا ہے۔ قانونی شہریت کے حصول کی اس کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ کہانی کے آخر میں وہ اپنے ملک واپس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ بحیثیت قاری میرے نزدیک اس کا یہ فیصلہ اچھا ہے۔ سیانے کہتے ہیں ''دیس کی آدھی روٹی، پردیس کی پوری روٹی سے بھلی ہوتی ہے۔''

اس مجموعے میں ایک کہانی لیوٹالسٹائی کی بھی ہے جس کا اُردو عنوان ''خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں'' رکھا گیا ہے۔ اس کہانی کو مکافاتِ عمل بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کہانی کے ہیرو کا جو حشر ہوا کیوں ہوا اس کا جواب تو خدا ہی دے سکتا ہے۔

باقی صفحہ آخر پر ملاحظہ کیجیے

اُردو میں لوک ادب

شہناز قادری
(جموں،کشمیر)

لوک ادب یا Folk Literature پر بات کرنے سے پہلے لفظ لوک یا Folk کی تعبیر وتفسیر ضروری ہے۔انگریزی میں لفظ 'Folk' کے لغوی معنی لوگ یا عوام کے ہیں۔اسی طرح اُردو میں بھی لوک سے مراد عوام یا انسان ہی ہے۔جب سے یہ دُنیا معرض وجود میں آئی تب ہی سے اس میں قیام پذیر لوگ عوام یا لوک جذبات واحساسات کو ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی بولی یا زبان کا سہارا لیتے چلے آئے ہیں۔یہی احساسات اور جذبات جب شدت اختیار کر گئے تو انسان کے منہ سے بے ساختہ منظوم الفاظ ،دانائی سے لبریز فقرے ،سبق آموز من گھڑت کہانیاں وغیرہ ادا ہوئیں اور سینہ بہ سینہ ایک نسل دوسری نسل تک محوِ سفر رہیں۔یہ انسان کے اس دور کی تخلیق بھی ہوسکتی ہے جب وہ نہ تہذیب وتمدن کے ارتقاء کا سفر شروع کر پایا تھا اور نہ ہی اس کی تعلیم وتربیت کا باقاعدہ آغاز ہونا شروع ہوا تھا۔غرض لوک ادب نادانستہ طور پر سینہ بہ سینہ چل کر علم وادب کی دُنیا کا ایک اہم حصہ بن گیا۔لوک ادب کیا ہے؟ اس کی تعریف کے سلسلے میں مغربی عالموں نے بہت سی آرائیں پیش کی ہیں جن میں بسا اوقات اختلاف بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔مثلاً ذیل میں کچھ ایک تعبیرات وتشریحات کو نمونتاً پیش کیا جاتا ہے۔

انگریزی میں لوک ادب کے لئے Folk Literature اور لوک روایت کے لئے Folk Lore کی اصطلاحیں رائج ہیں۔اب چلیے اُردو میں لوک ادب یا لوک روایت کا جائزہ لینے سے پہلے ہم انگریزی میں Folk Literature کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے۔انگریزی Folk Literature کی اگر بات کی جائے تو اس کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب جرمنی کے دو بھائی مسٹر ولیم اور مسٹر جیکب گریم نے ۱۸۰۷ء میں سینہ بہ سینہ پھیلنے والے اور زبان زد ادب کو اکٹھا کرنے کا کام شروع کیا۔اس ضمن میں اولاً انہوں نے مغربی جرمنی کی زراعت پیشہ لوگوں کی لوک کہانیوں اور گیتوں کو ۱۸۱۴ء تک جمع کیا۔اور بعد میں یہ Grimm's Fairy Tales کے نام سے مشہور ہوئیں ان ہی عوامی قصوں کی پہلی جلد جس میں بچوں اور عورتوں کی کہانیاں شامل تھیں۔۱۸۲۱ء میں Kinder-und Hausmarchen کے نام سے شائع ہوئی۔یہ عوامی ادب کو محفوظ کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔اس کام کو گریم برادران نے نہایت ہی تحقیقی طریقے سے انجام تک پہنچایا۔انہوں نے ان کہانیوں اور قصوں کی اصل کا پتہ لگانے کی بھی کوششیں کیں ان ہی کے اس کام سے متاثر ہو کر بعد میں انگلینڈ کے ولیم جان تھامس نے لوک ادب پر کام کرنے کی شروعات کیں اور اس ادب یعنی لوک ادب کو علم وادب کی ایک باقاعدہ شاخ کے طور پر متعارف کرایا اور اس کے طریقہ کار کے اصول وضوابط بھی مرتب کئے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی خصوصیات کو بھی متعین کیا۔اس کے بعد یورپ اور امریکہ نے اس علم کو باقاعدہ سائنس کا درجہ عطا کیا۔علم وادب کی دُنیا میں لوک ادب کی دریافت ایک اہم دریافت ہے جس کی ابتداء کے حوالے سے اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا میں یوں لکھا گیا ہے کہ:

''عوام کی سینہ بہ سینہ داستانوں اور ثقافت کا نام اصطلاح میں لوک روایت (Folk Lore) کہلاتا ہے۔لوک روایت کی اصطلاح سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں William John Thomas نے رائج کی مگر اس موضوع کا سائنسی بنیادوں پر جس نے مطالعہ کیا وہ جیکب گرم (Jacob Grimm) (۱۷۸۵ء سے ۱۸۶۳ء) تھا۔ایم ملر کے نزدیک لوک روایات فطری اساطیر کے مشاہدے کا نام ہے۔سرلارنس گوم (Gomme) (۱۸۵۳ء سے ۱۹۱۶ء) نے اس کے لئے تاریخی طریقہ اپنایا۔اس کا مطالعہ قدیم محققین تک محدود تھا مگر یورپی رومانیت اور قومیت کے عروج سے اس کی دلچسپی بڑھی''۔[۱]

۱۔اُردو میں منظوم عوامی ادب اور لوریاں (مرتبہ) معززہ ابراہیم قاضی،ص۔۱۷۔

آج کل اگر چہ ہمیں سینہ بہ سینہ چلنے والے قصوں کہانیوں کے کردار محض فرضی معلوم ہوتے ہیں لیکن انہیں قصوں،کہانیوں کے مرکزی کردار یورپ وامریکہ میں ہیرو بن کر ابھرے۔ان میں انگلستان کے رابن ہڈ،اسپین کے سِڈ اور امریکہ کے پالن بنیسن یہاں تک کہ مشرقی ممالک میں یوسف زلیخا،لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا وغیرہ کے کردار منظر عام پر آگئے اور لوک روایت یا لوک ادب میں ایک خاص حصہ بن کر اُبھرے۔بہرحال لوک ادب کے عالمی منظر نامے پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو یوں محسوس ہوگا کہ اس کی روایت بے حد طاقت ور اور اس کے حدود میں نہایت وسعت وجامعیت دیکھنے کو ملتی ہے۔لوک ادب کے موضوعات کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مرد وزن کے تعلقات سے پیدا ہونے والے مختلف اور متنوع رشتے اور ان رشتوں سے پیدا ہونے والے بیشتر نازک مراحل ومسائل دُنیا بھر کے لوک ادب کا محور رہے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ بچے کی پیدائش پر طرح طرح کے رسوم کی ادائیگی،ہجر ووصال کے جذبات واحساسات کا گیتوں کے ذریعے بیان، اخلاقیات،درس وتدریس کی حکایات،جوانی وپیری کی مختلف کیفیات وغیرہ جیسے مسائل ومراحل کا بیان دُنیا بھر کے لوک ادب کا ورثہ ہے۔لوک ادب میں ہم ہجر ووصال کی کیفیتوں کا بیان گیتوں کے ذریعے ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔خردمندی، ضعیفی،پیری اور ناتوانی کے احوال لوک کتھاؤں میں بیان ہوتے ہیں۔اخلاقیات کا درس لوک کہانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔جوانی کی اُمنگیں،بیج بونے،فصل کاٹنے اور جھولا جھولنے وغیرہ جیسے جذبات کی عکاسی لوک گیتوں میں سینہ بہ سینہ عہد تا عہد منتقل ہوتی رہی ہے گویا ہم یہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کی بیشتر شقیں لوک ادب یعنی عوامی ادب کا حصّہ بنتی رہی ہیں جو بذریعہ رقص ،معتقدات وتوہمات اور ضرب المثال قدیم زمانے سے لوک ادب کا حصہ ہیں اس

تعریف کی تصدیق Stith Thompsoson کے ذیل میں دیئے گئے بیان سے کی جاسکتی ہے۔

" The common idea presented in all folk lore is that of tradition,something handed down from one person to another & preserved either by memory or practice rather than written records. It is involved the dances, the scripts and superstitions & the proverbal saying of people everywhere"

۱۔بحوالہ اُردو میں منظوم عوامی ادب اورلوریاں (مرتبہ)مُعزہ ابراہیم قاضی۔ص۔۱۹۔

لوک ادب کے حوالے سے ایسا بھی ہوا ہے کہ کبھی کبھی اسے عمر گذشتہ کی کتاب مان کر عصری ادب سے اس کا رشتہ جھٹلانے کی ناکام کوششیں بھی کی جاتی رہی ہیں۔اگرچہ اس بات میں شک کی گنجائش بھی نہیں کہ لوک ادب کا کافی حصّہ ماضی کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن اس تصویر کے بغیر حال کا تصور بھی دشوار ہے اور اس کا روایت سے وابستہ ہونا بھی محال اور جب ایسی صورت حال ہوتو لوک ادب ماضی میں ہی مقفل ہوجائے گا لیکن لوک ادب کی اہمیت اور افادیت کی بین دلیل تو یہ ہے کہ آج بھی میلے ٹھیلے،تہوار ورسوم،بچے کی پیدائش یہاں تک کہ شادی بیاہ وغیرہ لوک ادب سے مسلسل اپنا رشتہ استوار کیے ہوئے ہیں۔ان تمام چیزوں سے متعلق شعری بول لوک ادب کی میراث ہے۔چونکہ لوک ادب معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے اسے کسی فردِ واحد نے نہیں بلکہ معاشرے نے مل کر پروان چڑھایا ہوتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ معاشرہ درمعاشرہ تعلق بھی لازمی ہوتا ہے ۔انٹرنیشنل ڈکشنری آف ریجنل یورپین اینتھولوجی اینڈ فوک لور International Dictionary of Regional Europion anthology & folk lore سے لئے گئے اس مختصر بیان میں بھی درجہ بالا تعریف کو ہی مختصراً یوں پیش کیا گیا ہے۔

" The common people who share a basic store of old tradition".

یعنی ''وہ لوگ جو قدیم روایات کے بنیادی ذخیرے میں حصہ دار ہیں''۔غرض لوک ادب نے انسانی زندگی کے ابتداء سے پیوسط ہوکر اس کی ارتقاء کے ہر دور میں ساتھ دیا ہے۔یہ ادب سینہ بہ سینہ چل کر انسانی معاشرت کی پہچان کا ذریعہ ہے کیونکہ اسے کسی ایک نقطۂ نگاہ کے انسان نے ذاتی تجربات کی بنا پر تخلیق کر کے دوسروں سے نہیں منوایا بلکہ یہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ چل کر پورے معاشرے کا ترمیم واضافے کے ساتھ تخلیق کردہ ادب ہے جسے انسانی زندگی کے ابتدا سے لے کر ارتقاء کے ہر دور میں ہم رکاب پایا گیا ہے۔اس میں انسانی زندگی کے تمام جذبات ومحسوسات خواہ وہ کھیت کھلیانوں میں گائے گئے گیت ہوں یا کوچہ وبازار کے ترانے ہوں۔پروفیسر محمد حسن نے عمدگی کے ساتھ لوک ادب کے ضمن میں یوں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:۔

''عوامی ادب سے مراد ہے وہ ادب جس کو عوام نے جنم دیا ہو،کوچہ وبازار میں،قریے اور دیہات میں،کھیت کھلیان میں اور عام طور پر اس کا جنم داتا کوئی ایک شخص نہیں ہوتا،پورا معاشرہ ہوتا ہے''۱۔

۱۔بحوالہ اُردو میں منظوم عوامی ادب اورلوریاں (مرتبہ)معزہ ابراہیم قاضی،ص۔۲۰۔

بہر حال لوک ادب کو اگرچہ عوام نے جنم دیا تاہم معاشرے نے اسے وجود بخشا۔لوک ادب اپنی اہمیت کا لوہا دنیاوی سطح پر منوا چکا ہے۔اسے کسی بھی عہد میں دُنیا کے ہر ملک میں قبول کیا جاچکا ہے۔چونکہ لوک ادب قدیم دور کے عوام کے احساسات اور جذبات کا پروردہ ہوتا ہے لہٰذا اس کا مطالعہ کسی بھی قوم کی نفسیات و جذبات اور اس کے رہن سہن کے اصولوں کو سمجھنے میں معاون ومددگار ثابت ہوتا ہے اس کے علاوہ لوک ادب یا عوامی ادب کے مطالعے سے مختلف علوم وفنون کے بنیادی ماخذ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔نیز اس کے مواد کی بھی بازیافت کی جاتی ہے۔مثلاً قدیم دور کی ثقافت،روایات،سماجی زندگی کے اصول وضوابط،لسانیات،فلسفہ وتاریخ وغیرہ۔علاوہ ازیں لوک ادب میں کسی بھی دیہات ،شہر ملک یا نسل کی تہذیبی خصوصیات سے آگہی فراہم کی جاسکتی ہے۔

''یہ ادب (لوک ادب) زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے بچے کی پیدائش سے لے کر موت کی منزل یعنی مہد سے لحد تک پہنچنے کے تمام موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔عوامی/لوک ادب کسی تاریخی واقعے کو بیان نہیں کرتا بلکہ انسان کی ہنستی گاتی اور روتی زندگی کے عملی پہلو کو پیش کرتا ہے۔البتہ یہ ادب جس ملک سے بھی تعلق رکھتا ہے وہاں کے جغرافیائی حالات ومعاشرت اور تمدن کی تصویر بھی پیش کرتا ہے''

۱۔بحوالہ اُردو میں منظوم عوامی ادب اورلوریاں (مرتبہ)مُعزہ ابراہیم قاضی۔ص۔۱۶۔

ہر زبان کے تخلیقی ادب کی ترقی وترویج نیز اس کی رنگا رنگی اور خوبصورتی کا تعلق بڑی حد تک اس زبان کے لوک ادب یا عوامی ادب سے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہوتا ہے یعنی تخلیقی ادب کی بنیادیں بڑی حد تک لوک ادب کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں۔

جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے اُردو زبان کا آغاز وارتقاء ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ہوا اس کی تعمیر وتشکیل میں مختلف قوموں اور مختلف بولیوں کے آپسی میل جول سے ہوا تو ظاہر ہے کہ اس زبان کے لوک ادب میں بھی تنوع اور رنگا رنگی کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔حالانکہ اُردو ادب میں لوک ادب کی تاریخ دُنیا کی دوسری اہم زبانوں کے مقابلے میں اُردو زبان کی طرح ہی کم عمر ہے اسے اگر تلاش کیا جائے تو اسکی بنیادیں زیادہ سے زیادہ تیرھویں صدی عیسوی سے دیکھنے کو ملتی ہیں جب اُردو کا ہیولٰی تیار ہو رہا تھا۔اُردو کی تعمیر وتشکیل میں بہت سی مقامی بولیوں اور زبانوں کے اثرات مرتب ہوئے یہی وجہ ہے کہ اس کا لوک

ادب بھی ان مقامی بولیوں اور زبانوں سے متاثر رہا ہے۔لہٰذا اُردو کے لوک ادب میں بہت بوقلمونی نظر آتی ہے۔اگر چہ دُنیا کی باقی زبانوں کے لوک ادب میں غیر مرتب، دیہقانی اور فطری جذبات اور احساسات کو بنا کسی ادبی سجاوٹ کے جوں کا توں پیش کیا جاتا ہے تاہم اُردو کا مزاج عموماً شہری وشائستہ رہا ہے۔شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ اُردو کے لوک ادب کو وہ مقام نہیں ملا جو کہ اس کو ملنا چاہیئے اور اس چیز کے پیچھے کہیں نہ کہیں یہ وجہ بھی ہوگی کہ اُردو کا لوک ادب مقامی بولیوں سے بہت متاثر رہا ہے۔اُردو کے لوک ادب کی تاریخ خالص اُردو کی نہ ہوگی بلکہ یہ ان بولیوں کے لوک ادب کی تاریخ نے کہیں نہ کہیں مرتب کی ہوگی جن کا اثر اُردو پر عہد بہ عہد دیکھا جا سکتا ہے۔اُردو لوک ادب کا بہ غائر جائزہ لیتے وقت ہم مطالعے کی آسانی کے لئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

ا۔ شعری لوک ادب یا منظوم لوک ادب

۲۔ نثری لوک ادب

آخر الذکر میں داستانیں، قصے، حکایتیں، پہیلیاں کہہ مکریاں، محاورے اور کہانیاں وغیرہ شامل ہیں جبکہ اول الذکر میں بارہ ماسے، چکی کے گیت، میلاد نامے، شادی کے گیت، شہادت نامے اور لوریاں وغیرہ شامل ہیں۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ اُردو میں لوک ادب کی تاریخ خالصتاً اُردو کی نہ ہوگی البتہ مختلف بولیوں کے شامل ہونے سے جو صورت حال سامنے آئی وہیں سے اس کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے تاہم ان بولیوں کی زبان زد داستانیں سینہ بہ سینہ حافظے کی روایت سے یقیناً خالص اُردو کے رنگ میں رنگ گئے ہیں اور اس کی روایت کا ایک اہم حصہ بن گئے ہیں۔اُردو زبان نے اگر چہ عوام میں جنم لیا تاہم اس نے بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں کی آغوش میں تربیت پائی۔جہاں وقت گذاری کے لئے داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ان داستانوں میں مافوق الفطری عناصر، شہری زندگی کی عکاسی، بادشاہوں اور شہنشاہوں کے محیر العقول قصے غرض ان میں Sophistication یعنی نفاست وشائستگی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔اور دیسی زندگی کے کھر درے پن اور دیہقانی کلچر میں بہت کم ملتا ہے جبکہ یہ کلچر ہمیں بھانڈوں کی نقلوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔بھانڈوں کی کارکردگی کو ہماری لوک روایت میں تہذیب کا ایک اہم جز تصور کیا جا سکتا ہے۔شادی بیاہ یا کسی اور خوشی کے موقعہ پر بھانڈوں کو تفریح کے لیے بلایا جاتا تھا۔بھانڈ نت نئ حرکتیں کر کے اور نقل کر کے تفنن طبع کا سامان مہیا کرتے تھے۔ان میں بڑے ذہین فنکار ہوتے تھے۔انعام واکرام کی لالچ میں نت نئے کرتب دکھا کر دُعائیں دیتے اور لوگوں کو محظوظ کرتے تھے اور اگر انعام دینے والے میں بخل کا احساس ہوتا تھا تو فنکارانہ طریقے سے اس کا تیکھا جواب بھی دیتے تھے۔اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر اپنی مشہور ومعروف تصنیف ''گزشتہ لکھنؤ'' میں بھانڈوں کے حوالے سے سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ایک کھیل کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ ایک قدرے نادار نواب نے بھانڈوں کو انعام میں ایک پرانا شال دے دیا۔انہوں نے اسے بشکریہ قبول تو کیا لیکن ساتھ ہی کھیل کچھ اسطرح سے شروع کیا کہ اس شال پر ہم بحکم اللہ جو پیغمبروں کے نام لکھے ہیں وہ پڑھے جائیں۔ایک بھانڈ نے نام پڑھنے شروع کیے اور حضرت آدمؑ کے اسم گرامی سے شروع کر کے حضرت عیسیٰؑ کے نام تک پڑھ لئے۔اس پر دوسرے بھانڈ نے کہا کہ آپ نے حضرت محمدؐ کا اسم مبارک کیوں نہیں پڑھا؟۔اس پر پہلے بھانڈ نے جواب دیا کہ جس زمانے میں اس شال کو بنایا گیا ہے اس زمانے میں حضرت محمدؐ تولد نہیں ہوئے تھے۔اس طرح سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوک کہانیوں میں بھانڈ کس خوبصورتی سے اپنی نفسیات کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتے تھے۔یہ بھی لوک ادب کا خاصا ہے کہ طنزیہ انداز میں کس طرح اپنی ذہنی کیفیت کو سلیقہ مندی سے دکھایا جاتا ہے۔لوک ڈراموں کے ساتھ ساتھ لوک کتھاؤں اور کہانیوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔دادیوں اور نانیوں کی سبق آموز کہانیاں اور حکایتیں بچوں کی ذہنی تربیت اور ذہنی نشو ونما کا ایک بہترین ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔خواہ وہ طوطا مینا کی کہانی ہو، نیک دل بادشاہ کی کہانی ہو یا بدکردار راکشس کی۔غرض ان کہانیوں میں نیکی اور بدی میں فرق، جھوٹ پر سچ کی فتح کو ذہن نشین کرایا جاتا تھا۔اس کے علاوہ شکار نامے، چکی نامے اور محاورے و کہاوتیں وغیرہ بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے جہان معنی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتے تھے۔ان کو لوک ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ان میں صوفیوں سے منسوب گہرائی اور معنی خیزی کا ایک سمندر موجزن ہوتا ہے۔اگر چہ یہ ظاہری طور پر معنویت سے ماورا نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندروں میں فہم ادراک کا ایک خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

اسی طرح منظوم لوک ادب لوک گیت کہلاتا ہے۔لوک گیت کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ زبان کی، زبان کے معرض وجود میں آتے ہی بچوں کی تربیت کے واسطے نانی دادی نے گیت سنانے شروع کر دیئے ہونگے، ماؤں نے لوریاں گنگنائی ہونگی۔آج کل kindergarten (گلزار اطفال) میں سنانے والے نرسری گیت یقیناً انہیں دادی نانی کے گیتوں اور لوریوں سے ماخوذ ہیں۔بقول رابندر ناتھ ٹیگور:

"The child today is just as new as delicate, as sweet & foolish, as he was on the first of all days. This is because a child is nature's creation while a grown up man is fabricated largely by himself, nursery rhymes, being child literature, are natural creations".

ا۔بحوالہ: اُردو میں لوک ادب (مرتبہ) پروفیسر قمر رئیس۔ص۔۳۸

لوک گیتوں میں ادب اطفال کے بے شمار سبق آموز موضوعات ملتے ہیں۔نہ صرف یہ بلکہ ان گیتوں میں عوام نے اپنے جذبات واحساسات کے تلخ وشیریں موضوعات کو نہایت خوبصورتی سے اظہار کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

ان میں پندونصائح، دُکھ درد، وارداتِ قلبی کے ایسے مناظر نظم کئے ہیں کہ عقل دھنگ رہ جاتی ہے اور اس سے اُردوادب کے دامن کو کشادگی بخشنے کے لئے عالموں اور ادیبوں نے دریافت کر کے اُردوادب میں اہم کارنامے سرانجام دیئے ہیں اس ضمن میں پروفیسر قمر رئیس کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں۔

''اطہر فاروقی اور بعض دوسرے عالموں نے ایسے سینکڑوں گیت جمع کیے ہیں جو جنگ وجدل اور تاریخی واقعات سے متاثر ہو کر عوام نے تصنیف کئے اور جن میں ان کے دُکھ درد کی کہانیاں چھپی ہیں۔مثلاً جب اورنگ زیب کی دکنی مہمات کے زمانے میں شمالی ہند کے سپاہی برسوں اپنے بیوی بچوں سے جُدا رہے تو ایک عورت اپنی سہیلی سے کہتی ہے:

''بیٹھی رہو کرار سے من موں راکھو دھیر
اب کے بچھڑے تب ملیں جب بوہریں عالمگیر
بنتی کرواُس سائیں کی کہ بوہریں عالمگیر''

۱۔اُردو میں لوک ادب مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس ص(۷)۔

لوک گیت کی ایک اور اہم قسم لوری ہے۔لوری لاڑ یا لار سے مشتق ہے یعنی وہ پیارے سریلے بول جو ماں کے بچے کو سلاتے وقت ماں کی ممتا سے پھوٹ پڑتے ہیں۔اور وہ دھیمی گنگناہٹوں میں بامعنی الفاظ کے موتی پرو کر منظوم پیرائے میں ادا کرتی ہے۔لوری ماں کی ممتا اور بے لوث محبت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ لوریوں میں بامعنی موضوع پوشیدہ ہوتے ہیں۔کسی میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ واولیاء کرام سے دُعائیں اور منتیں کی جاتی ہیں۔کبھی مصائب اور بلاؤں سے محفوظ ہونے کی خواہش اور کبھی نیند میں میٹھے سپنے کی آمد کی امیدیں کی جاتی ہیں۔اُردو میں لوری کی اہمیت کا احساس پروفیسر قمر رئیس کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''اُردو زبان بھی ایسے گیتوں سے مالامال ہے ۔مثال کے طور پر ایسی سینکڑوں لوریاں ملتی ہیں جن کی شیرینی ،خوش آہنگی اور جذبات کی معصومانہ دلکشی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔۔۔لوریوں کے ذریعہ بچہ پہلی بار اپنی مادری زبان کی مٹھاس اور موسیقی سے مانوس ہوتا ہے۔''

۱۔اُردو میں لوک ادب (مرتبہ) پروفیسر قمر رئیس (پیش لفظ)۔ص ۹۔۸)۔

ذیل میں چند لوریوں کے اشعار نموتاً ملاحظہ ہوں۔

نورِ محمد صلی اللہ
لا الٰہ الا اللہ
ہے اسلام تیرا مذہب
اور خدا ہے تیرا رب
تیرے آقا شاہِ عرب
تیرا زیورِ علم و ادب
حسبی ربی جل اللہ
مافی قلبی غیر اللہ

نورِ محمد صلی اللہ
لا الٰہ الا اللہ

☆

چندا ماما دُور کے
بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں
ہم کو دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ
چندا ماما گئے روٹھ
پیالی آئی اور
چند ماما آئے دوڑ

☆

سوجا میرے پیارے سوجا
میری آنکھ کے تارے سوجا
کلیاں سوئیں پتے سوئے
تتلی سوئی بھنوریں سوئے
مینا سوئی طوطے سوئے
تو بھی میرے پیارے سوجا
میری آنکھ کے تارے سوجا

اُردو زبان کے دامن کو وسعت دو کشادگی دینے میں لوک گیتوں کی بعض دوسری اصناف کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔لوک گیتوں کی جن اصناف کا زبان اُردو میں بڑا ہی وقیع سرمایہ موجود ہے ان میں چکی کے گیت، بارہ ماسے، دہے! (لوک مرثیے) ،ساون کے گیت، مہندی کے گیت، زاریاں، دکھڑے، سیاسی عوامی گیت، مذہبی عوامی گیت، ڈھولک کے گیت، رُخصتی کے گیت، گودبھرائی کے گیت وغیرہ وغیرہ اُردوادب میں ایک بہت بڑا سرمایہ ہے۔اگرچہ لوک گیت اُردو یا فارسی کی مقررہ بحروں میں مکمل طور پر پورے نہیں اُترتے کیونکہ یہاں آوازوں کے پھیلنے اور سکڑنے کی صورت درپیش ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اسی شعری سرمایہ کو ہماری شاندار شعری روایت کا نقش اول قرار دیا جاسکتا ہے۔ لوک گیت خواہ وہ کسی بھی موضوع سے تعلق رکھتے ہوں کسی ایک شاعری کے مرہونِ منت نہیں ہوتے۔عروض کی پابندیوں سے ماورا بحرووزن کا سہارا لئے بنا آزاد مضامین پروان چڑھنے والے جذبات واحساسات سے معمور ہوتے ہیں۔ان میں شاعرانہ خصوصیات کے ادارک کے بغیر سادگی اور سچائی کے ساتھ قلبی جذبات کی فراوانی کی عمدہ مثالیں دیکھی جاسکتی ہے۔اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا میں لوک گیت کی مناسبت سے یہ بیان ملاحظہ کیجئے:۔

''لوک گیت عوامی زندگی کا ایسے ہی عکس ہیں جن میں نمائشی عظمت

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

''شہادت کا رنگِ بیاں''

اے طارق عزیز

ایوب خاور
(لاہور)

مائے ہر دِلعزیز
اے طارق عزیز

اے ہر دِلعزیز
اے طارق عزیز
ترے فن شناسوں، ترے قدر دانوں کے دل بجھ گئے ہیں
ترے جانے سے
وہ دِل
جن میں تیری کھنکتی ہوئی
اور لب و لہجے کی ست رنگی میں نہائی ہوئی تیری آواز کی تازگی
مائکروفون سے ریڈیو اور پھر ٹیلی وژن کے پردے سے ہو کر
دلوں میں اترتی تھی
اور دیکھنے والوں اور سننے والوں کو تیرے سلامِ محبّت کی تاثیر میں
گھیر لیتی تھی

اب.........
اب وہ خاموش ہے
شہرِ خاموش میں تازہ مٹی کی پھولوں بھری ڈھیری کے نیچے خاموش ہے
اے ہر دلعزیز
اے طارق عزیز
میرے ہفت رنگ
دانش سے لبریز طارق عزیز
میں سن رہا ہوں
فقط میں نہیں
جتنے بچے جواں اور بوڑھے ترے نام کے اور کام کے معتقد ہیں
وہ سب سن رہے ہیں
سنتے رہیں گے
ترا دُکھ بھی اور تیرے ہمزاد کا دکھ بھی سنتے رہیں گے

قیامت تلک

کرب و بلا کے تلاطم میں لپٹے ہوئے مرثیوں میں
حسینی شہادت کا رنگِ بیاں
تیری آواز میں
کون بھولے گا طارق عزیز!
اے ہر دلعزیز
تیری آواز اِس مُلک میں
اور اِس مُلک کی سرحدوں کے اُدھر بسنے والے ہر اِک دِل کی آواز تھی
ہر اِک دِل کی آواز ہے
ایسی آواز مرتی نہیں
جس کے شدھ نام کے پہلے حرفوں ہی میں
آنے والے زمانوں کے معنی دھڑکتے ہیں طارق عزیز
ایسی آواز مرتی نہیں

تیری آواز زندہ ہے
زندہ رہے گی
آنے والے زمانوں کے اچھے دنوں کی خبر
ہم کو دیتی رہے گی

ربِّ کعبہ
ذرا منتقل کر ہمارے دلوں میں بھی وہ جذبۂ مستقِل
منتقِل کر
کہ جب ہم بھی اپنے وطن کے بقا کے لیے کوئی نعرہ لگائیں
تو وہ طارقیت بھی ہم سب کے لہجے میں
اور دِل میں گونجے جسے سُن کے کانپ
اُٹھیں دُشمن کے دِل
اے مرے صاحبِ جذبۂ مستقِل
اے ہر دلعزیز
اے طارق عزیز
آفریں .... آفریں
ہم کبھی بھی تجھے بھول سکتے نہیں

can't breathe

ڈاکٹر نزہت شاہ
(نیویارک)

تھا چاروں سمت سناٹا
شہر تھا گویا ویرانہ
خموشی کا تھا اک عالم
نہ ہی رنگین تھا موسم
وبأ کا خوف چھایا تھا
تھے بند کھڑکی و دروازا
اچانک !!!!!
پھر کہیں سے
اک صدا کانوں سے ٹکراتی.....
!!!!!!can't breathe!
ارے ٹھہرو
ذرا دم لو
مجھے بھی کچھ سنبھلنے دو
گرفت ڈھیلی ہی کردو تم
نکل جائے گا میرا دم
رکی ہے سانس
بڑھی دھڑکن
کہ دل ہے بیٹھتا جائے
سنو!!
کہ — سانس نہیں آئے
مجھے بھی حق ہے جینے کا
جہاں کے سنگ چلنے کا
رحم کردو!!!!
رحم کردو!!!
کہ نہ اب سانس لے سکتا

نا ہی اب اور جی سکتا
مگر ظالم
ہائے ۔۔۔ ظالم
کہ اسکی ایک نا مانا
اسے خاموش کر ڈالا
زباں اس کی ہوئی جو بند
فضا میں شور سا اٹھا
دھواں ہے ۔۔۔
بس دھواں ہی ہے
بشر ہر اک نسل کا اب
نکل راہوں پہ آیا ہے
کوئی محشر اٹھایا ہے
سوال لب پہ یہ آیا ہے
کہ جانیں اتنی ارزاں ہیں؟
غم و غصّے کی بارش ہے
سبھی کی اک گزارش ہے
ختم کردو عداوت کو
طوالت دو محبت کو
چلو آگے بڑھو
بلند اپنی کرو آواز
جگادو منصفوں کو آج
بتادو ہم ہیں دیوانے
یا!
پوچھو!!
تم کو دیوانے؟؟؟

❍

کہاں دورِ سرمایہ داری گیا

کہاں دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ گیا یا مداری گیا!
ابھی تو وہی سیم وزرتن پہ ہے
تماشہ ابھی اپنے جوبن پہ ہے
نظر تو حقیقت میں خیرہ ہے اب
دہن سب کا حیرت نے چیرا ہے اب
یہ بھیڑ اور بڑھتی چلی جائے گی
ابھی عقل دھوکے نئے کھائے گی
کھلاڑی تو وہ ہاتھ دکھلائیں گے
تماشے تماشائی بن جائیں گے
ابھی فرق سارا بدل جائے گا
سب عالم ہی کرتب میں ڈھل جائے گا
چنگھاڑیں ہیں جو، ہوں گی سرگوشیاں
بجائیں گے سب اس قدر تالیاں
ذرا دیر میں سب کی دہلے گی روح
ابھی اور آئیں گے طوفانِ نوح
ابھی آنکھیں بھرلیں گی خود میں دھواں
لگائے گی ہونٹوں پہ قدغن، زباں
بدل جائیں گے نام اعداد سے
مگر کھیل نکلے گا اُس ہاتھ سے
تو یہ بازیاں بھی پلٹ جائیں گی
یہ بے روح بھیڑیں بھی چھٹ جائیں گی
چڑھا ہے، سو پانی اُتر جائے گا
گھروندا ہے، یکدم بکھر جائے گا
یہ چکّر کسی سے بھی ٹلتا نہیں
سدا کوئی سکّہ بھی چلتا نہیں

○

بند دروازے

اوپر جاتی آخری سیڑھی
سب دروازے
بند، مقفّل
کس دروازے پر دستک دوں
دستک دوں یا واپس پلٹوں
آخر کب تک
ہاتھ بڑھائے
نیچے جاتا زینہ دیکھوں

○

فیصل عظیم
(کینیڈا)

''وہ لمحہ''

(قلوپطرہ سے منتخب)

ابدال بیلا
(اسلام آباد)

وہ عجیب دن تھے
دور سے وہ آئی تھی
اجنبی تھی میرے شہر میں
اُسے میرے شہر سے اُنس تھا۔
کہتی مجھے گھماؤ
شہر کی ہر گلی، ہر رستہ ہر شاہراہ پہ مجھے لے کے جاؤ۔
شہر میں جو پرانی یادگاریں تھیں
وہ سب کو دیکھ کے اپنے لمحے یادگار کرنا چاہتی تھی
بس
میں اُس کو لے لے کر پھرتا رہا۔
ابھی تیسرا دن تھا
کہ اُس نے نگاہیں موڑ لیں
میں اُس کو تاریخ کے جھروکوں کی طرف لے کے جاتا،
وہ مجھے تکتی رہتی۔
میں کہتا، یہ دیکھ
یہ تاریخی کتبہ ہے۔
وہ میرا چہرہ پڑھے جاتی۔
میں جگمگاتی روشنیوں پہ اسے لے کر چلتا
اونچی بلند عمارتوں پہ اس کو لے کر چڑھتا
وہ ہر طرف سے منہ موڑے
میرا ہاتھ پکڑے
مجھے تکتی رہتی۔
تب ایک دن میں نے پوچھا
تو تاریخی شہر دیکھنے آئی تھی
اب یہ سب تاریخ پڑھ لو
بولی۔
کچھ دیر سوچتے ہوئے
آنکھوں میں چاند تارے جگمگا کے
میرے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں یوں لے کے
جیسے کوئی تاریخی دستاویز پکڑی ہو
بولی
مجھے تاریخ لکھی ہوئی پرانے وقتوں کی نہیں تکنی۔
پھر، میں خشک ہونٹوں اور دھڑکتے دل سے اسے دیکھ کے بولا۔
بولی۔
میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے پہ
ابھرتی
دبتی
طوفان مچاتی
سانسوں سے منہ کھولے
خاموش پہاڑوں میں زلزلے سرسرا کر
آنکھوں میں ستاروں کی چمک لا کر
آہستگی سے بولی۔
مجھے لکھی تاریخ سے کیا لینا دینا۔
پھر میرے ہاتھ کو اپنی چاند بنی آنکھوں پہ رکھ کے بولی
مجھے تو تاریخ بننا ہے
تمہاری آنکھوں میں بن دیکھے بھی دکھنا ہے
بولو
میں کیا کہتا
مجھے علم تھا
وہ تاریخ ساز لمحہ تھا۔

○

مہلت

انجم جاوید
(لاہور)

دن بھر کے تھکے ماندے پاؤں
گھر کی چوکھٹ پر رکھتے ہی
شدّت سے یہ خواہش ابھری
قدموں میں کوئی پھول بکھیرے
بوجھل بوجھل سی پلکیں
کچھ اور بھی بوجھل ہو جائیں
کوئی خواہشِ جاں کہتی ہے
ٹھنڈی چھاؤں جیسا خواب
کوئی ان آنکھوں میں بھر دے
کوئی سوکھے زرد گلاب کو اب شبنم شبنم کر دے
آئینے میں کوئی چہرہ، کوئی عکس ٹھہر جائے
لیکن! دنیا اپنے ہی اعمال کی کھیتی ہے
زندگی!
ان آسائشوں کی کب مہلت دیتی ہے
❍

سفر۔۔۔بے چہرگی کا

سلیم انصاری
(جبل پور)

میرے مالک
تازہ سفر کی کون سی یہ منزل ہے جہاں پر
میری بیٹی کی آنکھوں میں
خواب نہیں اندیشے ہیں
میرے بیٹے کے لفظوں میں
مستقبل کی دھندلی دھندلی تصویریں ہیں
میری بیوی کے چہرے پر
مجھ سے بچھڑ جانے کا خوف چمکتا ہے
میری نظر میں
جلتی بجھتی امیدوں کے سائے ہیں
میرے مولا
کب تک ہم کو
عدم تحفظ کا آسیب ستائے گا
کب تک یوں ہی
بے سمتی کے دشتِ سفر میں
چلتے رہیں تو
شہرِ یقیں تک پہنچیں گے
❍

2018 کے بعد سے، 5G ہر ایک کے لبوں پر ہے۔ لیکن ہم شرط لگاتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو معلوم ہے کہ 5 جی کے بارے میں کیا ہے۔ اگر اوسط صارف سے پوچھیں تو، وہ کہیں گے کہ یہ 4 جی کی تیز رفتار ہے۔ جبکہ 5G ٹکنالوجی آپ کے خیال سے کہیں زیادہ ہے۔

1 جی:

اس سے مراد وائرلیس ٹیلیفون ٹیکنالوجی کی پہلی نسل یعنی موبائل مواصلات ہیں۔ یہ ینالاگ سگنلز کا استعمال کرتا ہے اوراس کی رفتار 2.4kbps ہے۔ کوئی اسکرین والا فون کال نہیں کرسکتا تھا۔

2 جی (جی پی آر ایس):

اس سے مراد دوسری نسل کی موبائل ٹکنالوجی ہے۔ اس میں ڈیجیٹل ٹیلی مواصلات کے معیارات استعمال کیے گئے ہیں۔ ڈیٹا کی شرح 56-114kbps کے درمیان ہے۔ 2 جی صوتی مواصلات کی ڈیجیٹلا ئزیشن کا احساس کرتا ہے، اور فیچر فون چھوٹی اسکرین کے ساتھ ٹیکسٹ میسج بھیج سکتے ہیں۔

3G(WCDMA/CDMA2000/TD-SCDMA):

تیسری نسل کی موبائل مواصلات کی ٹیکنالوجی سے مراد ہے۔ یہ 384kbps کی ڈیٹا کی شرح فراہم کرتا ہے۔ لہذا آپ آسانی سے ویب سائٹس کو براؤز کر سکتے ہیں اور موسیقی کو اسٹریم کر سکتے ہیں۔

4 جی:

اس سے مراد موبائل ٹکنالوجی کی چوتھی نسل ہے، جسے ایل ٹی ای (لانگ ٹرم ارتقاء) کہا جاتا ہے۔ 1G-3G کے مقابلے میں، ان اقسام میں یہ بہترین ہے۔ اور یہ گھر یا دفتر میں وائی فائی کی طرح مستحکم اور تیز ہے۔

5G پانچویں نسل کی موبائل مواصلات کی ٹیکنالوجی اور 4G سسٹم کی توسیع ہے۔ 13 جون، 2018 کو، سان ڈیاگو 3 جی پی پی میٹنگ نے پہلا بین الاقوامی 5 جی معیار طے کیا۔ سابقہ کے مقابلے میں، 5 جی نیٹ ورک کی تین اہم خصوصیات ہیں۔ انتہائی تیز رفتار (ای ایم بی بی)، انتہائی بڑی گنجائش (ایم ایم ٹی سی)، اور انتہائی کم تاخیر (یو آر ایل ایل)۔ تیز رفتار ہم سب جانتے ہیں کہ مواصلت برقی مقناطیسی لہروں پر انحصار کرتی ہے۔ اور برقی مقناطیسی لہروں کے تعدد وسائل بہت محدود ہیں۔ مختلف تعدد کی مختلف رفتار ہوتی ہے۔ تعدد وسائل کاروں کی طرح ہوتے ہیں۔ زیادہ تعدد اور زیادہ کاریں، اسی وقت زیادہ سے زیادہ معلومات کو لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ لہذا، زیادہ تعدد، بینڈوتھ، اور تیز رفتار۔ فی الحال، ہم 4G کے لئے کم تعدد والے بینڈز کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے فوائد اچھی کارکردگی اور وسیع کوریج ہیں، جو بیس اسٹیشنوں میں آپریٹر کی سرمایہ کاری کو مؤثر طریقے سے کم کرسکتے ہیں اور رقم کی بچت کرسکتے ہیں۔ لیکن نقصان یہ ہے کہ اگر اور بھی زیادہ لوگ ہوں تو، ڈیٹا منتقل کرنے کی 'سڑک' تنگ ہوگی۔ اگرچہ موجودہ ٹیکنالوجی کو بہتر بنایا گیا ہے، لیکن شرح ابھی تک محدود ہے۔ جب کہ 5 جی اعلی تعدد والے بینڈوں کا استعمال کرتا ہے، اعلی تعدد کا استعمال نہ صرف کم تعدد والے وسائل کی تناؤ کو دور کرسکتا ہے بلکہ چونکہ وہاں بھیڑ کا رجحان نہیں ہے، لہذا 'سڑکیں' وسیع تر ہیں اور بینڈوتھ کی شرح میں اضافہ کیا گیا ہے۔

اعلی تعدد مواصلات کی تشہیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے it، اسے بڑے پیمانے پر اینٹینا (بڑے پیمانے پر MIMO) پر انحصار کرنے کی ضرورت ہے۔ MIMO کا مطلب ہے 'ایک سے زیادہ ان پٹ ایک سے زیادہ آؤٹ پٹ'۔

اعلی تعدد وسائل میں بھی ایک مختصر طول موج ہوتی ہے۔ اینٹینا ڈیزائن میں، اینٹینا کے سرے اور ان کے درمیان فاصلہ بہت کم ہوسکتا ہے، اور اینٹینا کی صف کو تھوڑی سی حد میں ضم کیا جاسکتا ہے۔ اینٹینا عناصر کی تعداد میں اضافے سے اضافی فائدہ ہوسکتا ہے۔

ان خصوصیات کے تحت، 5G 10GBS تک کی اعلی کوائف نامہ کی شرح فراہم کرتا ہے۔ 4 جی کی چوٹی کی شرح تقریباً 100 ایم بی پی ایس ہے، اور رفتار میں 100 گنا اضافہ ہوا ہے۔ مثالی طور پر، صارفین سیکنڈ میں 1GB HD ویڈیو ڈاؤن لوڈ کرسکتے ہیں۔ 4K ویڈیو کیلیئے کم سے کم ڈاؤن لوڈ کی رفتار 25MBS کی ضرورت ہے۔ 4 جی اس ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا۔ لہذا، 5G ماحول کے تحت 4K براہ راست ویڈیو نشریات ممکن ہے۔ اس کے علاوہ، وی آر/اے آر میں بینڈوتھ کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ اور VG جیسے ورچوئلائزیشن کے احساس کے لی 5G for ممکن ہے۔

اعلی صلاحیت

اعلی تعدد ملیمیٹر لہریں ٹرانسمیشن کی شرح میں اضافہ کرسکتی ہیں۔ لیکن اعلی تعدد سگنلوں کو دیواروں سے گزرنا مشکل ہے۔ جیسے جیسے ٹرانسمیشن کا فاصلہ بڑھتا ہے، ٹرانسمیشن کی شرح 4 جی کے کم تعدد والے بینڈ کے مقابلہ میں تیزی سے نیچے آجائے گی۔ موثر اور مستحکم ٹرانسمیشن کی شرح کو یقینی بنانے کے لیے stable، مستحکم سگنل ٹرانسمیشن کے لئے مزید بیس اسٹیشنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ 5 جی ٹکنالوجی مائکرو بیس اسٹیشنوں کو چھوٹے سائز اور کم توانائی کی کھپت کے ساتھ متعارف کراتی ہے۔ اس طرح کے بیس اسٹیشن شہر میں کہیں بھی نصب اور تعینات کیے جاسکتے ہیں اور اسٹریٹ لائٹس، سگنل لائٹس، شاپنگ مالز، مکانات

وغیرہ میں انسٹال کیے جاسکتے ہیں۔ ہر بیس اسٹیشن دوسرے بیس اسٹیشنوں سے سگنل وصول کرسکتا ہے اور کسی بھی مقام پر صارفین کو ڈیٹا بھیج سکتا ہے۔ سگنل کا استقبال یکساں ہے۔ اٹھانے کی گنجائش بڑی ہے۔ اور اعلی فریکوئینسی بینڈ میں طویل فاصلے پر ٹرانسمیشن کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ہر جگہ نیٹ ورک تشکیل دیا گیا ہے۔ اس سے چیزوں کا انٹرنیٹ بھی ممکن ہوتا ہے۔ 5 جی نیٹ ورک میں، عام 3 سی مصنوعات جیسے اسمارٹ فونز اور پی سی کے علاوہ، مزید ٹرمینل آلات بھی نیٹ ورک میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں، ہم سمارٹ فرنیچر کی مصنوعات کا ذکر کرسکتے ہیں جن کو نیٹ ورک (اسمارٹ ساکٹ، سمارٹ ایئر کنڈیشنر، سمارٹ فرج اور اسمارٹ وریبل ڈیوائسز) کے ذریعے کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ چیزوں کے انٹرنیٹ کے میدان میں، اطلاق کے مختلف منظر نامے میں نیٹ ورک کی مختلف ضروریات ہوتی ہیں۔

کچھ ٹرمینل آلات میں تیزی سے آراء پر کارروائی کرنے کے لئے بڑی تعداد میں ریئل ٹائم ڈیٹا کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ کچھ ٹرمینل آلات میں صرف تھوڑی مقدار میں ڈیٹا یا اعداد وشمار کی منتقلی کی کچھ مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو تیز تر منتقلی کی رفتار کی ضرورت نہیں ہے، اور یہاں تک کہ ایک یا دو ماہ میں تھوڑی مقدار میں ڈیٹا بھی اپ ڈیٹ کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر، پانی کے میٹروں اور بجلی کے میٹروں کے استعمال کی معلومات دکھائیں۔ لہذا، 5 جی نیٹ ورک میں، یہ ضروری ہے کہ آلہ ٹرمینل کی نیٹ ورک کی ضروریات کو خود بخود پہچان سکے اور مختلف نیٹ ورک بینڈوتھ استعمال کریں۔ جب تھوڑی سی ڈیٹا منتقل ہوتا ہے تو، 5G کی اسمارٹ شناخت میں ایک تنگ بینڈ نیٹ ورک استعمال ہوتا ہے جو اعداد وشمار کو منتقل کرنے کے لئے کم توانائی استعمال کرتا ہے، اس طرح توانائی کی کھپت اور استعمال کو مؤثر طریقے سے کم کرتا ہے، اور طویل مدتی کارروائی کے لئے کم استعمال والے ٹرمینل سامان کی استعمال کو یقینی بناتا ہے۔

کم تاخیر

4 جی کے مقابلے میں، 5 جی کو کافی حد تک بہتر بنایا گیا ہے اور موجودہ تکنیکی فن تعمیر کو ایڈجسٹ کیا گیا ہے۔ انتہائی کم تاخیر کو حاصل کرنے کے لیے 5، 5G ایکسیس نیٹ ورک، بیئرر نیٹ ورک، کور نیٹ ورک اور بیک بون نیٹ ورک کے تمام پہلوؤں سے مل کر کام کرے گا۔

جبکہ ہوائی انٹرفیس کے ٹرانسمیشن میں تاخیر کو بہت کم کرتے ہوئے، فارورڈنگ نوڈس زیادہ سے زیادہ کم ہوجاتے ہیں اور نوڈس کے درمیان فاصلہ کم کیا جاتا ہے۔ نیٹ ورک سلائسنگ ٹکنالوجی جسمانی نیٹ ورک کو N منطقی نیٹ ورکس میں تقسیم کرتا ہے تاکہ درخواست کے مختلف منظر ناموں کو اپنایا جاسکے۔ 4 جی نیٹ ورک ایپلی کیشن سرورز مرکزی کمپیوٹر کے کمرے میں مرتکز ہیں، جو ٹرمینل سے بہت دور ہے، اور وسط میں متعدد ٹرانسمیشن نوڈس سے گزرنے کی ضرورت ہے۔ 5G ایکسیس کمپیوٹنگ ٹکنالوجی کو رسائی نیٹ ورک اور انٹرنیٹ خدمات کو گہرائی سے مربوط کرنے، رسائی نیٹ ورک کے دہانے پر کمپیوٹنگ، پروسیسنگ اور اسٹوریج کے افعال کے ساتھ کلاؤڈ کمپیوٹنگ کے سامان کو تعینات کرنے، موبائل میں آسان کلاؤڈ کی تعمیر، اور ایک انفارمیشن ٹکنالوجی سروس ماحول اور کلاؤڈ کمپیوٹنگ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ڈیٹا منتقل کرنے کے دوران فارورڈنگ اور پروسیسنگ کا وقت کم کرسکتا ہے، اور اختتام تاخیر میں تاخیر کو کم کرسکتا ہے۔

کم تاخیر سے ڈرائیور بغیر گاڑی چلانے کا کام ممکن ہوتا ہے۔ آیئے اس معاملے پر ایک نظر ڈالیں: ایک کار 60 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے۔ ایمرجنسی میں بریک فاصلہ 50 ملی میٹر ہے، 10،1m ملی میٹر 17 سینٹی میٹر، اور 1 ملی میٹر 17 ملی میٹر ہے۔ 4G نیٹ ورک میں تاخیر تقریبا 50 ملی میٹر ہے۔ بریک فاصلہ 50 ملی میٹر میں تقریبا 1 میٹر ہے۔ زندگی اور موت کے مابین یہی فرق ہوسکتا ہے۔ لہذا 5G نیٹ ورک میں 1 ملی میٹر تک کم تاخیر سے خودمختار ڈرائیونگ کے لئے سڑک پر محفوظ ڈرائیونگ کو یقینی بنانا ممکن ہوجاتا ہے۔ 5G کونس اور پیشہ Cons کے 5G اچھی لگتی ہے۔ لیکن حقیقت میں، اب بھی بہت سارے شعبے موجود ہیں، جہاں سامان فروش، ٹیلی کام کمپنیاں، اور یہاں تک کہ حکومت کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

5G ذیلی 6GHz فریکوئنسی بینڈ اور ملی میٹر ویو (ملی میٹر ویو) فریکوئنسی بینڈ میں شامل ہے۔ 4G ٹکنالوجی 6GHz سے نیچے تعدد بینڈ میں ایک تکمیلی ٹکنالوجی کی ترقی اور ترقی کرتی رہے گی۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ ٹیلی مواصلات کی صنعت 5 جی کی ترقی کی وجہ سے 4G کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کرے گی۔ اس کے برعکس، صنعت نے اظہار کیا ہے کہ وہ اعتدال کے ساتھ کچھ 4G بیس اسٹیشنوں کو دوبارہ تعمیر کرے گی اور نظام سگنل سوئچنگ کو مستحکم کرے گی۔

چونکہ 5 جی اعلی تعدد ملیمیٹر لہروں میں آسانی سے مداخلت ہوتی ہے، لہذا ایک خاص تعداد میں کوریج کی شرح کو حاصل کرنے کے لئے بڑی تعداد میں بیس اسٹیشنوں کو تعینات کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر، جاپانی حکومت بیس اسٹیشنوں کی کثافت بڑھانے کی امید میں، ٹریفک لائٹس اور اسٹریٹ لائٹس پر 5 جی بیس اسٹیشن لگانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ چھوٹے خلیات پہلے سے زیادہ اہم ہیں۔ 5 بڑے مائکرو بیس اسٹیشنوں کی ترقی جو "بڑے پیمانے پر "MIMO اور "بیمفارمنگ" کے ساتھ ہیں وہ تکنیکی مشکلات پر قابو پانے اور ایک خاص سطح کو حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

پیشہ

5 جی وائرلیس انٹرنیٹ ٹیکنالوجی ہے۔ سب سے واضح خصوصیت اس کی انتہائی تیز رفتار ہے۔ یہ عام طور پر 4G سے 20 گنا زیادہ اور 100 بار تک ہے۔ یہ بہت ہی کم وقت میں بڑے پیمانے پر ڈیٹا منتقل کرسکتا ہے، جس میں تاخیر کو بہت کم کیا جاتا ہے، اور یہ فرق اتنا بڑا ہے کہ بنیادی تبدیلیاں لائیں۔

روزانہ کی ایپلی کیشنز میں، موجودہ 4G دراصل موروثی ٹکنالوجی کے ذریعہ محدود ہے، بینڈوتھ محدود ہے، اور استعمال میں بہت سی پابندیاں ہیں۔ مثال کے طور پر، بڑے محافل موسیقی یا عوامی اجتماعات میں، جب ایک ہی وقت میں دسیوں ہزار افراد آن لائن ہوتے ہیں تو، انٹرنیٹ کی رفتار بہت سست ہوجائے گی۔ 5 جی کی بڑی بینڈوتھ اس مسئلے کو حل کرسکتی ہے۔

جدید لوگوں کو آڈیو اور ویڈیو کے معیار کے لیے higher اعلیٰ اور اعلیٰ ضروریات ہیں۔ نیٹ فلکس اور دیگر اسٹریمنگ پلیٹ فارمز پر بہت سارے پروگراموں میں 4K انتہائی اعلیٰ امیج کوالٹی کے اختیارات ہیں۔ تاہم، 4 جی کی ناکافی رفتار کی وجہ سے، بہت کم لوگ دیکھنے کے لئے ڈیٹا اسٹریمنگ کا استعمال کریں گے۔ 5 جی اس مسئلے کو بھی حل کرتا ہے۔

ایسے کھیل بھی موجود ہیں جن کو تیز رفتار نیٹ ورک کی رفتار اور دیر درکار ہے۔ موجودہ الیکٹرانک گیم ڈیزائن بہتر اور بہتر ہورہا ہے، اور صلاحیت بڑھتی جارہی ہے۔ گوگل کا اسٹریمنگ گیم پلیٹ فارم اسٹڈیا اشتہار دیتا ہے کہ اضافی گیم کنسول خریدنے یا گیم ڈاؤن لوڈ کرنے اور انسٹال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ 5 جی وقت پر آگیا ہے۔ 5 جی ٹکنالوجی کیوں زیادہ استعمال نہیں کی جاتی ہے؟ اگلی جی نیٹ ورک کوریج کی رفتار تیز ہے، لیکن مسلسل کوریج ناکافی ہے۔

ناکافی 5G نیٹ ورک کوریج، یہاں تک کہ اگر لوگوں کے لئے 5G کے استعمال میں رکاوٹ نہیں ہے، تو یہ ایک ایسا عنصر بن گیا ہے کہ جب صارفین 5G میں اپ گریڈ کرتے ہیں تو کوئی بھی نظرانداز نہیں کرسکتا ہے۔ 1.0G5G دور میں داخل ہونے کے بعد، SA5G ٹیکنالوجی کی تیز رفتار پختگی اور نئی بنیادی ڈھانچے کی حکمت عملی کے فروغ کے ساتھ، آپریٹرز لامحالہ آئندہ دو سالوں میں 5G نیٹ ورک کی تعمیر میں سرمایہ کاری میں مزید اضافہ کریں گے۔

اگرچہ 5 جی ٹرمینلز کی قیمتوں میں کمی تیز ہے، لیکن قیمت کی کارکردگی زیادہ نہیں ہے۔ مارکیٹ میں نئے 5 جی اسمارٹ فونز کی تعداد میں تیزی سے اضافے کے ساتھ، 5 جی فون کی قیمت میں بھی تیزی سے نیچے کی طرف رجحان ہے۔ سال کے آغاز میں 5 جی اسمارٹ فونز کی قیمت مئی میں تقریباً 550$ ڈالر سے کم ہوکر جون کے آخر میں تقریباً 250$ ڈالر رہ گئی ہے۔

نئے 5 جی اسمارٹ فونز کو تیزی سے لانچ کیا گیا ہے اور اس کی ترسیل میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ 5 جی اسمارٹ فونز کی قیمتوں میں تاثیر اب بھی نسبتاً کم ہے۔ اگرچہ 5 جی کم آخر والے اسمارٹ فونز ایک ہی قیمت کے 4G اسمارٹ فونز کے مقابلے میں 5G نیٹ ورک کی رفتار کے بارے میں ہر ایک کے تجسس کو پورا کرسکتے ہیں، 5G ماڈلز کے کارکردگی اشارے میں اب بھی بہتری کی گنجائش باقی ہے۔

اگرچہ 5 جی کی جدت تیز ہے، لیکن منفرد ایپلی کیشنز کا فقدان ایک حقیقت ہے۔ افرادی قوت اور فنڈز کی مدد سے، 5 جی کی جدید ایپلی کیشن نے خوشگوار نتائج حاصل کیے ہیں۔ سمارٹ مائنز میں 5 جی کا اطلاق حقیقت بن گیا ہے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق، 5 G سے متعلق عمودی صنعت کی مختلف درخواستیں صرف پائلٹ یا پیش قدمی کے مرحلے میں ہیں۔ لہذا اب بھی پختہ ٹیکنالوجی یا بڑے پیمانے پر مقبولیت کے درمیان ایک بہت بڑا فرق موجود ہے۔

نتیجہ اخذ کرنا 4 جی نے ڈیٹا کی شرح میں نمایاں اضافہ حاصل کیا ہے، موبائل براڈ بینڈ کے دور میں داخل ہوا ہے، اور لوگوں کی طرز زندگی کو تبدیل کیا ہے۔ چاہے یہ آرڈر، ٹیک آوٹ، ادائیگی وغیرہ۔

سکائی ڈائیونگ

آسٹریلیا کی 102 سالہ خاتون Irene o Shee نے چودہ ہزار فٹ کی بلندی سے سکائی ڈائیونگ کر کے عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ Irene o Shee دنیا کی سب سے بزرگ خاتون ہیں جنہیں تین بار پہلی مرتبہ 100 سال کی عمر، دوسری مرتبہ 101 اور تیسری مرتبہ 102 سال کی عمر میں سکائی ڈائیونگ کا اعزاز حاصل ہے۔

کچھ عرصہ قبل Motor Neurone Disease کی وجہ سے Irene o Shee کی بیٹی کا انتقال ہوگیا تھا لہٰذا Irene o Shee نے لوگوں میں اس بیماری سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کا عزم کیا۔ پہلی دو کوشش میں Irene o Shee بارہ ہزار ڈالر اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ انہیں امید ہے کہ تیسری کوشش میں وہ دس ہزار ڈالر مزید اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ بڑی عمر کے لوگوں کے لیے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ Irene o Shee ایک سو دو (102) سال کی عمر میں چشمے کے بغیر مطالعہ کرتی اور ڈرائیونگ بھی خود کرتی ہیں۔

ایک صدی کا قصّہ

دیوکا رانی

دیپک کنول (ممبئی)

سن 1929 میں ہندوستان نے اپنی پہلی انگریزی فلم بنائی جس کا نام ''کرما'' تھا۔اس فلم کی سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اس میں بوسہ بازی کا ایک سین تھا جو کہ چار منٹ کا تھا۔مزے کی بات یہ تھی کہ اس منظر کو ادا کرنے والے جو ادا کار تھے وہ رشتے میں میاں بیوی تھے۔یہ فلم ہندی اور انگریزی میں بنی تھی۔انگریزی زبان میں تو یہ فلم کاروباری لحاظ سے ناکام رہی مگر تنقیدی نقطہ نظر سے اسے یورپ میں بیحد سراہا گیا۔جب یہ فلم ہندوستان میں ریلیز ہوئی تو یہ بری طرح فلاپ ہوگئی۔جس سرمایہ کار نے اس فلم میں پیسہ لگا کر اسے ریلیز کیا تھا جب اُس کے باپ نے یہ فلم دیکھی تو وہ چراغ پا ہو اُٹھا۔بیٹے کو جاکر باپ کو رام کرنا پڑا۔اُسنے کان پکڑ کر باپ سے نہ صرف معافی مانگی بلکہ اُس نے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ آگے اس طرح کی کسی بھی فلم میں پیسہ نہیں لگائے گا۔اس سین کے ادا کار، ہدایت کار اور فلمساز ہمانشو رائے تھا اور اُسکے مدمقابل کام کرنے والی ادا کارہ دیوکا رانی تھی جو کہ اُسکی زوجہ تھی۔

دیوکا رانی ہندوستان کی پہلی ادا کارہ تھی جو ایک متمول، مہذب اور باوقار بنگالی پریوار میں پیدا ہوئی تھی۔دیوکا رانی 30 مارچ 1908 کو وشاکھا پٹنم کے والتیار میں پیدا ہوئی تھی۔یہ آندھرا پردیش میں پڑتا ہے۔اُسکے والد ڈاکٹر منمتھ ناتھ چودھری ایک بہت بڑے زمیندار گھرانے کے بہت ہی پڑھے لکھے نوجوان ڈاکٹر تھے جو کہ برٹش راج میں مدراس پریزڈنسی کے پہلے جنرل سرجن تھے۔دیوکا رانی کی دادی سوکمارا دیوی رابندر ناتھ ٹیگور کی سگی بہن تھی۔من متھ ناتھ چودھری کے پانچ بھائی تھے جو سب کے سب اونچے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔دیوکا رانی جب نو سال کی تھی تو اسے پڑھنے کے لئے انگلینڈ کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کیا گیا۔اُسنے اپنی ابتدائی پڑھائی وہیں پوری کی۔اپنی ابتدائی پڑھائی پوری کرنے کے بعد اُسنے رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ اور رائل اکیڈمی آف میوزک لنڈن میں داخلہ لیا۔اسکے علاوہ اُسنے آرکی ٹیکچر، ٹیکسٹائل اور ڈیکو ڈیزائننگ کی ٹریننگ بھی لی۔یہ سارے کورس اُسنے 1927 تک پورے کئے۔اسکے بعد اُسے لنڈن کے ایک نامی آرٹ اسٹوڈیو میں ٹیکسٹائل ڈیزائنر کی نوکری مل گئی۔یہیں پر اُسکی ملاقات ہمانشو رائے سے ہوئی جو کہ پیشے سے بیرسٹر تھا۔وہ بیرسٹری چھوڑ کر فلمسازی کے پیشے کی طرف راغب ہوگیا تھا اور اپنی پہلی خاموش فلم ''A Throw of Dice'' کی شوٹنگ کے سلسلے میں لنڈن آیا ہوا تھا۔ایک دن اُسکی ملاقات دیوکا رانی سے اُسی آرٹ اسٹوڈیو میں ہوئی جہاں وہ نوکری کرتی تھی۔وہ اُسکے خدوخال سے ہی نہیں بلکہ اُسکی ذہانت اور قابلیت سے کافی متاثر ہوا۔اُسنے اُسے فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی۔بطور ہیروئن نہیں بلکہ تیکنکی شعبے میں کام کرنے کے لئے۔وہ فوراً راضی ہوگئی۔وہ کاسٹیوم ڈیزائننگ اور آرٹ ڈائرکشن میں بطور معاون کے اُسکے ساتھ کام کرنے لگی۔چند مہینوں میں وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ اُنہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔اسی سال وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

سن 1929 میں یہ دونوں فلم سازی کی مزید ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے جرمنی چلے گئے اور برلن کے یو ایف اے اسٹوڈیو میں اُنہوں نے فلم سازی کی تربیت حاصل کی۔وہاں پانچ سال گزارنے کے بعد وہ 1934 میں ہندوستان لوٹے۔ان دونوں نے فلموں کے بارے میں نئی نئی معلومات سے استفادہ حاصل کیا تھا۔ہیمانشو رائے کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس نئے کلچرل انقلاب سے اپنے ملک کی عوام کو روشناس کرائے۔ان سب چیزوں کے لئے پیسہ درکار تھا۔وہ کئی سارے لوگوں سے ملا۔اُنہیں فلموں کے جادو سے باخبر کرانا چاہا مگر اُسکی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔اُسکے پیچھے دو لوگوں کا ہاتھ تھا جو اُس سے نظریاتی اتفاق رکھتے تھے مگر جہاں تک سرمایے کا سوال تھا اس محاذ پر اُنہوں نے پہلے سے ہی اپنے ہاتھ کھڑے کئے تھے۔

وہ سرمایہ جٹانے کی تلاش میں مہینوں سرگرداں رہا۔سرمایہ کاروں کی تلاش کے دوران اُسکی ملاقات ابھیمنو پرساد سنگھ سے ہوئی جو کہ سیٹھ بدری پرساد کا بہت ہی گہرا دوست تھا جو کہ بمبئی کا ایک جانا مانا سرمایہ کار تھا۔ابھیمنیو پرساد سنگھ نے لنڈن ریٹرن اس فلم اور تھیٹر ایکٹر ہیمانشو رائے کو سیٹھ بدری پرساد دوبے سے ملا دیا۔اُسنے سیٹھ بدری پرساد سے کہا کہ اُسکے دل میں ایک خواب ہے۔وہ ایک فلم کمپنی کھولنا چاہتا ہے۔جس طرح اُسنے سیٹھ بدری پرساد کے سامنے اپنا پروجیکٹ رکھا تھا اُسے پورا یقین تھا کہ سیٹھ بدری پرساد اُسے سرمایہ فراہم کرے گا مگر اُسکی امید اُس وقت ٹوٹی جب بدری پرساد نے فلموں میں پیسہ لگانے سے صاف انکار کر دیا۔اُس کا کہنا تھا کہ اُس نے فلم ''عالم آرا'' میں پیسہ لگایا تھا۔فلم میں کام کرنے والوں نے خوب نام کمایا جب کہ اُسے کوئی مالی فائدہ نہ ہوا اس لئے اُسنے فلموں میں پیسہ نہ لگانے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اُس کے خیال سے یہ کاروبار منفعت بخش نہیں تھا۔

ابھیمنیو سنگھ نے ہمت نہیں ہاری۔اُس نے ہیمانشو رائے کو بدری پرساد کے بیٹے راج نارائن دوبے سے بات کی جو کہ ایک اُمنگوں سے بھرا نوجوان تھا جس نے 1929 میں ایک کمپنی کی نیو رکھی تھی جس کا نام دوبے انڈسٹریز تھا۔وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔وہ آرٹ اور کلچر کا شیدائی تھا۔ہیمانشو رائے اور اُسکی ملاقات بمبئی کے تاج ہوٹل میں ہوئی۔ہیمانشو رائے نے اُسے پچیس لاکھ روپے لگانے کے لئے کہا۔راج نارائن دوبے نے اُس سے پوچھا کہ وہ اگر اتنی کثیر رقم لگائے گا تو اس رقم کی واپسی کی کیا گارنٹی ہے؟ ہیمانشو رائے کاروباری آدمی نہیں تھا۔وہ اپنے جواب سے اُسے مطمئن نہیں کر سکا۔راج نارائن دوبے

ایک پکا بزنس مین تھا، وہ اتنی بڑی رقم گنوانے کے لئے تیار نہیں تھا اسلئے یہ بیل منڈھے چڑھ نہیں پائی۔

مہینے بیت گئے۔ ہیمانشو رائے در در بھٹکتا رہا۔ اُسکے ہاتھ سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں لگا۔ فلم کمپنی کھولنے کا اُسکا خواب بس خواب ہی بن کر رہ گیا۔ وہ اسقدر دل برداشتہ ہوا کہ اُسنے خودکشی کی ایک ناکام کوشش کی۔ اکھیمینو پرساد کی معرفت راج نارائن دوبے تک یہ خبر پہنچی۔ وہ اس آدمی کی دیوانگی دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ راج نارائن دوبے کا پکا یقین ہو گیا کہ یہ جنونی آدمی یہاں کچھ بڑا کرنے آیا ہے اس لئے اُس نے اس واقعے کے فوراً بعد اُسے بلالیا اور اُس نے اُس کی کمپنی میں سرمایہ لگانے کے لئے حامی بھر لی۔ اُسکے باپ کو جب اس بات کی بھنک لگ گئی تو اُسنے بیٹے کو تنبیہ کی کہ وہ ایسی غلطی نہ کرے۔ بیٹے نے باپ کی ایک نہیں سنی اور وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

بمبئی ٹاکیز کا جنم ہوا۔ ساتھ ہی دو معاون کمپنیوں کا بھی طلوع ہوا۔ یہ دو کمپنیاں تھیں بمبئی لیبارٹری اور بمبئی ٹاکیز پکچرس۔ ان کمپنیوں کا مالک راج نارائن دوبے تھا جب کہ ہیمانشو رائے اور دیوکارانی کے لئے کمپنی میں ایک چھوٹا سا حصہ رکھا گیا تھا اور ساتھ ہی اُنہیں فلموں میں کام کرنے کے لئے الگ سے معاوضہ دینا بھی طے کیا گیا تھا۔ ہیمانشو رائے نے جو دو فلمیں ''Light of Asia'' اور ''کرما'' بنا کر سن 1923 اور 1933 میں ریلیز کیں تھیں اور جنہیں کوئی پزیرائی نہیں ملی تھی۔ ''کرما'' وہی فلم تھی جس میں ہیمانشو رائے اور دیوکارانی کا چار منٹ کا ایک طویل بوسہ بازی کا سین تھا۔ اس فلم کو مزید اشتہا آمیز بنانے کے لئے اسمیں چند اور متنازعہ سین جوڑ دئے گئے۔ راج نارائن دوبے نے نئی پیکنگ کے ساتھ ان دونوں فلموں کو ہندوستان میں ریلیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستانی ناظرین نے ''کرما'' دیکھ کر ہنگامہ مچا دیا۔ فلم بری طرح پٹ گئی۔ راج نارائن کے باپ سیٹھ بدری پرساد دوبے نے جب یہ فلم دیکھی تو وہ یہ مناظر دیکھ کر بیخ پا ہوا اُٹھا۔ اُسنے بیٹے کی خوب لعنت ملامت کی۔ بیٹے نے کان پکڑ کر باپ سے معافی مانگی اور اُس سے وعدہ کیا کہ وہ پھر کبھی اس طرح کی فلم میں سرمایہ کاری نہیں کرے گا۔

فلموں کی تیاری کا عمل زور شور سے شروع ہو گیا۔ طے یہ پایا گیا کہ تخلیقی اور تیکنیکی ادارہ الگ ہو اور کاروباری ادارہ الگ۔ کاروباری ادارے کی کمان راج نارائن دوبے نے خود سنبھال لی تھی۔ جب کہ تیکنیکی ادارے کی بھاگ ڈور ہیمانشو رائے کے ہاتھ میں تھی۔ جتنے بھی ٹیکنیشنز تھے وہ زیادہ تر بدیشی تھے جب کہ تخلیقی ٹیم دیسی تھی۔ کئی سارے گریجویٹ کو بھرتی کیا گیا تھا تاکہ وہ باہر کے ٹیکنیشوں کے ساتھ رہ کر وہ فلم سازی کی تیکنیک کو پوری طرح سیکھ لیں۔ ان ہی ملازموں میں ششا دھر مکھر جی بھی تھا جو کہ ایک بنگالی تھا اور اسسٹنٹ ساونڈ ریکارڈسٹ کے طور بھرتی ہوا تھا۔

بمبئی ٹاکیز نے جو پہلی فلم بنائی اُسکا نام ''جوانی کی ہوا'' تھا۔ راج نارائن دوبے ''کرما'' سے ہوئی فضیحت نہیں بھولا تھا اسلئے اُس نے یہ شرط رکھی تھی کہ جب تک وہ خود فلم نہیں دیکھے گا تب تک کوئی بھی فلم ریلیز نہیں ہو گی۔ وہ خود ایک قدامت پسند برہمن گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اسلئے اُس نے اسٹوڈیو میں سگریٹ اور شراب نوشی پر پابندی لگا دی۔ فلم ''جوانی کی ہوا'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے اداکار نجم الحسن اور دیوکارانی تھے۔ یہ ایک کرائم تھرلر تھی اور اسکی پوری شوٹنگ ایک ٹرین میں کی گئی تھی۔ یہ فلم 1935 میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد دوسری فلم کا اعلان کیا گیا جس کا نام ''جیون نیا'' تھا۔ اسی بیچ ششا دھر مکھر جی کے یہاں اُنکا سالا کمد لال اپنے آبائی شہر کھنڈوا (مدھیہ پردیش) سے بھاگ کر بمبئی پہنچ گیا۔ کمد لال کا باپ ایک نامی وکیل تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی ایک کامیاب وکیل بنانا چاہتا تھا اسلئے اُنہوں نے اُسے لا کالج میں ڈال دیا تھا۔ وہ امتحان میں فیل ہو گیا تھا اس لئے باپ کے عتاب اور گھر والوں کی لعن طعن سے بچنے کے لئے وہ بمبئی اپنی بہن کے پاس بھاگ گیا۔ اُسکی بہن ستی دیوی ششا دھر مکھر جی کی بیوی تھی۔ کمد لال نے اپنے جیجا سے درخواست کی کہ وہ اُسے اپنی کمپنی میں کوئی کام دلائیں۔ ششا دھر مکھر جی نے کمپنی میں اپنی اچھی خاصی ساکھ بنالی تھی۔ اُسنے ہیمانشو رائے سے بات کر کے اُسے ایک لیبارٹی اسسٹنٹ کے طور بھرتی کرالیا۔ کمد لال کو اس کام میں بڑا مزہ آیا۔ اُسنے باپ کو بھی اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک کامیاب وکیل نہیں بن پائے گا اس لئے اُسنے قانون کی پڑھائی بھول کر فلم کی تیکنک سیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کام اُسکے من موافق ہے۔ اُسکا باپ اُسکی کوئی بھی تاویل سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخر میں ششا دھر مکھر جی کو بیچ میں مداخلت کرنی پڑی۔ سسر کو داماد کی بات سننی پڑی اور اس طرح کمد لال کو بمبئی ٹاکیز میں لیب اسسٹنٹ کے طور کام کرنے کا موقع ملا۔ اُسکی تنخواہ بھی معقول تھی اور کام بھی اُسکی پسند کا تھا۔ وہ پانچ سال تک لیبارٹری اسسٹنٹ کے طور کام کرتا رہا۔

''جوانی کی ہوا'' کے بعد ایک اور فلم کا اعلان ہوا۔ اس فلم کا نام ''جیون نیا'' تھا۔ اس میں بھی نجم الحسن اور دیوکارانی کو مرکزی کردار کے لئے منتخب کیا گیا۔ دیوکارانی ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ وہ شادی شدہ ہو کے بھی نورالحسن کی طرف مائل ہونے لگی۔ فلم ''جیون نیا'' کی شوٹنگ شد و مد سے جاری تھی کہ ایک دن دیوکارانی نجم الحسن کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہیمانشو رائے پر تو جیسے بجلی گری۔ فلم آدھی سے زیادہ بن چکی تھی۔ اس فلم پر بہت سارا پیسہ لگایا گیا تھا۔ اُن کے بھاگ جانے سے شوٹنگ رک گئی۔ اسٹوڈیو میں کھلبلی مچ گئی۔ ہیمانشو رائے تو اندر سے ٹوٹ کے رہ گیا تھا۔

ششا دھر مکھر جی اور دیوکارانی کا بھائی بہن جیسا رشتہ تھا کیونکہ دونوں بنگالی تھے۔ وہ دونوں آپس میں بنگالی میں بات کیا کرتے تھے۔ ششا دھر مکھر جی بڑا تیز و طرار آدمی تھا۔ اُسنے اپنی ذہانت کے بل پر بمبئی ٹاکیز میں اپنی ایک خاص پوزیشن بنالی تھی۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح سے دیوکارانی کو ڈھونڈ نکالا اور اُس سے رابطہ کر کے اُس سے ملنے پہنچ گیا۔ اُسنے دیوکارانی کو سمجھایا کہ وہ اگر نجم الحسن شادی کرنا چاہے گی تو وہ کر نہیں پائے گی کیونکہ وہ شادی شدہ ہے جب تک اُسکی طلاق

نہیں ہو پائے گی وہ دوسری شادی نہیں کرسکتی۔اُسنے اُسے باور کرالیا کہ اُسکی طلاق ہونہیں پائی گی کیونکہ اُن دنوں ہندوں کے لئے طلاق لینا غیر قانونی تھا۔ششادھر مکھر جی نے دیوکارانی کو یہ بھی بتادیا کہ بناطلاق کے کسی کے ساتھ رہنے والی عورت کو ویشیا کہا جاتا ہے۔کیا وہ بھی اس طرح کی زلت بھری زندگی گزارنا چاہے گی۔دیوکارانی کی سمجھ میں بات آ گئی اور اُس کے سر سے پیار کا بھوت اُتر گیا۔اُسنے ششادھر مکھر جی سے کہا کہ وہ اُسکی بات ہیمانشورائے سے کرالے۔ششادھر مکھر جی نے اُسکی بات ہیمانشو رائے سے کرالی۔اُس نے واپسی کی یہ شرط رکھی کہ جتنے بھی اُنکے مشترکہ اکاونٹ ہیں وہ الگ الگ کر دئے جائیں اور اُسکا جو حصہ ہے وہ اُسکے اکاونٹ میں منتقل کر دیا جائے۔اسکے علاوہ وہ اُسکے گھر میں ہونے والے اخراجات کا آدھا حصہ خود ادا کرے گی۔مرتا کیا نہ کرتا، ہیمانشورائے نے اُسکی دونوں شرطیں مان لیں اور وہ ششادھر مکھر جی کے ساتھ لوٹ کے آ گئی۔

رشتوں میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ہیمانشو رائے اُسکی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر اُسکی مجبوری تھی۔بہر حال اُسنے اُسے قبول تو کیا مگر رشتوں میں نہ وہ گرمی تھی نہ وہ مدھرتا۔وہ ایک ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن کر رہ رہے تھے۔گھر میں کوئی بول چال نہیں ہوتی تھی۔سیٹ پر ہی بات ہوا کرتی تھی۔ہیروئن تو لوٹ کے آئی تھی اب ہیرو کا مسلہ تھا کیونکہ ہیمانشورائے نجم الحسن کا نام لینے کا بھی روادار نہ رہا تھا۔اُن دنوں جتنے بھی اداکار یا ٹیکنیشنز ہوتے تھے وہ ایک معاہدے کے تحت ماہانہ تنخواہ پر کام کرتے تھے۔اس معاہدے کی روسے وہ باہر کی کسی بھی فلم میں کام نہیں کرسکتے تھے۔نجم الحسن بھی معاہدے میں بندھا ہوا تھا۔''جیون نیا'' سے اُسے نکال باہر کر دیا گیا تھا۔اب اُس کی جگہ فلم کے لئے نئے ہیرو کی تلاش ہو رہی تھی۔ایک دن کمد لال ہیمانشورائے کے سامنے سے گزرا تو ہیمانشورائے کی اُس پر نظر پڑ گئی۔اُسنے اُسے غور سے دیکھا۔اُسنے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ ششادھر مکھر جی کا سالا ہے۔ہیمانشورائے نے ششادھر مکھر جی سے بات کی۔کمد لال کے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے اسکرین ٹیسٹ دینا پڑا۔ہیمانشو رائے نے اُسے ''جیون نیا'' کے ہیرو کے رول کے لئے منتخب کر لیا اور اُسے نیا نام دیا اشوک کمار۔نجم الحسن کے ساتھ جتنا بھی حصہ شوٹ ہوا تھا اُسے ضائع کر دیا گیا۔فلم کی شوٹنگ پر کافی پیسہ صرف ہوا تھا۔کئی سارے لوگوں سے پیسہ اُٹھایا گیا تھا۔بمبئ ٹاکیز ایک بڑے مالی بحران سے گزر رہا تھا اور اسے ایک بار پھر کھڑا کرنے کے لئے ہیمانشورائے کو کافی مشقت کرنی پڑی کیونکہ نجم الحسن اور دیوکارانی کے بھاگ جانے سے کمپنی کی ساکھ پر کافی منفی اثر پڑا تھا۔

نجم الحسن کو کسی بھی فلم کمپنی نے کام نہیں دیا۔اُسکا ایک شاندار کیریر ختم ہو گیا اور وہ گم نامی کے اندھیرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غرق ہو گیا۔ایک نئے ستارے اشوک کمار کا طلوع ہوا تھا۔''جیون نیا'' اُسکی پہلی فلم تھی۔ہیروئن دیوکا رانی تھی۔وہ اپنی ہیروئن دیوکارانی کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ دیوکارانی ایک کھلی ڈھلی اور بے باک عورت تھی۔وہ سگریٹ نوشی کرتی تھی۔شراب پیتی تھی۔سیٹ پر گندی گندی گالیاں دیا کرتی تھی اور زرا سی بات پر اُبل پڑتی تھی۔اشوک کمار فطرتاً بڑا شرمیلا اور مہذب نوجوان تھا۔بہر حال اُسے طوعاً و کرہاً دیوکارانی کو گوارہ کرنا پڑا۔وہ اپنی فطری اداکاری سے ناظرین کا من موہنے میں کامیاب ہو گیا۔

بمبئ ٹاکیز کا سنہری دور شروع ہوا تھا۔سن 1936 میں بمبئ ٹاکیز کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں جن کا نام ''ممتا اور میاں بیوی''،''جیون نیا''،''جنم بھومی'' اور ''اچھوت کنیا'' تھا۔ان سبھی فلموں کا ہیرو اشوک کمار تھا۔فلم ''اچھوت کنیا'' نے اشوک کمار کو شہرت سے ہمکنار کر دیا۔یہ فلم چھوا چھوت کے موضوع پر بنی والی ایک بے باک فلم تھی جس میں دیوکارانی ایک اچھوت لڑکی کے کردار میں تھی۔چونکہ اُسکے خدوخال ایسے تھے کہ وہ کسی بھی زاویے سے غریب لڑکی لگ نہیں رہی تھی۔یہ اشوک کمار کی اچھوتی اداکاری کا معجزہ تھا کہ فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔1937 میں بمبئ ٹاکیز نے چار فلمیں ریلیز کیں۔''ساوتری''،''جیون پربھات''،''عزت'' اور ''پریم کہانی''۔''جیون پربھات'' واحد فلم تھی جس میں دیوکارانی کا ہیرو ممتاز علی تھا جب کہ باقی کی تین فلموں کا ہیرو اشوک کمار تھا۔1938 میں دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔''نرملا'' اور ''وچن''۔ان دونوں فلموں کا ہیرو اشوک کمار تھا۔1939 میں ''درگا'' ریلیز ہوئی۔

اس بیچ دوسری عالمگیر چھڑ گئی۔اُس وقت بمبئ ٹاکیز کی پندرہ کے قریب فلمیں سیٹ پر تھیں۔سبھی فلموں کی شوٹنگ رک گئی۔وہ چاہ کر بھی اُنہیں مکمل نہیں کر سکے کیونکہ اُنکے بیشتر جرمن ٹیکنیشنز کو برطانوی فوج نے گرفتار کر لیا تھا۔اس عالمگیر جنگ کی وجہ سے ملک کی معیشت پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ہیمانشورائے پر اس افراتفری کا اس حد تک اثر ہوا کہ اُسے نروس بریک ڈاون ہو گیا۔یہ نروس بریک ڈاون اُسکے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔1940 میں اُسکی موت ہو گئی۔بمبئ ٹاکیز کا بانی چلا گیا تھا۔سینکڑوں آدمیوں کی نوکریاں خطرے میں پڑ گئی تھیں۔راج نارائن دوبے نے یہ فیصلہ لیا کہ وہ بمبئ ٹاکیز کو ڈوبنے نہیں دے گا۔وہ ہیمانشو رائے کے اُدھورے خوابوں کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔اُس نے بمبئ ٹاکیز میں نئی توانائی بھرنے کے لئے مزید چار لاکھ دس ہزار روپے کی سرمایہ کاری کی اور اس طرح ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

1941 میں بمبئ ٹاکیز کی فلم ''انجان'' ریلیز ہوئی۔اس فلم کا ہدایت کار امیہ چکرورتی تھا جب کہ مرکزی کردار میں اشوک کمار اور دیوکارانی تھے۔اس کے بعد دیوکارانی کی بطور اداکارہ جو آخری فلم تھی وہ تھی ''ہماری بات'' جو کہ 1943 میں ریلیز ہوئی۔اس میں اُس کے ساتھ ثریا اور ڈیوڈ ابراہم تھے۔اس فلم میں راج کپور نے ایک چھوٹا سا رول ادا کیا تھا۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بمبئ ٹاکیز نے فلم انڈسٹری کو کئی انمول ہیرے دئے۔جیسے اشوک کمار، لیلا چٹنس، دلیپ کمار، راج کپور، مدھوبالا اور ممتاز۔ہیمانشورائے کی موت کے بعد بمبئ ٹاکیز میں بغاوت کی چنگاری پڑ چکی تھی۔کمپنی میں دو دھڑے بن گئے۔ایک دیوکا رانی کا تھا جس کے ساتھ ہدایت کار امیہ چکرورتی تھا جب کہ دوسرا دھڑا ششادھر

مکھر جی کا تھا جس کے ساتھ اشوک کماراوراُسکا بھائی گیان مکھر جی تھا۔ششا دھر مکھر جی کا پلڑا بھاری تھا کیونکہ اُن کے ساتھ اشوک کمار تھا جو کہ ایک اسٹار تھا۔ دیوکارانی ایک دبنگ عورت تھی۔اُسنے اسٹوڈیو کا پوار کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیااور ششا دھر مکھر جی کو اپنے ساتھ رکھ کر اُسنے فلم سازی کا عمل پھر سے شروع کر دیا۔ 1941 اُسنے ششا دھر مکھر جی کی ساجھے داری میں فلمیں بنائیں۔ہیمانشو رائے کی موت کے بعد پہلی فلم جو ریلیز ہوئی وہ تھی ''انجان'' جس کے مرکزی اداکار اشوک کمار اور دیوکا رانی تھے۔اس فلم کی کامیابی کے بعد دو اور فلمیں بنیں۔ ''بسنت'' اور ''قسمت''۔''قسمت'' نے تو بمبئی ٹاکیز کی قسمت ہی بدل کے رکھ دی۔اس فلم نے بزنس کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دئے۔یہ فلم کلکتہ کے ایک سینما ہال میں تین سال تک مسلسل چلتی رہی۔اُسکے بعد جواُسنے آخری فلم بنائی وہ تھی ''ہماری بات''۔

کمپنی کے اندر سازشیں چل رہی تھیں۔دیوکا رانی ان باتوں سے بے خبر فلمیں بنانے میں مشغول تھی۔اُسنے دلیپ کمار کو لے کر فلم ''جوار بھاٹا'' بنائی جس کے ہدایت کار اُسکے بھروسے مند دوست امیہ چکرورتی تھے۔فلم چلی نہیں۔جو فلمیں ششا دھر مکھر جی کی نگرانی میں بنیں وہ بیحد کامیاب رہیں۔وہ اس بات سے کافی دکھی تھی کہ جو فلم اُس کی نگرانی میں بنی وہ چلی نہیں جب کہ ششا دھر مکھر جی کی نگرانی میں جو بھی فلم بنی اُسنے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔اسی بیچ ششا دھر مکھر جی اشوک کمار کو لے کے بمبئی ٹاکیز سے الگ ہو گیا اور اُنہوں نے ایک نئے اسٹوڈیو کی بنیاد ڈال دی جس کا نام ''فلمستان'' رکھا گیا۔ششا دھر مکھر جی کے اس وشواس گھات سے دیوکا رانی کا دل ٹوٹ گیا۔اشوک کمار اب ایک پارس بن چکا تھا۔بمبئی ٹاکیز اشوک کمار کے بنا ادھوری تھی۔وہ اس صدمے کو برداشت نہ کرسکی۔ اُسنے فلمی دنیا سے سنیاس لینے کا فیصلہ کیا۔

اُسنے ایک روسی مصور سویٹو سلورویئریچ سے 1945 میں شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔وہ بمبئی سے ہماچل منتقل ہو گئے اور وہاں کی ایک خوبصورت وادی منالی میں رہنے لگے۔اُسنے وہاں رہ کر جانوروں پر کئی ڈاکومینٹری فلمیں بنائیں۔چند سال منالی میں گزارنے کے بعد اُنہوں نے بنگلور کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔وہاں اُنہوں نے چار سو پچاس ایکڑ زمین خرید لی اور وہاں پر دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک ایکسپورٹ بزنس بھی شروع کیا۔

1993 میں اُسکے مصور شوہر کی موت ہوئی۔اُسکی موت کے ٹھیک ایک سال بعد دیوکا رانی کا بھی دمہ کی بیماری کی وجہ سے موت ہوئی۔وہ لاولد تھے۔ اُن کے پاس جو وشال جاگیر تھی اُس پر کئی لوگوں نے حق جمانے کی کوشش کی۔ کرناٹک سرکار نے اس ملکیت پر سپریم کورٹ میں دعوی ٹھونک دیا۔فیصلہ سرکار کی حق میں آیا اور وہ ساری زمین کرناٹک سرکار کی ملکیت بن گئی۔دیوکا رانی کو ہندی فلمی پردے کی پہلی خاتون مانا جاتا ہے۔ہندی فلموں کو آفاقی سطح تک لے جانے میں اُسکی شخصیت کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔اُسکی فلمیں زیادہ تر جذباتی، رومانی اور سماجی مسائل کے موضوعات پر مبنی ہوتی تھیں۔دیوکا رانی جرمن ہیروئینوں سے کافی متاثر تھیں۔اُسکا اداکاری کا اسٹائل گریٹا گاربو سے میل کھاتا تھا اسلئے اُسے انڈین گاربو کہا جاتا تھا۔1958 میں اُسے ملک کے چوتھے اہم اعزاز پدم شری سے نوازا گیا۔1969 میں وہ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ پانے والی پہلی خاتون تھی۔ 1990 میں سویت روس کی سرکار نے اُسے سویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ سے سرفرازا۔

بقیہ : اردو میں لوک ادب

نہیں ملتی۔ان گیتوں میں شعور سے زیادہ وجدان اور واردات قلبی کا دخل ہے۔یہ کسی ایک شاعر کی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتے اور نہ ہی ان پر کسی ایک شاعر کے نام کی چھاپ ہوتی ہے بلکہ یہ عوام کا ذہن اور جذبہ شعر کا ہی روپ دھار لیتا ہے''۔

بحوالہ اُردو میں منظوم عوامی ادب (از) معزہ ابراہیم قاضی ص ۴۰)۔

غرض عوامی ادب یا لوک ادب نثر کی شکل میں ہو یا منظوم اس میں صرف ہنسی مذاق، طنز یا طعنے ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کو معاشرے کے اصول وضوابط سیکھنے کے سلسلے میں ایک اہم وسیلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کے ذریعے حب الوطنی کا جوش، مہر و محبت کا پیغام، رشتوں کی پاسداری کا جذبہ، اخلاقی تربیت کا سبق اور سماجی فرائض کا درس دیا جاتا ہے۔لوک ادب کی انہیں خصوصیات کا جب ادراک ہوا تو اس ادب کی کھوج شروع ہوئی۔تحقیق نے یہ حقیقت بھی سامنے لائی کہ لوک ادب کا کچھ مواد ایسا بھی ہے جسے کسی فرد واحد نے بھی تصنیف کیا ہے کچھ گیتوں اور لوریوں کے خالق کے بھی نام ملتے ہیں۔غرض جو کچھ بھی ہے تاہم یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ لوک ادب کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس کو مزید تقویت دینے کی اور اس پر تحقیق و تجسس کی کافی گنجائش ہے یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔آخر پر خاکسار اپنی بات کو پروفیسر قمر رئیس کے اس حوالے کے ساتھ مختصر کرنا چاہے گی کہ:

''میرا تجربہ یہ ہے کہ اُردو کے لوک ادب کی تحقیق و تدوین کے لئے ہمیں نوجوانوں کو خاص تربیت دینا ہوگی۔انہیں لوک ادب کی اہمیت اس کی معنویت اور فنی محاسن سے مانوس بنانا ہوگا اس کے بعد ہی ان میں غیر تحریری ادبی روایت کے مطالعے کا شوق اور دلچسپی پیدا ہو سکے گی''۔

(اُردو میں لوک ادب (مرتبہ) پروفیسر قمر رئیس ص۔۱۴)۔

رس رابطے

جستجو،ترتیب،تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

آپ کے وقیع اور مؤقر جریدے ماہنامہ ''چہارسوٗ'' کے تازہ شمارے میں جس سلیقے اور قرینے سے آپ نے میری شاعری اور شخصیت پر نمبر شائع کیا ہے اُس کے لیے میں آپ اور آپ کے رفقائے کار کا دلی طور پر ممنون ہوں۔ آپ نے جس محبت اور اپنائیت سے اس ناچیز کو یہ عزت بخشی اُس کے لیے خدائے بزرگ و برتر کے حضور آپ کی توفیقات میں اضافے کے لیے دعا گو ہوں۔

یہاں میں دو نہایت عزیز شخصیات جناب تابش خانزادہ اور عزیزم ثاقب تبسم کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ ان دو محبوب شخصیات نے میرے تساہل سے قطع نظر ہر دم تازہ دم کے مصداق مجھے متحرک کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تاوقتیکہ زیرِ نظر شمارہ منظر عام پر نہ آ گیا۔ میری خواہش ہے کہ میں ایک بار پھر جناب گلزار جاوید، بڑے بھائی تابش خانزادہ اور عزیزی ثاقب تبسم کے تحرک اور تجسس کو خراج تحسین پیش کروں کہ چہارسو جیسے معیاری جریدے کو تادیر جاری و ساری رہنے کی پُرخلوص دعائیں دوں۔

عباس تابش (لاہور)

میرے گلزار، خوش اور سلامت رہو۔

مجھے احساس ہے کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی جیسے خوبصورت لحن کے قادر الکلام شاعر سے منسوب ''چہارسوٗ'' کی نسبت کوئی رائے یا تبصرہ ارسال نہ کر سکا۔ ''کرونا'' نے جس طور پوری دنیا کو گھروں اور ہسپتالوں کی چار دیواری تک محدود کر دیا ہے اُس کے سبب عمر کے اس حصے میں آسمان کی طرف دیکھتا اور اپنے رب سے سوال کرتا ہوں کہ ''نوّے سال کی زندگی میں تُو نے جہاں قدم قدم پر ایک سے بڑھ کر ایک نعمت سے نوازا وہیں عقل کو حیران کر دینے والے حالات و واقعات سے بھی آشنا کیا۔ زندگی کی دُم پر بیٹھے ہم جیسے آخری مسافر بھی اقبال کی زباں میں گنگنا رہے ہیں:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

عباس تابش میرے لیے نیا نام ہے۔ قصور اُن کا نہیں میری کہنہ سالی کا ہے۔ یہ نوجوان شاعر کیا خوب کہتا ہے اگر میری جھولی میں عمر کے کچھ ماہ و سال بچے ہوتے تو میں اپنے پروردگار سے عباس تابش کے نام کرنے کی التجا ضرور کرتا۔

افسانے سبھی لاجواب ہیں۔ اے خیام نے ''انٹرنیشنل پارک'' میں موجودہ دنیا کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس کے لیے اُن کو میری جانب سے مبارکباد۔

عشرت آفریں صاحبہ نے بھی اپنے افسانے ''دھیان کا کھیل'' میں جس سادگی سے آج کے دور کا نوحہ بیان کیا ہے اُن کے لیے دلی دعائیں۔ سیمیں کرن کے لیے میرے دل میں وہیں جذبات ہیں جو ایک مشرقی باپ کے ہونے چاہئیں۔ زندگی کے ایک باب کو ''گھنٹہ گھر'' کے عنوان سے جس درد اور کسک کے ساتھ انہوں نے بیان کیا ہے اُس میں افسانے ، ناول اور خودنوشت سب کا لطف پایا جاتا ہے۔ عزیزہ فرخندہ شمیم نے ''کرونا'' جیسی ہولناک وبا کے بارے ''ماسک'' جیسی مختصر کہانی میں وہ سب کچھ بھرپور طریقے سے کہہ دیا جو شاید طویل تحریر میں نہ کہا جا سکتا ہو۔ ''دیوار میں گڑا آئینہ'' ہمیشہ کی مانند ایک سے زائد بار پڑھا۔ آپ نے موجودہ دور کے بکھرتے، بگڑتے معاشرے کی عکاسی جس مہارت سے کی ہے اُس نے کہانی کو زندہ جاوید کر دیا۔

میرے سوہنے منڈے فیروز عالم نے انگریزی کہانیوں کے تراجم کی جو چاٹ ہمارے زبان کو لگائی تھی آج کل ظفر قریشی اُس فریضے کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ ترجمے کو اصل کے رنگ میں ڈھالنا ظفر قریشی کو خوب آتا ہے مگر میں ایک درخواست اُن سے ضرور کرنا چاہوں گا کہ وہ انگریزی الفاظ اور محاوروں کو ہو بہو ترجمہ کرنے کے بجائے بوقت ضرورت تھوڑا املائم کر لیا کریں تو مشرقی تمدن اور روایات شرمندہ ہونے سے بچ جائیں گی۔

شاعری کا ذکر کرنے سے پہلے میں ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر گلِ رعنا، جناب حمید شاہد اور عزیزہ پروین شیر کے مضامین کی سراہنا ضرور کرنا چاہوں گا۔ چاروں فاضل تخلیق کاروں نے اپنے اپنے مضامین سے خوب خوب انصاف کیا ہے۔ شکیب جلالی، انور مسعود، غالب عرفان، انیس اشفاق، اشفاق حسین، خورشید طلب خاص کر ڈاکٹر ریاض احمد نے اس غزل میں زندگی کو ایسے نچوڑا کہ اپنا ماضی سامنے آ گیا۔ اگر ریاض صاحب میرے پاس ہوتے تو میں سینے سے لگا کر اُن کو پیار کرتا اور داد کے ساتھ دعائیں بھی دیتا۔ جیتے رہیں اور اسی طرح قلم کو باریاب کرتے رہیں۔ جہاں تک سوال نظموں کا ہے تو جناب اسلم گورداسپوری، امجد اسلام امجد، پروین شیر، فرح کامران اور جمیل احمد عدیل نے ظلم و زیادتی کے خلاف قلم کو خوب خوب تلوار بنایا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

محترم گلزار صاحب، آداب۔

چہارسو کے تازہ شمارے کی برقی کاپی ملی۔ اگرچہ اپنی نگاہ کی بوجہ عمر، کمزوری کی وجہ سے میرے لئے کمپیوٹر کے اسکرین پر پڑھنا مشکل ہے مگر چہارسو سے جو قلبی لگاؤ اور انسیت ہے اسلئے دو تین دن کی مشقت سے اسے پڑھ ڈالا۔ حسب دستور ایک زخیم اور معلومات سے بھرپور نمبر ہے جو یقیناً وقت کے ساتھ ایک دستاویز کی شکل اختیار کر لیگا۔ عباس تابش کے نام اور کام سے میں بخوبی واقف ہوں۔ وہ تقریباً تین دفعہ لاس انجلز کی ادبی محفلوں میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور میری ان سے سرسری ملاقات بھی رہی۔ ان سے متعلق آپ

نے نہایت دقیق اور معتبر مواد جمع کیا ہے۔وہ مشاہیر اردو ادب میں نہ صرف جانے پہچانے جاتے ہیں بالکہ ان تمام سے اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔خالد احمد، افتخار عارف، یونس بٹ، خواجہ ذکریہ، عطالحق قاسمی اور ظفر اقبال نے انکو موجودہ نسل کا منفرد اور نمائیندہ شاعر قرار دیا ہے۔تابش صاحب کا مضمون یادنگاری بعنوان'' سخن سرائے سے ایک خط'' بھی متاثر کن تھا۔

نثر یا افسانوی حصہ اس دفعہ مجھے کمزور لگا۔سیمیں کرن کا فیصل آباد اور اسکے تہذیبی ماحول اور اس میں گھنٹہ گھر کی اہمیت اور اس شہر میں انکے بیس سال کا تجربہ ایک ذاتی سا تجزیہ ہے مگر انکی تحریر خوب تھی۔فرخندہ شمیم کا ماسک موجودہ حالات کے پس منظر میں اچھا لگا۔لیکن کسی وجہ سے مجھے عشرت آفرین صاحبہ کا افسانہ'' دھیان کا کھیل بہت پسند آیا۔انکی زبان، کہانی کی روانی اور آخیر نے مجھے گرفت میں لے لیا۔میں انکے نام سے واقف ہوں مگر کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔انٹرنیشنل پارک اور یاد کے بے نشاں ٹھیک تھے۔اس دفعہ دو تراجم بھی شامل تھے۔

نیما کی کہانی اور پونا گرام ۔ترجمہ رواں اور بے عیب تھا مگر دونوں کہانیوں کا ماحول میرے لئے غیر مانوس تھا۔

اس جگہ اگر آپ کے افسانے'' دیوار میں گڑا آئینہ'' کا ذکر نہ کیا جائے تو آپ کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔پہلی بات تو یہ کہ آپ کی زبان، الفاظ کا چناؤ، طنز اور کہانی کا اختتام۔۔جس میں آپ ماہر ہیں کہ قاری کو جھٹکا لگے وہ بہت خوب تھا۔اس دور میں انسان اور سماجی قدروں کے ساتھ پیسے کی ناقدری نے انسان کو قطعتی بے وقعت اور بدحال کر دیا ہے بھلا بتلایئے ایک چھڑی کی قیمت موٹر کار کے برابر پہنچ گئی ہے۔یہاں تو وہ محاورہ درج کرنے کو جی چاہتا ہے:

اندھی نہائے کیا نچوڑے کیا

اس شمارے میں جارج فلائیڈ اور کورونا پر بھی حسب ضرورت کچھ مواد ہے۔شاعری میں ڈاکٹر ریاض کی غزل بہت پسند آئی، یہ روایتی رنگ لئے تھی اور مجھے اس میں شہنشاہ تغزل جگر مراد آبادی کی جھلک نظر آئی، غالب عرفان، نوید سروش یونس شرر اور نسیم سحر قابل ذکر ہیں۔نورالہدیٰ صاحبہ کا کلام دیکھ کر خوشی ہوئی وہ ایک اعلیٰ پیمانہ کی دانشور، ڈرامہ نگار اور ادیبہ ہیں۔ بہت دن بعد انکا نام نظر آیا۔اسی تناظر میں بہن کے انتقال پر نیویارک سے مشیر طالب کا مرثیہ جذبات میں ڈوبا تھا۔

تقی عابدی کا مضمون ٹیپو سلطان کے مقبرے پر علامہ اقبال کی حاضری حاصل شمارہ ہے۔چہارسو اپنے مواد اور اسکی ادبی قدر و قیمت کے حوالے سے اس وقت دنیائے اردو میں ایک نمایاں جریدہ ہے جس میں آپکی محنت شامل ہے۔رینو بہل صاحبہ کے ناول پر دیپک بدکی کا تبصرہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کیونکہ یہ انتہائی متاثر کن ناول ہے، جسے میں نے ڈوب کر پڑھا اور میں خود اس پر لکھنا چاہ رہا تھا مگر کاہلی کی وجہ سے نہ لکھ سکا۔

اب آخیر میں'' رکھنا غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف'' مجھے یہ لکھنے کی اجازت دیں چاہے اس سے کچھ لوگ ناراض ہو جائیں۔اس شمارے میں ظفر قریشی صاحب کا ایک البانیہ کی کہانی کا ترجمہ شامل ہے۔اس میں جو الفاظ اور زبان استعمال کی گئی ہے ایسی تو سعادت حسن منٹو نے بھی کبھی استعمال نہیں کی۔عورت کے جسمانی اعضا کو جس طرح بیان کیا گیا ہے (جسے پڑھ کر میں خود سے شرمندہ ہو گیا) وہ اس قسم کے ادبی رسالے کے لئے مناسب نہیں تھی۔اس مضمون یا افسانے کا حاصل مقصد کیا تھا میں اسے بھی نہیں سمجھ سکا۔

فیروز عالم (کیلیفورنیا)

برادرِ عزیز گلزار جاوید، سلام مسنون۔

شاید کرونا کے دور میں کاغذی صورت میں'' چہارسو'' کو پوسٹ کرنے میں کئی عملی دشواریاں پیش آ رہی ہوں گی اسی لیے اس مرتبہ بھی میں نے کسی طرح تازہ شمارہ نیٹ سے ہی ڈاؤن لوڈ کیا، اور پھر اس کے چند صفحات پرنٹ کر کے پڑھے کہ لیپ ٹاپ یا موبائل پر پڑھنے سے آنکھوں پر شدید دباؤ پڑتا ہے۔

کرونا وائرس بدستور دہشت پھیلاتا جا رہا ہے، کیا سیاستدان، کیا تاجر، کیا فنکار، کیا عوام، سبھی اس کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے رحم و کرم کے لیے دعا گو ہیں۔صبح فیس بک یا واٹس ایپ کھولتے ہی کوئی نہ کوئی شدید غمزدہ کر دینے والی اطلاع دکھائی دیتی ہے اور پھر سارا دن ہی ایک کرب کے عالم میں گزرتا ہے۔ابھی کچھ دن قبل معروف شاعر افراسیاب کامل کی وفات کی خبر تھی جنہوں نے کرونا میں مبتلا اپنی والدہ کی تیمارداری کی اور کچھ دن بعد خود بھی کرونا کا شکار ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔۳۰ جون کو ایک بہت ہی عمدہ نعت گو اور کالم نگار ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش کا حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا جو کرونا وائرس پر نہ صرف طبی حوالے سے مسلسل لکھ رہے تھے بلکہ کرونا پر پاکستانی شعراء کی شاعری پر بھی کالموں کا ایک سلسلہ ایک روزنامے میں لکھ رہے تھے اور ان کی وفات سے ایک رات قبل ہی ان سے طویل گفتگو میں اس شاعری میں مزید کچھ شعراء کے کلام کا اضافہ کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کے موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ابھی یہ خط لکھ ہی رہا تھا کہ ۳/جولائی کو بہت اچھے دوست اور سینئر شاعر سید ناصر زیدی کی اچانک وفات کی خبر نے دل ہی دہلا دیا، ابھی پرسوں رات ہی ان سے گفتگو ہو رہی تھی اور وہ ادبِ لطیف کا احمد فراز نمبر نکالنے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور کچھ دوستوں کے مالی طور پر تعاون نہ کرنے کا شکوہ بھی کر رہے تھے۔وہ کوئی اڑھائی تین ماہ قبل لاہور سے بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد میں اپنے بیٹے کے ہاں منتقل ہوئے تھے اور کافی عرصے سے فالج کے عارضے میں مبتلا تھے، ڈاکٹروں نے انہیں کچھ عرصے بعد آپریشن کرنے کا بھی کہا تھا، مگر جب سناؤنی آ جائے تو پھر سب کچھ ختم۔آج سہ پہر کو ہی ان کی رسمِ قل میں شریک ہو کر آیا ہوں اور ابھی تک سخت اداسی ہے کہ کیسے کیسے لوگ کس طرح یکدم بچھڑ جاتے ہیں۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ان سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

جناب عباس تابش کے گوشۂ خصوصی میں کچھ مضامین اچھے لگے، اگرچہ

کچھ ایسے تھے جو پہلے دیگر جرائد میں پڑھ چکا ہوں۔ بہرحال ہر قلمکار سے آپ کا انٹرویو خاصے کی چیز ہوتا ہے۔ مضامین میں جہاں بعض اوقات تکرار کا احساس ہوتا ہے وہاں انٹرویو اور منتخب کلام قابلِ مطالعہ ہوتا ہے۔

''زہریلا انسان'' کی ۲۷/ویں قسط میں جناب تابش خانزادہ نے اس دلچسپ کہانی کو ایک ایسا چونکا دینے والا موڑ دیا ہے جس میں ایک غیر ملکی لڑکی ڈالیا کے بھی دراصل مسلمان گھرانے سے تعلق رکھنے کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ سے نکلے ہوئے تعویذ نما مومی کاغذ پر اردو زبان میں جو تحریر برآمد ہوتی ہے، اُس پر کیا لکھا ہوا ہے، بس یہیں پر یہ قسط ختم ہو کر ہمیں اگلی قسط کے انتظار کی بے چینی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اسی شمارے میں فرخندہ شمیم کا مختصر افسانہ ''ماسک'' کرونا کے موضوع پر لکھا گیا ایک عمدہ اسلوب کا تخلیقی رنگ میں اور کسی قدر نثری نظم کے انداز میں ڈوبا ہوا افسانہ ہے جس کے یہ اختتامی الفاظ قابلِ غور ہیں: ''اِس ماسک سے صرف وائرس بچ سکتا ہے وبا نہیں۔ وبا تو بدن کے اندر ہے نا۔۔۔ آسمان نے ابھی بہت جرثومے دھونے ہیں۔۔۔ اور اس دھلائی میں اسے کسی ماسک کی ضرورت نہیں۔۔۔ ماسک کی ضرورت صرف دنیا کو ہے۔'' آپ کا افسانہ ''دیوار میں گڑا آئینہ'' ہلکے پھلکے فکاہیہ انداز میں لکھا ہوا ہے مگر اس کا موضوع بے زبان جانوروں سے انسان کی ہمدردی یا بے رحمی انتہائی اہم ہے اور جنریشن گیپ کے المیے کی بھی عکاسی کرتا ہے، عمر رسیدہ کردار بہو بیگم کا کتے کو کھانا ڈالنے سے انکار سن کر جب سامنے کی دیوار میں گڑے آئینے کو دیکھ کر سوچتا ہے کہ آئینہ پہلے سے زیادہ پرانا اور بوسیدہ ہو چکا ہے، اس احساس کی زبانی آپ نے یہی افسوسناک پیغام دیا ہے کہ انسانی رشتوں کی صدیوں پرانی قدریں جنریشن گیپ کے ہاتھوں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔

شاعری کے حصے میں درج ذیل اشعار نے توجہ اپنی جانب کھینچی:

تیرے سوا جہاں میں کوئی نہیں ہمارا
بیکس کا تو ہے ساتھی، بے بس کا تُو سہارا
(محمد شاہد صدیقی شاہد)

تُو تو سنتا ہے سارے عالم کی
میری بھی ایک التجا سُن لے
(شگفتہ نازلی)

محبوبِ کردگار کی یادوں کے پھول ہیں
دامن میں ہم لیے ہوئے نعتوں کے پھول ہیں
(ابراہیم عدیل)

پروفیسر انور مسعود نے اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد میں جو نظم کہی اس کے ان شعروں نے ان کی وفات کا غم از سرِ نو تازہ کر دیا۔

لگتا ہے یوں کہ چند مہینوں کی بات تھی
پچپن برس کا عہدِ رفاقت گزر گیا

قرآں سے اس کو تھی وہ محبت کہ بالیقیں
اس کا جو آخرت کا سفر تھا، سنور گیا

انور نے جس گھڑی بھی صدیقہ کے واسطے
دستِ دُعا اُٹھایا تو اشکوں سے بھر گیا

غزلوں کے اشعار

رفو گر تو ستمگر ہے اسے اب کون پہچانے
رگِ جاں گر بکھر جائے تو ترپائی نہیں ہوتی
(یونس شرر)

ملے گا کیا تمھیں لطفِ عبارت
اگر بدلے گئے اعراب میرے
(اختر شاہجہانپوری)

جتنی خوں ریزیاں ہوئیں اب تک
سب کی بنیاد تھی غلط فہمی
(محمود شام)

زندگی جیسی اک کہانی میں
مختصر اقتباس تھے سب لوگ
(حمیرا رحمٰن)

شاید اس خط میں عبارت کی روانی میں کچھ بکھراؤ محسوس ہو، بہت سے دوستوں کے بچھڑ جانے سے کافی حد تک خود بھی بکھرا ہوا ہوں، اللہ اس وبا اور ان کیفیات سے ہم سب کو جلد از جلد نجات دلائے۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' شمارہ جولائی اگست ۲۰۲۰ء عباس تابش صاحب سے منسوب ہے جنھوں نے اپنے ادبی سفر کی ابتدا رومانوی غزل سے شروع کی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مسلسل فنی ریاضت کی بنیاد پر روایت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی فکری جہات کو نئے نئے زاویوں سے مؤثر انداز سے شعروں میں ڈھال کر اردو شاعری کی دنیا میں نمایاں مقام پیدا کیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کا ان سے مکالمہ ہمیشہ کی طرح ایک ادبی دستاویز کی مانند ہے اور قابلِ تحسین ہے۔

شمارہ میں دلچسپ افسانے، مضامین اور شاعری شامل ہے۔ ''دیوار میں گڑا آئینہ'' (گلزار جاوید) اپنے مخصوص اور لاجواب انداز میں ایک دلچسپ کہانی ہے جو قاری کو آخر تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ طنز و مزاح، اشارات اور سسپنس (Suspense) میں رہتے ہوئے قاری ابھی مزید تجسس میں ہوتا ہے کہ ڈرامائی انداز میں کہانی کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ''آئینہ زیست'' پروین شیر نے قدرت کے نظام اور زندگی کی حقیقت کے بارے میں رابرٹ

برنز (Robert Burns) مشہور شاعر اور جان سٹین بیک (John Stein Beck) کے مشہور ناول کے حوالوں سے فلسفیانہ تحریر رقم کی جو قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ سیمیں کرن نے ''یہ گھنٹہ گھر'' کے عنوان سے فیصل آباد کے مشہور گھنٹہ گھر جہاں سے آٹھ سڑکیں نکلتی ہیں کے بارے میں تاریخی، سماجی اور نفسیاتی حوالوں سے دلچسپ کہانی تحریر کی ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل نے اپنے تحریر کردہ خاکہ '' خدا گواہ رہے گا'' میں تفصیل کے ساتھ اور بغیر لگی لپٹی کے اپنے چھ دہائیوں پر محیط حالات زندگی کا احاطہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کن نامساعد حالات سے گزرنے کے بعد آخر کار انہوں نے قلم اٹھانے اور زندگی برائے ادب اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جس فیصلہ نے ان کی زندگی کو ایک نئے رُخ پر موڑ دیا جس سے وہ پوری طرح مطمئن ہیں۔ رینو بہل بطور افسانہ نگار اور ناول نگار ہندو پاک میں نہ صرف ہر دل عزیز ہیں بلکہ ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیشہ ایک مثبت پیغام پنہاں ہوتا ہے اور وہ دہشت گردی، جنسی اور اخلاقی بے راہ روی اور جرائم پر لکھنے کے بجائے تعمیری موضوعات کو ترجیح دیتی ہیں۔ ان کے ناول ''نجات دہندہ''، ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' اور '' گرد میں اَٹے چہرے'' اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔

''امریکہ کتنی دور کتنا پاس''، رفعت علی سید کا سفر نامہ ہے جس میں انہوں نے امریکی تہذیب وتمدن اور چکا چوند کو موضوع بنانے کے بجائے اپنے ممتا کے جذبات کا بہت خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے۔ ان کا بیٹا شادی کے بعد اپنی بیگم کے ہمراہ امریکہ منتقل ہو گیا تھا یہ اُس کی جدائی، ملاپ اور پھر جدائی کے جذبات اور احساسات پر مشتمل روئیداد ہے۔ اس سفر نامہ کے چند دل کو چھو لینے والے جذباتی اقتباسات یسمینہ سراج صاحبہ نے بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے شامل کر کے یہ مضمون ترتیب دیا ہے۔ انہوں نے ایک ماں کے پاکستان سے امریکہ اور واپسی کے سفر کو دلچسپ اور پراثر انداز میں بیان کیا ہے جو قاری کو لحظہ بہ لحظہ اس سفر نامہ میں جذباتی طور پر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

اس بار شعراء نے دو موضوعات کو بالخصوص کرونا وائرس کے عالمی اثرات اور جارج فلوئیڈ کی دلخراش ہلاکت کے واقعہ کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ اس حوالہ سے غالب عرفان، حمیرا رحمٰن، انیس اشفاق، فرخندہ شمیم، ڈاکٹر نزہت شاہ، سرور حسین، اسلم گورداسپوری، امجد اسلام امجد، پروین شیر، فرح کامران کا کلام قابلِ تحسین ہے۔ اس کے علاوہ یونس شرر، انور مسعود، شکیب جلالی، محمود شام، اشفاق حسین، رومانہ رومی، نورالہدیٰ شاہ اور مشیر طالب کا کلام بھی متاثر کن ہے۔

موجودہ کٹھن دور میں جبکہ بیشتر لوگ گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں ''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ منتظر قارئین تک پہنچانا قابلِ تحسین ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب، سلام۔

اگرچہ دعائیں بزرگوں سے لی جاتی ہیں، وبائی صورت حال ایسی ہے کہ بزرگوں کو دعا دے کر بات کرنے کو جی چاہتا ہے، اس لیے اللہ آپ کو اور متعلقین کو محفوظ رکھے۔ چہارسو کا نیا شمارہ آن لائن دیکھ کر، پہلے ہی صفحے سے معلوم ہوا کہ پچھلے دو شمارے بھی صرف آن لائن آئے تھے یعنی سلسلہ جاری ہے اور آپ نے تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا ہے، اس کے لیے بہت مبارک۔ آپ کی چہارسو کے مشن سے وابستگی اور حوصلے کا ثمر ہمیں مل رہا ہے، بہت شکریہ۔ نواز دیوبندی صاحب کے اس شمارے میں بہت سی تخلیقات کا موضوع کورونا ہے جس سے ایک طرف تو یہ احساس ہوا کہ ہم سب اس سے ذہنی اور اجتماعی طور پہ بھی کس قدر متاثر ہو رہے ہیں۔ یہاں شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ Vivienne کی نظم کورونا جس کا ترجمہ رینو بہل صاحبہ نے کیا ہے، اس کی پنچ لائن ''دستخط/کورونا'' گویا اس شمارے کی بھی پنچ لائن ہے۔ ہم تاریخ کے سفر میں ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں کہ جہاں اچانک راستہ تنگ اور دشوار ہو جاتا ہے مگر اس سے مفر نہیں، ہمیں آگے بڑھنا ہے اور اس میں کارواں کو کچھ ناقابلِ تلافی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور پڑ رہا ہے۔ آصف فرّخی صاحب کا افسانہ ''قرنطینہ'' ان کے مخصوص اسلوب میں لکھا افسانہ ہے جو معاشرتی اور تہذیبی المیے کو کردار کے ذاتی المیے سے جوڑ کر اس وبا کی تمثیل بنا دیتا ہے۔ افسوس کہ آصف فرخی بھی اس دنیا میں نہیں رہے، عمدہ انسان اور ادیب اور بہت کام کرنے والے، منکسر مزاج انسان تھے۔ اسی شمارے سے پتہ چلا کہ انل ٹھکر بھی اس جہاں سے خاموشی سے کوچ کر گئے، کیسا خلا ہے کہ معلوم نہیں ہو سکا اور کتنے ہی لوگ اس دوران چلے گئے۔ انل ٹھکر کو ہم نے چہارسو میں بہت پڑھا، ان کے انتقال کی خبر پہ بہت افسوس ہوا۔ نواز دیوبندی صاحب کا انتخاب پڑھ کر لطف آیا:

وہ موجود نہیں تھے پھر بھی ان سے بیٹھ کے باتیں کیں
شوقِ دید میں اکثر ہم نے آنکھوں کو حیران کیا
(نواز دیوبندی)

ظفر قریشی کی ترجمہ کی گئی جارجی گوسپوڈینوف کی کہانی بہت دلچسپ ہے اور یہ وہ فکری جست ہے جو کوئی کوئی ہی لگا سکتا ہے۔ اس شمارے میں عبداللہ جاوید صاحب اور فرح کامران کی نظمیں اور علی ارمان، عبدالوہاب اور محمود شام صاحب کی غزلیں اچھی تھیں۔ کچھ اشعار لکھنا چاہوں گا جو مجھے اچھے لگے:

چہارسو ہے جو پھیلی وہ روشنی تم ہو
مجھے تو لگتا ہے ایسے کہ زندگی تم ہو
مکالمے کا بھی اک سلسلہ سا رہتا ہے
کہ مجھ کو کہنا جو ہوتا ہے سوچتی تم ہو
(شگفتہ نازلی)

کر کے سبق میں حاصل بڑھتا رہوں گا آگے
گنتے رہو گے بیٹھے تم میری لغزشوں کو
(رشی خان)

فیصل عظیم (کینیڈا)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

عباس تابش نمبر کی سافٹ کاپی آن لائن موصول ہوئی، بے حد شکریہ۔ اگلے ہی روز اس کا پرنٹ نکلوا کے رسالہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اپنی مجبوری یہ ہے کہ آن لائن رسالہ پورا پڑھا نہیں جاتا جبکہ ''چہارسُو'' کا مطالعہ پورا ابھی نہیں ہوتا کہ آئندہ شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ آپ کی مجبوری بھی ہم سمجھ سکتے ہیں بس دعا کرتے ہیں کہ جلد از جلد پرماتما اس خوفناک دور سے دنیا کو نجات دلائے تاکہ زندگی دوبارہ پٹڑی پر آ سکے۔ آپ نے ایسے حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری، ہمارے لیے یہ ہی بہت بڑی بات ہے۔

اس بار صاحب قرطاس اعزاز کا بائیو ڈیٹا نظر نہیں آیا۔ خیر ان کے انٹرویو سے معلوم ہو گیا کہ کب سے شاعری کے میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں اور ان کی مادری زبان سرائیکی ہے۔ ایک بات تو بتایئے آپ اتنے مشکل سوالات کہاں سے تراش کر لاتے ہیں کہ جواب دیتے نہیں بنتا۔ کچھ سوالات تو واقعی مشکل تھے جن کا جواب تابش کے لیے دینا مشکل ہوتا مگر کچھ سوال ایسے ضرور تھے جن کا جواب دے سکتے تھے مگر نظر انداز کر گئے مثلاً ''اصلاح یا کلام تک بات ہوتی تو شاید برداشت جواب نہ دیتی، نوبت پورے کا پورا دیوان لکھ اور چھاپ کر ہوم ڈیلیوری کی سہولت کے ساتھ پیش جا رہا ہے؟''۔ تابش صاحب کا مضمون ''سخن سرائے سے ایک خط'' بے حد پسند آیا۔ انداز بیاں بہت دلکش۔ شاعری دل کو چھو جانے والی ہے البتہ ایک غزل میری تنہائی بڑھاتے چلے جاتے دو مرتبہ Repeat ہو گئی صفحہ ۱۱۳ اور ۱۱۴ پر۔

عشرت آفرین کا افسانہ ''دھیان کا کھیل'' اچھا افسانہ ہے۔ پردیس میں بس جانے والوں کے عزیزوں کا یہ ہی حال ہوتا ہے۔ عمر انتظار میں ہی گزر جاتی ہے۔ یہ آج کے دور کا المیہ ہے۔ سیمیں کرن کے ''گھنٹہ گھر'' میں انہوں نے فیصل آباد کی خوب سیر کرائی۔ وقت کے ساتھ خیالات بھی بدلتے ہیں جذبات بھی بدلتے ہیں۔ کہتے ہیں نہ گھر میں پتھر بھی کئی سال پڑا رہے تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ یہ تو پھر ان کا اپنا شہر تھا اور اپنا شہر ہے۔ اے خیام صاحب نے ''انٹرنیشنل پارک'' میں آج کے انسانوں کی مجبوری اور بدحالی کی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ انسان کی زندگی جانور سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ رخشندہ روحی کا ''یاد کے بے نشاں جزیرے'' خوبصورت افسانہ ہے۔ انداز بیان دلکش ہے اور مختصر سی کہانی دل کو چھو جاتی ہے۔ ''نیا کی کہانی'' اچھی کہانی ہے جس میں بچوں کی نفسیات کو سمجھانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آج کا دور ایسا ہے کہ کسی بھی رشتہ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ بچے حساس، معصوم ہوتے ہیں ان ننھے پودوں کا خاص خیال رکھنا والدین کا فرض ہے۔ فرخندہ شمیم کا ''ماسک'' موجودہ صورت حال پر حساس کہانی ہے۔ گلزار جاوید کی ''دیوار میں گڑا آئینہ'' خراماں خراماں بڑھتی جاتی ہے اور اپنے معاشرے کی خامیوں اور موجودہ بدحالی کی نشاندہی کرتی جاتی ہے۔ کہانی کس طرف مڑ جائے گی اس کی بھنک تک نہیں پڑتی اور آخر میں کہانی ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جاتی ہے۔ آخر کا وہ ایک جملہ جسے بڑی سادگی سے ادا کیا گیا ''میں کُتّے کو کھانا ڈالتے ڈالتے تنگ آ گئی ہوں'' اُف یہ جملہ دیر تک میرے دل و دماغ پر ہتھوڑا مارتا رہا۔ جو کبھی گھر کا سربراہ تھا وہ ڈھلتی عمر میں کس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے میں بہت سے بزرگوں کی کہانی ہے۔

''کوئی کبھی نہیں مرتا'' اور نیلا وارپسی کی کہانی کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے ظفر قریشی صاحب نے۔ ویسے کہانی تو ناول کا ایک باب ہے مگر ہے وہ مکمل کہانی۔ بہت خوبصورت انداز بیان اور کہانی دل چیرنے والی۔ عورتوں پر کس کس طرح سے ظلم ہوتے ہیں، کتنی کچلی جاتی ہیں، اُن کا اپنی زندگی، اپنے جسم پر بھی اختیار نہیں اور یہ دنیا کے عموماً حصوں میں ہوتا ہے، پڑھ کر دل دہل گیا۔ اہلیانِ شہر کی خصوصیات بڑی چابکدستی سے بیان کی ہیں۔ میری نظر میں یہ زبردست کہانی ہے۔ یقیناً ناول بھی باکمال ہوگا۔ سبھی کہانیوں کا انتخاب اچھا تھا سب افسانہ نگاروں کو میری جانب سے بہت بہت مبارکباد اور شکریہ بھی۔

''ایک آئینہ زیست'' پروین شیر نے مضمون خوب لکھا ہے۔ نثر میں شاعری کا لطف آ گیا۔ مختصر مگر بامعنی تخلیق۔ آدمی اور چوہے کا موازنہ بھی خوب کیا۔ محمد حمید شاہد کا آصف فرخی کو تحسینِ عقیدت دل کی گہرائیوں سے لکھی گئی ہے۔ انہوں نے قارئین کو اپنے غم میں شامل کر لیا ہے۔ مرحوم آصف فرخی صاحب کی آتما کو پرماتما سکون بخشے۔ چند مضامین، زہریلا انسان اور ایک صدی کا قصہ، کچھ شاعری کے حصے کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔

اس بار بھی فلرز بڑے چُن کر لائے گئے ہیں۔ سب سے اچھا تو سقراط کا لگا ''اٹھلاتے ہوئے''۔ دعا ہے اپنے رب سے آپ کو صحت یاب رکھے اور آپ اسی طرح کام پر لگے رہیں۔ چہارسو کی روشنی چہار سو پھیلاتے رہیں۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

برادرِ عزیز، سلام پہنچے۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

خدارا اپنی محبتیں نہ دیجیے کہ میں متحمل نہ ہو سکوں۔ سچ جانیے میں جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی اعتبار سے بھی ایک بے حد کمزور انسان ہوں اور آپ ہیں کہ ہر روز اپنے خلوص کی خوشبو سے میرا مشام جاں معطّر کرتے رہتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے: ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ تعمیل ارشاد کر رہا ہوں۔ اس میں یہ جذبہ بھی شامل ہے کہ ''چہارسُو'' کی محفل میں شمولیت امتیاز و انبساط کی بات ہے۔

مشتاق اعظمی (اسنول)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ (جولائی، اگست ۲۰۲۰ء، جلد ۲۹) اپنی باوقار

ادبی روایت کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ زندگی کا پہلا رسالہ ہے جو آن لائن پورا پڑھا ہے۔ یہ گلزار جاوید بھائی اور چہارسو سے محبت ہی تو ہے۔ موجودہ شمارہ ہمارے عہد کے معروف شاعر عباس تابش کے گوشے سے مزّین ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے منفرد سوالات اور عباس تابش کے جوابات، بہت سے سوالوں کے جوابات دینے سے گریز کیا ہے شاید وہ کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے مثلاً یہ سوال ''یہ لفظی بازی گری اور ترکیب سازی کے اصطلاح آپ جیسے جینوئن اور محنتی شاعر کے لیے مناسب ہے'' عباس تابش نے ایک خوبصورت بات کہی ہے:

''شاعر کا اپنا ایک مکمل موسم ہونا چاہیے ایک مکمل فضا ہونی چاہیے''

عابد حسین عابد، خالد احمد، محمد اظہار الحق، ڈاکٹر ضیاء الحسن، ثاقب تبسم کے مضامین عباس تابش کے فکر و فن اور امکانات کو روشن کرتے ہیں۔ خالد احمد نے مختصر لفظوں میں ان کی غزل کی تفہیم کی ہے۔

''عباس تابش کے فکر و فن کا تلون، اصلاً مہتابِ غزل کے پیدا کردہ مدوجزر سے عبارت ہے۔'' (ص:۱۸)

پرچے میں غزلوں کا انتخاب لاجواب خصوصاً محمود شام، حمیرا رحمان، نسیم سحر، خورشید طلب، اختر شاہ جہاں پوری، سحر تاب رومانی، تسنیم کوثر، سہیلہ انعام صدیقی، شناور اسحاق اور تصور اقبال۔ آفتاب مضطر کی غزل منفرد ہے۔ اختر شاہ جہاں پوری کی غزل اپنے جوبن پر ہے۔

دل و جاں ہیں ابھی شاداب میرے
سنہرے اس لیے ہیں خواب میرے

(اختر شاہجہاں پوری)

انور مسعود صاحب نے اپنی رفیقہ حیات کے لیے چار شعر کہے ہیں جو محبت و رفاقت کی تصویر ہیں:

آبائی شہر ہے مرا یہ شہرِ عشق تو
ہم لوگ ہیں یہاں کے، اسی سرزمین کے

(سحر تاب رومانی)

امجد اسلام امجد صاحب کی نظم ''لہو کا ایک رنگ ہے'' ایک فکری نظم ہے جس میں انسان کی بے توقیری کا نوحہ ہے۔ پروین شیر کی پراثر نظم ''سیاہ مٹی کا اُگا اجالا'' امید اور رجائیت سے پُرتخلیق ہے۔ محترمہ کی نظم ابتدا سے اختتام تک بڑے توازن سے اپنا سفر طے کرتی ہے اُن کی لفظیات کی خشت میں معنوی تہہ داری کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جمیل احمد عدیل کی نظم ''کتبہ آخری متن نہیں ہے'' میں زندگی کی جستجو اور اس جستجو میں کچھ ''کرنے'' کی لگن کی فکر ہے۔ بہت خوب۔

محترمہ عشرت آفریں مستند اور کامیاب افسانہ نگار ہیں اس افسانے میں فنِ افسانہ اور پھر ''کردار'' کی ہنرمندی کی ترجمانی جس کمال سے کی ہے وہ خوب ہے۔ سیمیں کرن مسلسل افسانے لکھ رہی ہیں۔ ''یہ گھنٹہ گھر'' اسلوب اور پیش کش کے سبب منفرد ہے۔ آپ کا افسانہ ''دیوار میں گڑا آئینہ'' شگفتہ بیانی کا مظہر ہے کہیں کہیں اسی شگفتہ بیانی میں گہرا طنز بھی نمایاں ہے۔ افسانے کا اختتام خوب ہے۔ ''جنریشن گیپ'' کا المیہ جواب معاشرے کا المیہ بنتا جا رہا ہے۔ شہلا نقوی صاحبہ نے بھی اپنا رنگ دکھایا ہے۔

محمد حمید شاہد نے ڈاکٹر آصف فرخی کا تعزیت نامہ جو تحریر کیا ہے وہ علم و ادب اور آصف فرخی سے محبت کرنے والے ہر شخص کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے۔ ''رس رابطے'' میں احباب کے خطوط کے مطالعے سے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ موبائل کے علاوہ تحریر بھی تو ملاقات کا ذریعہ ہے۔

نوید سروش (میرپورخاص)

بقیہ : آخری بات

ٹی سی بوائل کی کہانی ایک فینٹیسی (Fantasy) ہے اور جنوبی امریکا کا ایک بے نام ملک اس کا کینویس (Canvas) ہے۔ اس ملک کا ڈکٹیٹر صدر جو کسی زمانے میں مویشی بانی کرتا تھا، جیم، دیوہیکل اور تندرست و توانا فوجیوں کی ایک بٹالین تیار کرنا چاہتا ہے۔ وہ پورے ملک سے دراز قد نوجوانوں کو جمع کر کے انہیں بڑے بڑے پنجروں میں مقید کر دیتا ہے۔ قیدیوں کو بہترین غذا، اچھا مشاہرہ اور خوب صورت اور صحت مند عورتیں فراہم کرتا ہے۔ دو قیدی بھاگنے کی کوشش میں پکڑے جاتے ہیں۔ وہ پھر کوشش کرتے ہیں اور آخر میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور معمولی انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کا خواب پورا کر لیتے ہیں۔ پوری کہانی تخیلاتی تانے بانے پر محیط ہے۔ ظفر قریشی کہیں کہیں زبان کے کچھ الفاظ کے آزادانہ استعمال سے نہیں چوکتے۔ منہ کالا کرنے کی اصطلاح تو ٹھیک ہے مگر دو تین دیگر الفاظ جو گالیوں کے زمرے میں آتے ہیں اگر تبدیل کر لیں تو شرفاء کے اعتراض سے بچ جائیں گے۔

اب رہی آخری بات تو وہ ہے اظہارِ تہنیت۔ ظفر قریشی نے اپنی بھرپور کوشش اور پوری صلاحیت سے پندرہ کہانیوں کو اردو میں ڈھالا ہے اور ایک مترجم اور لکھاری کی حیثیت سے اپنی بصیرت کو اپنے پڑھنے والے انسانی گروہ میں بانٹا ہے۔ دوسرے ملکوں کے ادیبوں کی تخلیقات کو اعزاز دے کر انہوں نے دراصل اُردو پڑھنے والوں کی عزت افزائی کی ہے۔ یہ وہ کوشش ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے جوڑتی ہے اور ہماری فکر و دانش کو اُجالتی ہے۔ یہ کہانیاں پڑھنے والوں کے بہت سے سوالوں کے جواب بھی دیتی ہیں۔

ظفر قریشی صاحب نے کرداروں کا ایک گروہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ کردار ہماری اُنگلی پکڑ کر ہمیں کہاں کہاں لے جاتے ہیں۔ ترجمے کی یہ کاوش ہمیں کہانیوں کے مواد سے ہی متعارف نہیں کراتی بلکہ الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی بندش سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔

...... نسائی ادب اور تانیثیت ......

اکرم کنجاہی کئی میدانوں کے شہسوار ہیں۔ اگر چہ وہ کسی تحریک یا نظریے کا حصہ نہیں ہیں مگر اُن کی شاعری میں فکری تازگی کے ساتھ ساتھ تخلیقی سچائی ہے۔ اُن کا تنقیدی کام اعلیٰ معیار کے ساتھ مقدار میں بھی قابلِ قدر ہے۔ اُن کا بہت سا تخلیقی کام اشاعت کا منتظر ہے اور اب کتابی صورت میں بہ سرعت سامنے آ رہا ہے۔ تقریر کے فن پر آپ کی کتب کے کئی ایڈیشنز سامنے آ چکے ہیں۔ جب وہ ادبی محافل میں فی البدیہہ اظہار خیال کرتے ہیں تو سامعین ''ابھی اور'' کا تقاضا کرتے ہیں۔ انہوں نے شعبۂ بنک کاری کے لٹریچر میں بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اکرم کنجاہی جیسی صاحبِ علم شخصیات کی موجودگی میں ہمیں زوالِ ادب جیسے خدشات کو ذہن میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔ میں چوں کہ فکشن کا آدمی ہوں تو اتنا کہوں گا کہ جس طرح انہوں نے تاریخِ ادب کی تمام بڑی فکشن نگاروں پر سیر حاصل بات کرنے کے ساتھ رضیہ سجاد ظہیر، فہمیدہ ریاض، شاہدہ لطیف، نسیم انجم، شہناز پروین، ڈاکٹر تنویر انور خاں اور سیمیں کرن کی فکشن نگاری پر مضامین تحریر کیے ہیں، وہ بار بار سراہے جانے کے لائق ہیں۔ میں ایک اور بہترین تنقیدی کتاب کی اشاعت پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

زیب اذکار حسین

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، دستیابی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی۔

...... درد کی دہلیز پر ......

کورونا وائرس، جسے کووڈ۔19 (Covid-19) کا نام دیا گیا۔ 2019-2020ء ایک عالمگیر وبا دنیا بھر میں پھوٹ پڑی۔ سارس کووی 2 نامی وائرس کا دسمبر 2019ء میں چینی صوبہ ہوبئی کے شہر ووہان میں اس وبا کا ظہور ہوا اور اس برق رفتاری سے پھیلا کہ چند ہی مہینوں کے بعد 11۔ مارچ 2020ء کو عالمی ادارہ صحت (WHO) نے اسے عالمی وبا قرار دے دیا۔ اب تک اس مرض کی کوئی ویکسین ایجاد نہیں ہوئی یہ وائرس ساری دنیا میں پھیلنے لگا تو اس کی مزید روک تھام کے لیے اس پر پابندی، قرنطینہ، کرفیو، تالا بندی، اجتماعات اور تقریبوں کا التوا یا منسوخی، عبادت گاہوں اور سیاحتی مقامات کو مقفل کر دینے جیسے اقدامات کیے جانے لگے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس وائرس نے زندگی کا پہیہ عالمی سطح پر مفلوج کر دیا ہے لیکن ہمارا صبر، احتیاط اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر سختی سے پابندی ہمیں بہت جلد اس وائرس پر قابو پانے میں مدد ہوگی۔ اس وبا کے موسم نے ''درد کی دہلیز پر'' جس نفسیاتی اور ذہنی کشمکش اور ہیجان انگیز اضطراب میں مقید رکھا وہ کسی قرنطینہ سے کم نہیں۔

ایم زیڈ کنول

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۱۰۰۰، دستیابی: تہذیب انٹرنیشنل پبلی کیشنز، بہاولپور۔

...... لفظ، زبان اور ادب ......

اکرم کنجاہی، کراچی میں تیز وتُند ہوا کے جھونکے کی مانند آئے اور یہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں ایسے گھُل مل گئے جیسے وہ برسوں کے ادبی دوست ہوں۔ ملنسار و ہمدرد، خوش اخلاق و خوش گفتار، مجاز اُمعتمدن، خلیق و شفیق، خوش بیان و شیریں سخن انسان ہیں۔ اکرم کنجاہی صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک ادبی تقریب میں ہوئی جسے بہت عرصہ نہیں ہوا۔ یہ تقریب تھی معروف ناول نگار و کالم نگار محترمہ نسیم انجم اور معروف کہانی کار، خاکہ نگار، سید محمد ناصر علی کی کتابوں کی تقریب اجراء کراچی پریس کلب کی ادبی کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ تقریب کی صدارت اکرم کنجاہی صاحب نے کی تھی جبکہ مجھ ناچیز کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کتاب پر کچھ کہنا تھا۔ یہاں میں نے انہیں پہلی مرتبہ کسی بھی علمی موضوع پر گرجتے اور برستے، شعلہ بیانی کرتے دیکھا۔ خوب بولتے ہیں، اچھا بولتے ہیں، تسلسل اور ربط کے ساتھ بولتے ہیں، موضوع کو مکمل گرفت میں رکھتے ہوئے بولتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ موضوع پر مستعدی اور سج دھج کے ساتھ بولتے ہیں۔ ان کا حافظہ ماشاءاللہ غضب کا ہے۔

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۱۰۰۰، دستیابی: تہذیب انٹرنیشنل پبلی کیشنز، بہاولپور۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
صادقہ نواب سحر
شاعری کے تناظر میں
الفیصل